سہ ماہی
اردو ادب

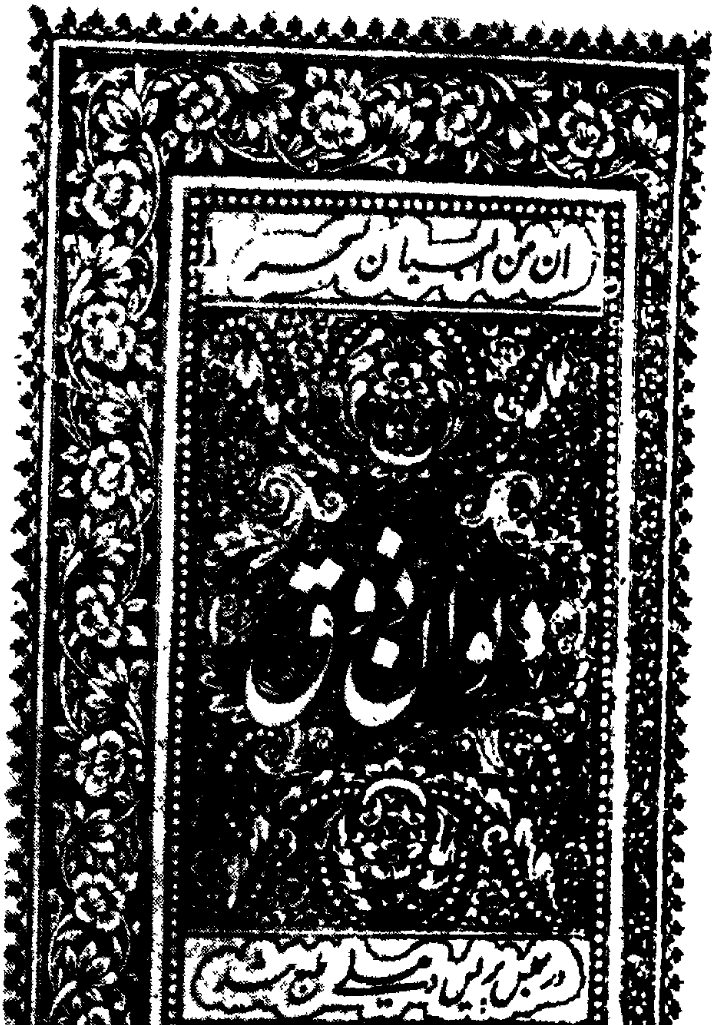
(Suprem Court)

Upon hearing counsel the Court made the following:

ORDER

It is stated by Dr. Khaliq Anjum, Chairman of the Committee constituted by this Court, who is present in person, that on 16.11.98 a seminar will be held at the site in memory of Urdu Poet Mohd. Ibrahim Zauq, and therefore, the Archaelogical Survey of India be directed to see that the construction work is completed by the said date. The counsel for the Union of India has already placed before us some photographs indicating the construction work made at the site which indicate that the work is progressing quite satisfactorily. However, It shall be seen by the Archaelogical Survey of India that the construction are completed by 16.11.98 so that the proposed function may be held at the site.

(21st september, 1998)



دیوانِ ذوق کے ایک نایاب نسخے کا سرورق۔ یہ دیوان داروغہ کنہیا لال کے زیرِ اہتمام مجلس پریس
(دہلی) سے ۱۰ شعبان ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ ([illegible])

سہ ماہی

اردو ادب

ذوق نمبر

اڈیٹر

اسلم پرویز

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلّی

شمارہ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۹۸ء

کمپوزنگ کمپیوٹر سنٹر، انجمن ترقی اردو (ہند)

قیمت فی شمارہ ۳۰ روپے، سالانہ ۱۰۰ روپے۔ (موجودہ شمارہ = /۶۰)

پرنٹر پبلشر خلیق انجم، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) نے ثمر آفسٹ
پرنٹرس، نئی دہلی میں چھپوا کر اردو گھر، راؤز ایوینیو، نئی دہلی سے شائع کیا۔

فون ۳۲۳۶۲۹۹، ۳۲۳۷۲۱۰

فہرست

ذوقؔ کے چند زباں زدِ عام اشعار

انتخاب. محمد ذاکر

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا
اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تِل میں ہے دکھائی دیتا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا
نہنگ واژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

آدمیت اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شے
کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

اے ذوقؔ تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

موت نے کردیا ناچار و گرنہ انساں
ہے وہ خودبیں کہ خدا کا بھی نہ قایل ہوتا

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا اندازِ نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

قسمت ہی سے ناچار ہوں اے ذوقؔ وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

اے ذوقؔ کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

اے ذوقؔ دیکھ دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

کھِل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

خط بڑھا زلفیں بڑھیں کاکل بڑھے گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ آیا تو کدھر جائیں گے

پہلا ورق

دلی کا دبستانِ شاعری (نور الحسن ہاشمی) اور لکھنو کا دبستانِ شاعری (ابو لیث صدیقی) یہ دونوں کتابیں اردو میں اس وقت لکھی گئیں جب ہمارے ہاں ابھی جدید تنقید کے خدو خال بن ہی رہے تھے۔ یہ دونوں کتابیں اگرچہ قدرے روایتی اور میکانکی انداز میں لکھی گئی ہیں اور بعد میں جب شاید لکھنو کا دبستانِ شاعری کو سامنے آئے ایک چوتھائی صدی بھی نہیں گزری تھی تو ایک اور کتاب دو ادبی اسکول (علی جواد زیدی) منظر عام پر آئی۔ دو ادبی اسکول نے دبستان دہلی اور دبستان لکھنو جیسے تصورات ہی پر ایک سرے سے سوالیہ نشان لگا دیا۔ علی جواد زیدی کے اس تھیسس پر خاصی بحثیں رہیں اور مجموعی طور پر یہ بات نکل کر آئی کہ نور الحسن ہاشمی اور ابو اللیث صدیقی کے پیش کردہ تصورات کو یک سر رد نہیں کیا جاسکتا۔ ان دونوں کتابوں سے کم از کم ان خطوط کی نشان دہی ضرور ہوتی ہے جن سے دہلویت اور لکھنویت کی شناخت متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ خواہ ان تصورات کو کلیتاً زمانی اور مکانی حدود میں رکھ کر نہ دیکھا جاسکتا ہو جیسا کہ علی جواد زیدی کا اصرار ہے۔ جس طرح دبستان دہلی کے تصور کی بنا پر ابو اللیث صدیقی نے دبستانِ لکھنو کی بنیاد کھڑی کی انھی بنیادوں پر بہادر شاہ ظفر کے عہد کی دہلی کی شاعری کو ہم اپنی سہولت کے لیے نئی دہلویت قرار دے سکتے ہیں۔ اس دہلی کے تین اہم شاعر غالب، ذوق اور مومن ہیں۔ ناسخ نے شعری اظہار کی زبان کو جس درجہ کمال کو پہنچایا تھا نئی دہلوی شاعری کے ان تینوں نمائندہ شعراء پر محض اس کے اثرات ہی نہیں ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ بجا ہوگا ان کی شاعرانہ شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں بھی اس نے اہم رول ادا کیا ہے۔ غالب اور مومن کے انداز سخن پر ناسخیت کی چھاپ کا ذکر تو عام طور پر کیا جاتا رہا ہے لیکن ذوق کے ہاں قلعہ معلیٰ کے اثرات اور دہلوی زبان کے روز مرہ اور محاورے کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ اس کی آڑ میں چھپے ہوئے ان کے ہاں ناسخ کے اثرات پر کم ہی لوگوں کی نگاہ جاتی ہے۔ اس اعتبار سے ذوق کی شاعری کا ابھی ہماری تنقید پر قرض باقی ہے۔

ذوق اپنی شہرت مقبولیت اور ناموری کے سبب اپنے عہد کے سب سے خوش نصیب شاعر

تھے لیکن جہاں تک کمال فن کا تعلق ہے ان کا ادب میں حقیقی معنوں میں جو بھی درجہ ہے وہ غالب اور مومن کے بعد ہی ہے۔ ذوق اپنے زمانے میں تو سب پر بازی لے گئے لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اور ان کی ہنگامی شہرت کی گرد چھٹتی گئی تو ذوق، غالب اور مومن کے بعد جس تیسرے مقام کے وہ حق دار تھے اس سے بھی محروم کر دیے گئے۔ اور وہ غالب اور مومن کے مقابلے میں تیسرے درجے کے شاعر ہو کر رہ گئے۔ یہ دوسری انتہا تھی جس کی ذمے داری ایک طرف تو تحقیق کے اس معیار کے سر ہے جس نے حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود جیسے اعلا پائے کے محقق پیدا کیے اور دوسری طرف ذوق کے شاگرد محمد حسین آزاد کی اس ذوق دوستی کا نتیجہ ہے جو ذوق کے لیے بالآخر جی کا جنجال ثابت ہوئی۔ آزاد نے ذوق کی تعریفوں کے پل باندھ کر انھیں مبالغے کی انتہا سے بھی اونچا اٹھا دیا جس سے ذوق کے بارے میں ایک خوامخواہ کا تعصب پیدا ہو گیا۔ آزاد نے ذوق کی شاعرانہ عظمت کو مسلم قرار دلوانے کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ ذوق کے کلام میں وہ اپنے قلم کی برش سے چار چار لگا دیں۔ آزاد نے اپنے قلم سے نہ صرف یہ کہ ذوق کے کلام کی اصلاح کی بلکہ اپنی طرف سے شعر کہہ کر بھی ان کے کلام میں شامل کر دیے اور یہ سب کام اتنے بھونڈے پن سے ہوا کہ ساری پول کھل گئی اور اس طرح محمد حسین آزاد نے اپنے استاد ذوق کو ادھر کا رکھا نہ ادھر کا

ذوق کا اردو کے کلاسیکی شعرا میں جو مرتبہ ہے اس اعتبار سے ذوق پر ابھی کوئی بہت اعلا پیمانے کا تحقیقی اور تنقیدی کام نہیں ہوا ہے۔ ذوق پر احمد حسین لاہوری کے بعد پہلی مرتبہ تنویر احمد علوی نے ذوق کو اپنی ادبی کاوشوں کا موضوع بنایا اور ان کی شخصیت اور خدمات پر نہ صرف ایک باقاعدہ کتاب تصنیف کی بلکہ ان کے دیوان کو بھی از سر نو ترتیب دیا۔ ذوق کے سوانح اور انتقاد پر اور کوئی باقاعدہ کام شاید یوں بھی نہ ہو سکا کیوں کہ ہمارے محققین کی زیادہ تر توجہ محمد حسین آزاد کے بخیے ادھیڑنے پر ہی صرف ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ابھی تک ذوق کے کلام کا کوئی ایسا مستند اڈیشن بھی ہمارے سامنے نہیں جس کی تدوین متنی تنقید کے اصولوں کی بنیاد پر کی گئی ہو اور جب تک یہ کام نہ ہو جائے اس وقت تک ذوق کی شاعری پر کوئی بھی تنقیدی رائے بجائے خود مستند نہیں ہو سکتی۔

اردو ادب کے موجودہ ذوق نمبر کا مقصد دراصل اہل اردو کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ انیسویں صدی کے دبستان دہلی کی شاعری کی ادبی تاریخ کا خاکہ اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک کہ اردو کے محقق اور نقاد غالب اور مومن کی طرح ذوق کو بھی اپنی توجہ کا مرکز

نہیں بناتے۔

دہلی میں اردو کے مشاہیر کے جو مزار تھے ان میں سے بیشتر اہل اردو کی لاپرواہی اور غفلت کی نذر ہو گئے۔ انیسویں صدی کے دو عظیم اردو شاعروں غالب اور ذوق کے مزاروں کا بھی وہی حشر ہوا جو بہت سے مشاہیر کے مزاروں کا ہوا۔ ۱۹۳۴ تک مزارِ غالب کی حالت بہت خستہ تھی۔ مولانا محمد علی جوہر نے غالب کے مقبرے کی تعمیر کے لیے اہل اردو سے کچھ رقم اکھٹی کی۔ اول تو رقم ناکافی تھی۔ دوسرے کچھ لوگوں نے مزار پر مقبرے کی تعمیر کی مخالفت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا محمد علی جوہر نے مزار کا پرانا کتبہ ہٹا کر نیا کتبہ لگوادیا۔ ۱۹۵۴ء تک مزارِ غالب بری حالت میں رہا بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر نے ایک بار پھر مقبرہ بنانے کی تحریک شروع کی۔ اس کے کچھ دن بعد غالب سوسائٹی کے نام سے ایک تنظیم وجود میں آگئی۔ جس نے بہت خوبصورت مقبرہ بنادیا کچھ دن بعد جب اس تنظیم کے عہدے داروں اور اراکین کا انتقال ہو گیا تو مزارِ غالب پھر کس مپرسی کا شکار ہو گیا۔ مزار پر جھگیاں پڑ گئیں۔ چرس اور گانجا فروخت ہونے لگا۔ یہ ڈاکٹر خلیق انجم کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے مزار پر سے جھگیاں اٹھوائیں۔ مزار کے احاطے میں داخل ہونے والے دوسرے راستے بند کرائے اور مزار کے احاطے پر تالا ڈلوا کر اس کی چابی غالب اکیڈمی کی تحویل میں دے دی۔

ذوق کے مزار کا حشر اس سے بھی بہت برا ہوا۔ یہ مزار بہت معمولی طریقے سے بنایا گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھی اس مزار کے پاس آباد ہو گئے۔ دہلی میونسپل کارپوریشن نے شرنارتھیوں کی ضرورت کے پیشِ نظر ذوق اور ان کے متعلقین کے مزارات کو منہدم کر کے وہاں دو بیت الخلا تعمیر کرا دیے۔ ایک عورتوں کے لیے اور دوسرا مردوں کے لیے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کے لیے دہلی کا ذرہ ذرہ دیوتا ہے۔ انھیں دہلی کی تہذیب اور یہاں کے آثار قدیمہ سے عشق کی حد تک وابستگی ہے۔ انھوں نے سرسید کی "آثار الصنادید" تین جلدوں میں مرتب کی ہے۔ جس کے اب تک تین اڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور چوتھا زیرِ طبع ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے دہلی کی عمارتوں پر "دہلی کی درگاہ شاہ مرداں" اور "دہلی کے آثار قدیمہ" جیسی دو اہم کتابیں بھی لکھی ہیں۔ جب وہ دہلی اردو اکادمی کی تحقیقی اور اشاعتی کمیٹی کے چیئرمین تھے تو انھوں نے دہلی کی تہذیب اور آثارِ قدیمہ پر لکھی گئی بہت سی اہم کتابیں

دوبارہ مرتب کر کے شائع کرائیں۔ اس سے قبل ۱۹۶۳ء کے آس پاس انھوں نے ابوالکلام آزاد اکیڈمی آف لیٹرز قائم کی تھی۔ اس اکیڈمی نے مومن خاں مومن، محمد حسین گویا اور کئی دوسرے شاعروں کے مزاروں کی مرمت کرائی اور ان پر کتبے لگوائے تھے۔ یہ مہم بعد میں اس لیے آگے نہ بڑھ سکی کہ ایسے لوگ جنھوں نے دہلی کے پرانے قبرستانوں پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی وہ اس کی مخالفت پر اتر آئے۔

مزار ذوق کی داستان بہت عبرت ناک ہے کیوں کہ جیسا کہا گیا کہ مزار کو منہدم کر کے اس پر بیت الخلا بنا دیا گیا تھا۔ اس بیت الخلا کو گرا کر ذوق کی یادگار قائم کرانا، خلیق انجم کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے۔ اس دوران انگریزی کے ممتاز صحافی اور دہلی کے خاندانی باشندے فیروز بخت صاحب نے انگریزی کے اخبار میں ایک مضمون لکھ کر مزارِ غالب اور مزار ذوق کی حالت کی طرف توجہ دلائی تو ایک مشہور ایڈوکیٹ ایم۔ سی۔ مہتہ نے سپریم کورٹ میں رٹ دائر کر دی۔ سپریم کورٹ میں ڈاکٹر خلیق انجم کا رول بہت اہم ہے۔ دہلی میونسپل کارپوریشن نے عدالت میں یہ ثابت کر دیا تھا کہ جہاں بیت الخلا بنے ہوئے ہیں یہ وہ جگہ نہیں ہے جہاں ذوق کا مزار تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے سپریم کورٹ میں بحث کر کے ثابت کیا کہ ذوق کے مزار پر بیت الخلا بنایا گیا تھا۔ عدالت نے مزارِ غالب پر رپورٹ لکھنے کے لیے جو کمیٹی بنائی تھی پہلے ڈاکٹر خلیق انجم کو اس کا رکن اور پھر چیئرمین مقرر کیا۔ اس طرح مزارِ ذوق کا نقشہ بننے لگا تو ڈاکٹر خلیق انجم کو ہدایت دی کہ وہ اپنی نگرانی میں نقشہ بنوائیں۔ عدالت نے یہ بھی ہدایت دی کہ ڈاکٹر خلیق انجم اور ان کے ساتھی تعمیر یادگارِ ذوق کی نگرانی کریں گے۔

مزار غالب اور مزار ذوق کا معاملہ جب سے سپریم کورٹ میں آیا ہے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری مدر ذر ریز صاحب اور شاید ماہلی صاحب دونوں اس معاملے سے غیر معمولی دل چسپی لیتے رہے ہیں۔ ماہلی صاحب، خلیق انجم صاحب کے ساتھ ہمیشہ عدالت میں حاضر رہتے۔ اس لیے میں نے ان سے درخواست کی کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے اردو آرکائوز میں محفوظ تمام دستاویزوں کی بنیاد پر ان دونوں مزاروں کی داستاں لکھ دیں۔ انھوں نے بڑی محنت اور جستجو کے ساتھ یہ مضموں تیار کیا۔ یہ مضموں بھی شمارے کے آغاز میں شامل ہے جو بہت مدلل طریقے سے مضمون لکھا ہے۔ میں ان کا شکر گزار ہو کہ انھوں نے میری درخواست پر بہت کم وقت میں ان دونوں مزاروں کے سلسلے میں ایک اہم دستاویز فراہم کر دی۔

اسلم پرویز

شاہد ماہلی

غالبؔ اور ذوقؔ کے مزاروں کی داستان

انجمن ترقی اردو (ہند) کے اردو آرکائیوز میں ذوقؔ اور غالبؔ کے مزاروں کے سلسلے میں اہم دستاویزات محفوظ ہیں۔ میں انجمن کا شکر گزار ہوں، جس نے مجھے ان دستاویزات کی نقلیں اور زیروکس کاپیاں حاصل کرنے کی سہولت فراہم کی۔ جن دستاویزوں کے حوالے دیے گئے ہیں انھیں مقالے کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

(شاہد ماہلی)

مزارِ غالبؔ

۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو دو شنبہ کے دن ظہر کے وقت مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا بلی ماران کے اُس مکان میں انتقال ہوا، جس کے کچھ حصے آج بھی محفوظ ہیں۔ جنازے کی نماز دہلی دروازے کے باہر ہوئی اور غالبؔ کو اس قبرستان میں دفن کیا گیا، جسے بقول خواجہ حسن ثانی نظامی، باغیچی انار کلی کہا جاتا تھا اور جو غالبؔ کے سسرال والوں کی ملکیت تھا۔ اس قبرستان میں غالبؔ کے سسر نواب الٰہی بخش خاں معروف، مرزا علی بخش خاں رنجور، زین العابدین خاں

عارفؔ وغیرہ مدفون تھے۔ غالبؔ کی وفات کے بعد ان کی بیوی اُمراؤ بیگم اور مرزا باقر علی خاں کاملؔ بھی اس قبرستان میں دفن کیے گئے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں اس قبرستان میں بقول غلام رسول مہر ۲۳ قبریں تھیں[1]۔ غالبؔ کی قبر معمولی بنائی گئی تھی۔ اس پر چونے کا پلاسٹر تھا اور سرہانے سنگِ مرمر کی لوح نصب تھی۔

لوح پر میر مہدی مجروحؔ کا درج ذیل قطعہ تاریخ کندہ تھا۔

یاحَیُّ یا قَیُّوم

رشکِ عرفی و فخرِ طالبؔ مرد   اسد اللہ خاں غالبؔ مرد

کل میں غم و اندوہ میں با خاطرِ محزوں

تھا تربتِ اُستاد پہ بیٹھا ہوا غم ناک

دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروحؔ

ہاتف نے کہا ''گنجِ معانی ہے تہ خاک''

۱۲۸۵ھ

مرزا حیرت دہلوی نے '' چراغِ دہلی '' میں لکھا ہے کہ غالبؔ کے کسی ہندو شاگرد نے اس احاطے کی پختہ چہار دیواری بنائی تھی۔

چوں کہ مزارِ غالبؔ بہت معمولی انداز میں بنایا گیا تھا۔ اس لیے ساٹھ پینسٹھ سال میں اس کی حالت بہت خستہ ہو گئی۔ شاد عارفی ۱۹۳۴ء میں دہلی آئے تھے۔ ان کے قول کے مطابق مزارِ غالبؔ بہت بُری حالت میں تھا۔

مولانا محمد علی مرحوم نے غالبؔ کا مقبرہ بنانے کی تحریک شروع کی۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ بقول ایم۔ حبیب خاں چھ مہینے کی لگاتار کوششوں سے

۶۷۷ روپے جمع ہو سکے۔ چندہ دینے والوں میں خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مرزا محمد عسکری، ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو وغیرہ شامل

---

[1] غلام رسول مہر، غالب، (طبع چہارم، لاہور، ص ۳۹)۔

تھے۔ جب مقبرہ بنانے کا کام شروع ہونے لگا تو خاندانِ غالبؔ کے کچھ لوگوں نے کہا کہ انھیں پسند نہیں ہے کہ غالب کا مقبرہ چندے سے بنایا جائے۔ مجبور ہو کر مولانا محمد علی نے لوح قبر دوسری تیار کرادی، جس پر وہی اشعار تھے جو پہلی لوح پر تھے۔ پھر کچھ عرصے بعد خواجہ حسن نظامی مرحوم نے مزارِ غالب کی مرمت کا بیڑا اٹھایا، لیکن انھیں بھی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ۱۹۵۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مرحوم ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر کو غالبؔ کے مزار پر مقبرہ بنانے کا خیال آیا۔ ان حضرات نے غالبؔ سوسائٹی نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کی تفصیل ایک مضمون کی شکل میں مالک رام صاحب نے لکھی تھی۔ یہ مضمون ماہنامہ ''آجکل'' نئی دہلی کے مارچ ۱۹۵۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ چوں کہ مالک رام صاحب نے بہت اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ اس لیے یہ پورا مضمون یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

مالک رام

غالبؔ سوسائٹی

۱۹۵۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مرحوم ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دلّی میں غالبؔ کی ایک یادگار تعمیر کی جائے جو اس اُردو اور فارسی کے عظیم الشان شاعر کے بھی شایانِ شان قرار دی جا سکے اور اس کے مداحوں اور نام لیواؤں کے لیے بھی باعث فخر ہو۔

تجویز یہ تھی کہ ایک ''غالبؔ میموریل ہال'' بنایا جائے، جہاں وقتاً فوقتاً ادبی اجتماع اور مشاعرے منعقد ہو سکیں ،بلکہ اگر کسی اور سماجی اور تہذیبی ادارے کو بھی ضرورت ہو ،تو اُسے بھی اس کے استعمال کی اجازت دی جائے۔

اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ڈاکٹر بھٹناگر مرحوم نے اپنے ہم خیال دوستوں کا ایک جلسہ طلب کیا۔ یہ اجتماع ۷؍ جنوری ۱۹۵۳ء کو ہوا۔ اس میں درجِ ذیل حضرات موجود تھے۔

ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر	سکریٹری وزارتِ تعلیم حکومت ہند۔ دہلی
شنکر پرشاد صاحب	چیف کمشنر دہلی
ودیا شنکر صاحب	جوائنٹ سکریٹری وزارت دفاع حکومت ہند۔ دہلی
جناب جوش ملیح آبادی	مدیر ماہنامہ ''آج کل'' دہلی
نور مہندر سنگھ بیدی صاحب	ہاؤسنگ اسٹیٹ کمشنر۔ دہلی
سید اشفاق حسین صاحب	ڈپٹی سکریٹری، وزارت تعلیم حکومت ہند۔ دہلی
جناب تیمور ان بہادر	دہلی
حمیدہ سلطان صاحبہ	دہلی

اس جلسے میں یہ فیصلہ ہوا کہ ضروری روپیہ جمع کیا جائے۔ جس سے مجوزہ ہال تعمیر ہو سکے۔ خرچ کا اندازہ ڈیڑھ لاکھ کا تھا۔ چناں چہ تمام اراکین جلسہ نے اپنے اپنے حلقہ احباب سے روپیہ جمع کرنے کا وعدہ کیا۔ سید اشفاق حسین صاحب باتفاق رائے خزانچی مقرر ہوئے۔

۱۹۵۳ء تک کام اسی نہج پر ہوتا رہا۔ جو رقوم جمع ہوئیں ''غالب میموریل فنڈ'' کے حساب میں الہ آباد بینک دہلی میں جمع ہوتی رہیں۔ لیکن جلد ہی اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ان تمام مسائل کو کسی منظم ادارے کے سپرد کر دینا چاہیے اس لیے طے پایا کہ ''غالب سوسائٹی'' قائم کی جائے اور اسے باقاعدہ رجسٹر کرالیا جائے چنان چہ اس کے قواعد و ضوابط بنائے گئے، اور سوسائٹی کی تشکیل اور ان قواعد پر غور و خوض کرنے کے لیے مندرجہ ذیل اصحاب سے ۱۸ر ستمبر ۱۹۵۳ء کو جمع ہونے کی درخواست کی گئی۔

ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر	سکریٹری، وزارتِ تعلیم حکومت، ہند۔ دہلی
ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب	وائس چانسلر، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ
جناب شنکر پرشاد صاحب	چیف کمشنر دہلی
جناب ودیا شنکر صاحب	جوائنٹ سکریٹری، وزارتِ دفاع حکومت ہند۔ دہلی
بیگم ساجدہ سلطانہ صاحبہ آف پاٹودی	دہلی

نواب زین یار جنگ بہادر	حیدر آباد
جناب جوشؔ ملیح آبادی	مدیر "آج کل" دہلی
جناب برج نارائن صاحب	دہلی
جناب شیوراج بہادر صاحب	دہلی
سید اشفاق حسین صاحب	ڈپٹی سکریٹری، وزارتِ تعلیم، حکومت ہند۔ دہلی

ان میں سے بیگم صاحبہ پاٹودی اور نواب زین یار جنگ بہادر اور جوشؔ ملیح آبادی اس جلسے میں نہیں آسکے تھے۔ انھوں نے غیر حاضری کے لیے معذرت کی۔ اور لکھ بھیجا کہ اجتماع میں جو فیصلہ ہو اُسے ہم منظور کرتے ہیں اور مزید یہ کہ ہمیں اس سوسائٹی کا اساسی رُکن بننے میں کوئی عذر نہیں۔

جلسے میں یہ قرارداد منظور ہوئی

"مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی یادگار کو دوامی شکل دینے کے مقصد سے "غالبؔ سوسائٹی" کے نام سے ایک ایسوسی ایشن بنائی جائے۔ اس کے لیے فوری کارروائی کی جائے تاکہ غالبؔ کی قبر کی مرمت ہو سکے اور اس پر ایک موزوں عمارت بنائی جائے۔ مزید یہ کہ اس کی یاد میں ایک ہال تعمیر کیا جائے۔"

اسی جلسے میں سید اشفاق حسین صاحب نے حاضرین کو مطلع کیا کہ لینڈ ڈیولپمنٹ آفیسر (Land Development Officer) نے مجوزہ ہال تعمیر کرنے کے لیے بستی نظام الدین میں زمین کا ایک ٹکڑا مخصوص کر دیا ہے۔ جوں ہی سوسائٹی کی رجسٹری ہو جاتی ہے۔ اس جگہ کے حصول کے لیے باضابطہ درخواست دے دی جائے گی۔ اس کے بعد سوسائٹی کی مجلسِ منتظمہ کا حسب ذیل انتخاب ہوا۔

صدر	ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر
سکریٹری	سید اشفاق حسین صاحب
خزانچی	جناب ودیا شنکر صاحب

اراکین مجلس بیگم صاحبہ پاٹودی، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، جناب شنکر پرشاد صاحب، نواب زین یار جنگ بہادر، جناب جوش ملیح آبادی، جناب شیوراج بہادر صاحب، جناب برج نارائن صاحب۔

لیکن جناب ودیا شنکر صاحب خزانچی کا عہدہ سنبھال بھی نہیں سکے تھے کہ ان کا تبادلہ کلکٹر اور مجسٹریٹ کی حیثیت سے پالن پور (بمبئی) ہو گیا۔ اس لیے اس کے بعد جناب برج نارائن کو خزانچی بنایا گیا۔ اب تک تمام وصول شدہ رقوم لائیڈز بینک نئی دہلی میں "غالب میموریل فنڈ" کے حساب میں جمع ہوتی رہی تھیں۔ جس سوسائٹی کی باقاعدہ تشکیل ہو گئی۔ تو حساب مذکور کا نام بھی یہی کر دیا گیا۔

نواب زین یار جنگ بہادر (حیدر آباد) ہندوستان کے مایۂ ناز ماہرِ فنِ تعمیر (Architect) ہیں انھوں نے مجوزہ مقبرے اور ہال کے نقشے تیار کیے۔ روپیہ کی فراہمی کا کام تو ہو ہی رہا تھا۔ سوسائٹی کے سکریٹری کی درخواست پر پورن چند صاحب، اگزیکیٹو انجینئر محکمۂ تعمیرات ہند، نے کام کی دیکھ بھال کے لیے اپنی اعزازی خدمت پیش کر دیں۔ چناں چہ تعمیر کا تمام کام انھیں کی نگرانی میں ہوا سوسائٹی کا تخمینہ یہ تھا کہ مجوزہ نقشے کے مطابق قبر پر سنگ مرمر کی چوکھنڈی بنانے پر ۱۳۱۹۷ روپے کا خرچ اٹھے گا۔ اس کی تیاری کے لیے چھ مختلف فرموں نے ٹنڈر پیش کیے۔ ان میں سے مسرز عبدالحکیم حسین بخش، مکرانہ (راجستھان) کا ٹنڈر سب سے ارزاں تھا۔ یہ فرم راجستھان میں سنگ مرمر کا کاروبار کرتی ہے انھوں نے یہ کام ۱۱۲۸۷ روپے ۳ آنے یعنی سوسائٹی کے تخمینے سے ساڑھے چودہ فی صد کم پر مکمل کر دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ چناں چہ ان کا ٹنڈر منظور کر لیا گیا۔

فرم نے مجوزہ نقشے کے مطابق سنگِ مرمر کی تختیوں اور جالیوں وغیرہ کا کام اپنے کارخانے مکرانہ ہی میں کیا۔ انھوں نے جون ۱۹۵۴ء میں یہ کام شروع کیا تھا اور سب چیزیں اکتوبر ۱۹۵۴ء کے آخر تک تیار ہو گئی تھیں۔ ٹھیکے کی رُو سے انھیں چوکھنڈی ۱۰ر نومبر ۱۹۵۴ء تک مکمل کر دینا چاہیے تھی۔ لیکن بوجوہ یہ کام دسمبر ۱۹۵۴ء میں ختم ہوا۔

افسوس کہ سوسائٹی کے سرگرم صدر ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر کو اپنی مساعی کو پوری طرح بار آور دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ یکم جنوری ۱۹۵۵ء کو اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔ اس پر ۶ر جنوری ۱۹۵۵ء کو سوسائٹی کا ایک فوری جلسہ بُلایا گیا، جس میں تعزیتی قرارداد کی منظوری کے علاوہ جناب شنکر پرشاد صاحب سوسائٹی کے نئے صدر چُنے گئے۔

چوکھنڈی کی تعمیر کا کام غالبؔ کے یومِ وفات ۱۵؍ فروری ۱۹۵۵ء سے پہلے ختم ہو گیا تھا اور اس کے افتتاح کی رسم اسی دن ادا ہوئی۔ اچھے خاصے پیمانے پر ایک جلسہ چونسٹھ کھمبے کے مشرقی طرف کے میدان میں ہوا۔ اس جلسے میں نظمیں پڑھی گئیں اور دو تین تقریریں بھی ہوئیں۔

غالبؔ کی قبر پہلے اس ہڑواڑ میں تھی، جو اُن کے خسر، نواب الٰہی بخش خاں معروف کے خاندان کی ملکیت ہے۔ اتفاق سے یہ قبر ہڑواڑ کے احاطے کی مغربی دیوار کے پاس تھی۔ اس لیے اسے قبرستان سے الگ کرنا آسان تھا۔ سوسائٹی نے مزید احتیاط سے کام لیا اور نواب صاحب لوہارو بالقابہم سے اسے الگ کرنے کی اجازت طلب کی۔ موصوف نے نہ صرف اجازت ہی دی، بلکہ ۵۰۱ روپے کا عطیہ بھی عنایت فرمایا۔ غالبؔ کے بالکل برابر میں مشرقی طرف اُن کی بیوی امراؤ بیگم کی قبر ہے۔ چناں چہ ان دونوں قبروں کو احاطے کی دوسری قبروں سے علیحدہ کرنے میں کوئی اُلجھن نہیں ہوئی۔ ایک دیوار احاطے کے بیچوں بیچ شمال سے جنوب تک کھینچ دی گئی، جس سے بقیہ احاطہ بھی جوں کا توں قائم رہا اور یہ دونوں قبریں بھی الگ ہو گئیں۔ البتہ غالبؔ کی پائنتی کی طرف مرزا زین العابدین خاں عارف کی قبر سوسائٹی نے اس طرف نہیں لی اور اُسے بدستور پہلے احاطے ہی میں چھوڑ دیا۔

اب ایک اور مشکل پیش آئی۔ اس سے پہلے اس احاطے کا دروازہ شمالی سڑک پر تھا، جس سے آنے جانے والے اندر داخل ہو سکتے تھے۔ لیکن جب غالبؔ کی قبر الگ ہو گئی تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے پُرانا دروازہ استعمال نہیں ہو سکتا تھا اور نئے احاطے کی سڑک والی مختصر دیوار میں کافی جگہ نہیں تھی کہ وہاں ایک اور دروازہ نصب کیا جا سکے، جس سے زائرین قبر تک آسانی سے پہنچ سکتے۔ اس کے علاوہ مزار کے ساتھ بھی ایک مناسب احاطے کا ہونا ضروری تھا۔ اس قبر کے مغرب میں ایک مکان تھا۔ پوچھ گچھ سے معلوم ہوا کہ اس کے مالک تین اشخاص ہیں۔ اُن میں سے دو پاکستان چلے گئے ہیں اور ایک ہنوز دہلی میں مقیم ہیں۔ جو صاحب ابھی تک یہاں تھے انھوں نے بطیبِ خاطر اس کارِ خیر کے لیے اپنا حصہ سوسائٹی کے حوالے کر دیا۔ بقیہ دونوں مالکوں کا حصہ سوسائٹی نے ۸-۱۰-۱۸۴۲ روپے دے کر کسٹوڈین سے خرید لیا۔ اب صورت یہ ہے کہ اس مکان کے کمرے اور دالان مسمار کر کے مزار کے سامنے ایک کشادہ صحن تیار کر دیا گیا ہے۔ اس میں پتھر کا فرش لگ گیا ہے۔ سڑک کی طرف دیوار بن گئی ہے۔ لیکن تجویز یہ ہے کہ وہاں لوہے کی سلاخیں نصب کی جائیں تاکہ مزار باہر سے بھی نظر آئے۔ مگر آج کل لوہے کی اشیاء آسانی سے مل نہیں رہی ہیں اس لیے یہ کام فی الحال ملتوی

کر دیا گیا ہے۔

سوسائٹی کا ارادہ تھا کہ غالبؔ کے نام پر ایک یادگار ہال تعمیر کیا جائے بلکہ شروع میں تجویز ہی یہ تھی۔ چوں کہ روپیہ بہت کم جمع ہوا۔ اس لیے مجورین نے مقبرہ کی چوکھنڈی ہی پر قناعت کر لی۔ ہال پر کم و بیش دو ڈھائی لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔ لیکن سوسائٹی کی موجودہ مالی حالت اتنے کثیر اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی یا تو اس کے لیے مزید چندہ جمع ہو یا کوئی اور پبلک ادارہ اس کی ذمہ داری لے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس وقت تک جو کچھ جمع اور خرچ ہوا ہے۔ اس میں حکومت سے ایک پائی نہیں لی گئی۔ ذیل میں بعض اہم چندہ دینے والوں کی مختصر فہرست دی جاتی ہے۔ مگر ایک بات یاد رہے کہ جو رقم جمع کی گئی ہے وہ بڑی حد تک چھوٹے چھوٹے چندوں پر مشتمل ہے۔

سیٹھ گھنشام داس برلا صاحب۔	دہلی	۵۰۰۰
شنکر لال خیراتی ٹرسٹ،	دہلی	۳۰۰۰
فرسا لال ماں سنگھ گا صاحب،	بھلاوا، (راجستھان)	۱۱۰۰
دہلی کلاتھ ملز،	دہلی	۱۰۰۰
لالہ یودھ راج صاحب،	دہلی	۱۰۰۰
نواب صاحب لوہارو بالقابہم	دہلی	۵۰۱
لالہ بھرت رام صاحب،	دہلی	۵۰۰
لالہ چرت رام صاحب،	دہلی	۵۰۰
شیو راج بہادر صاحب،	دہلی	۵۰۰
رام ناتھ چھیار صاحب،		۵۰۰
پی۔ سنگھانیا صاحب		۵۰۰
ایل۔ ایم چتالے صاحب		۵۰۰
ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر صاحب،	دہلی	۵۰۰

نواب صاحب پالن پور بالقابہم		۵۰۰
بیگم صاحبہ پاٹودی،	دہلی	۲۰۰
آر۔این بکسر صاحب،	دہلی	۲۰۰
شیام نندن سہائے صاحب		۱۵۱
رائے اُمانا تھ بالی صاحب،	لکھنؤ	۱۰۱
ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب،	دہلی	۱۰۰
پروفیسر محمد حبیب صاحب،	علی گڑھ	۱۰۰
جناب سلطانہ آصف فیضی صاحبہ،	بمبئی	۱۰۰
جناب آصف علی اصغر صاحب،	بمبئی	۱۰۰
سجاد مرزا صاحب،	حیدر آباد	۱۰۰
برج نرائن صاحب،	دہلی	۱۰۰
مہارانی صاحبہ،	جہانگیر آباد	۱۰۰
ہری چرن داس صاحب،		۱۰۰

دنیاے علم وادب ان سب اصحاب کی شکر گزار ہے کہ انھوں نے اس اہم قومی کام کی تکمیل کا سامان بہم پہنچایا۔ "یادگارِ غالب ہال" کا منصوبہ ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے اور زبانِ حالی سے دعوت دے رہا ہے۔ ع

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

غلام رسول مہر نے اطلاع دی ہے کہ "احاطہ مزار کے پاس ایک قطعہ زمین تھا۔ جسے حاجی حکیم عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ دہلی (خازن غالب سوسائٹی) نے اپنی گرہ سے معتد بہ رقم دے کر خریدا اور غالب سوسائٹی کے حوالے کر دیا۔ ایک اور قطعۂ زمین بیگم حکیم محمد واصل خاں مرحوم (برادر کلاں مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم) نے حکیم احمد خاں مرحوم کی سفارش پر عطا فرمایا ہے۔ نواب ذوالقدر جنگ حیدر آبادی بھی مزار کی تعمیر کے

آرزومند ہیں۔نواب صاحب ممدوح غالبؔ کے بھانجوں کی اولاد میں سے ہیں۔ا

غالبؔ کا مقبرہ ۱۹۵۵ء یا ۱۹۵۶ء میں مکمل ہوا۔ تعمیر مکمل ہونے کے بعد سے لے کر اب تک انجمن ترقی اردو (ہند) کی دہلی شاخ کی جنرل سکریٹری بیگم حمیدہ سلطان ہر سال پندرہ ۱۵؍ فروری یعنی غالبؔ کی یومِ وفات کے موقعے پر مزارِ غالب پر جلسہ کرتی ہیں۔اب جلسے کے منتظمین میں مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) اور غالبؔ انسٹی ٹیوٹ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اور اب یہ جلسہ خاصے بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔

اگرچہ غالبؔ کا مزار ایک پختہ احاطے میں ہے۔ مقبرہ سنگِ مرمر کا بنایا گیا ہے۔لوہے کا دروازہ ہے، لیکن چوں کہ کوئی ادارہ اس کی دیکھ بھال نہیں کر رہا تھا اس لیے اس کی حالت دن بدن خراب ہوتی۔ احاطے کی جنوبی دیوار میں ایک راستہ تھا جو ایک تاریخی عمارت چونسٹھ کھمبے کو جاتا تھا۔ چونسٹھ کھمبے میں بھی جھگیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہاں چرس اور گانجا فروخت ہوتا تھا۔ اور کوئی غلط اور غیر اخلاقی کام ایسا نہیں تھا جو یہاں نہ ہوتا ہو۔ایم۔ حبیب خاں مرحوم اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) کا "غالبؔ اور ذوقؔ کے مزار" کے عنوان سے ایک مضمون ہفت روزہ "ہماری زبان" کے ۲۲؍ ستمبر ۱۹۹۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا ۔اس مضمون میں مزارِ غالبؔ کے بارے میں حبیب صاحب نے لکھا ہے۔

"غالبؔ سوسائٹی چاہتی تھی کہ مزارِ غالبؔ سے ملحق ایک یادگار ہال بھی بنوائے لیکن روپیہ کم جمع ہونے کی وجہ سے ہال تو نہیں بن سکا، مزارِ غالب پر سنگ مرمر کی بہت خوب صورت چوکھنڈی اور مزار کے سامنے پتھر کے فرش کا ایک کشادہ صحن بنا دیا گیا۔ یہ کام ۱۹۵۵ء میں مکمل ہو گیا۔ کافی عرصے تک مزار کی حالت اچھی رہی لیکن چند برسوں میں مزار کے قریب جو خالی جگہ تھی، اس پر جھگیاں پڑ گئیں۔ بستی کے لوگ صحن میں گھوڑے اور بھینسیں باندھنے لگے۔ مزارِ غالبؔ چرس اور کوکین بیچنے والوں کا اڈہ بن گیا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم حکومت کے ذمہ داران سے درخواست کرتے رہے کہ مزار کو غیر قانونی قبضے سے آزاد کرایا جائے لیکن کوئی سنوائی نہیں ہوتی تھی۔ لفٹیننٹ گورنر سے لے کر پولس ذمہ داران یا تو واقعی بے بس تھے یا جان بوجھ کر چشم پوشی کر رہے تھے۔ ہندوستان کے مختلف اخباروں میں مزارِ غالبؔ کی اس حالت کے خلاف لکھا گیا لیکن حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

ہر سال ۱۵؍ فروری کو انجمن ترقی اردو (دہلی) مزارِ غالبؔ پر ایک تقریب کرتی ہے جس میں

مزار پر چادر چڑھائی جاتی ہے، فاتحہ خوانی ہوتی ہے اور اردو کے نقاد اور محقق غالب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں چار بجے انجمن ترقی اردو (دہلی) کا پروگرام تھا اور چھے بجے غالب اکادمی میں غالب پر تقریریں تھیں۔ چوں کہ جلسے کے منتظم ڈاکٹر خلیق انجم تھے اور یہ جلسہ مزارِ غالب پر ہونا ضروری تھا لیکن وہاں کے جھگی جھونپڑی والے کسی بھی قیمت پر مزار خالی کرنے پر تیار نہیں تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم اور بیگم حمیدہ سلطان نے پولیس کو بلالیا۔ جھگی والے اس شرط پر ہٹے کہ جلسہ ختم ہوتے ہی واپس آ جائیں گے۔

چار بجے جلسہ شروع ہوا، لوگ قوالیاں اور تقریریں سننے میں مصروف تھے، لیکن ڈاکٹر خلیق انجم اس فکر میں تھے کہ کسی طرح دوبارہ جھگیاں پڑنے سے روکی جائیں۔ ڈاکٹر صاحب قریبی تھانے گئے اور تھانے دار کو صورتِ حال سے آگاہ کیا لیکن اس نے کسی بھی طرح کی مدد دینے سے انکار کر دیا۔ مشکل یہ تھی کہ مزارِ غالب چونسٹھ کھمبے سے متصل ہے۔ چونسٹھ کھمبے سے ایک راستہ مزارِ غالب کے احاطے میں آتا ہے جس میں دروازہ نہیں تھا۔ احاطے کا صدر دروازہ لوہے کا ہے لیکن اس پر تالا لگانے کا انتظام نہیں تھا۔ یہ ڈاکٹر خلیق انجم کی اردو سے والہانہ محبت اور فعال شخصیت کا کرشمہ ہے کہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ چونسٹھ کھمبے اور مزارِ غالب کے احاطے کے درمیان جو راستہ ہے اس پر تیغا لگادیا جائے اور صدر دروازے پر تالا لگانے کا انتظام کیا جائے اور یہ سب کام چند گھنٹوں ہی میں کیا جائے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب ویلفیر سوسائٹی کے سکریٹری جناب ضامن علی ضامن مراد آبادی مرحوم سے رابطہ قائم کر کے کچھ روپے قرض لیے۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً اینٹوں، بدرپور اور سمینٹ کا انتظام کیا اور شام ہونے کے باوجود نہ جانے کہاں کہاں سے راج مزدور بھی پکڑ لائے۔ اِدھر مزارِ غالب پر جلسہ ختم ہوا، اُدھر دیوار بنی شروع ہو گئی۔ تمام لوگ غالب اکاڈمی میں جلسے میں تقریریں سن رہے تھے اور ڈاکٹر خلیق انجم تنہا کھڑے دیوار بنوا رہے تھے۔ غالب اکاڈمی کا جلسہ ختم ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ مزارِ غالب اور چونسٹھ کھمبے کے درمیان دیوار کھڑی کی جاچکی ہے اور صدر دروازے پر تالا لگادیا گیا ہے۔ جھگی جھونپڑی والوں نے واپس اپنی جگہ جانے کے لیے بہت شور مچایا لیکن تالا پڑنے کی وجہ سے مجبور ہوگئے۔ تالے کی دو چابیاں تھیں، ایک چابی انجمن ترقی اردو (ہند) کے دفتر میں رکھی گئی اور دوسری غالب اکاڈمی کو دے دی گئی تاکہ جب زائرین آئیں تو تالا کھول دیا جائے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے انجمن کی مجلسِ عاملہ سے اجازت لے کر مزارِ غالب پر ایک صفائی کرنے والے کا جزوقتی تقرر کر دیا جسے پہلے سو روپے اور کچھ عرصے بعد ایک سو پچاس روپے اور اب دوسو روپے ماہوار دیا جاتا ہے۔ یہ تنخواہ

انجمن ترقی اردو (ہند) بارہ سال سے دے رہی ہے کئی سال تک غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے بھی مزار غالب پر ایک چوکیدار مقرر رہا۔ مئی ۱۹۸۴ء کے اوائل میں غالب سوسائٹی کا قیام دوبارہ عمل میں آیا اور مندرجہ ذیل حضرات عہدے دار منتخب ہوئے

سرپرست	بیگم عابدہ احمد
"	جناب حکیم عبدالحمید
"	جناب مالک رام
"	جناب شفیع قریشی
صدر	جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر
نائب صدر	پنڈت آنند موہن زتشی، گلزار دہلوی
"	ڈاکٹر تنویر احمد علوی
"	جناب خواجہ حسن ثانی نظامی

جنرل سکریٹری۔ ڈاکٹر خلیق انجم

آفس سکریٹری ایم۔ حبیب خاں

آرگنائزنگ سکریٹری جناب رفعت سروش

پبلسٹی سکریٹری جناب رئیس مرزا

جوائنٹ سکریٹری جناب ذہین نقوی

" جناب شمیم احمد

خازن جناب ضامن مراد آبادی

سوسائٹی کے جنرل سکریٹری نے مزار غالب کی دیکھ بھال اور مرمت کے لیے مرکزی اور صوبائی حکومتوں سے گرانٹ حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کسی نے جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا۔"

۱۹۹۶ء کے اوائل میں انگریزی کے ایک مشہور و ممتاز صحافی جناب فیروز بخت احمد نے انگریزی کے کسی اخبار میں غالب اور ذوق کے مزاروں کی خستہ حالی کا ذکر کیا۔ اردو والوں کی خوش نصیبی ہے کہ فیروز بخت صاحب کی یہ تحریر سپریم کورٹ کے مشہور ایڈوکیٹ ایم۔ سی۔ مہتہ کی نظر سے گزری۔ اُنھوں نے مفادِ عامّہ کے تحت سپریم کورٹ میں دہلی میونسپل کارپوریشن اور آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے خلاف رٹ پٹیشن دائر کردی۔ عدالت نے ۲۳ر اکتوبر ۱۹۹۶ء کو آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا اور دہلی میونسپل کارپوریشن کو حکم دیا کہ وہ دیکھیں کہ کیا شکایت جائز ہے کہ مزارِ غالب کے چاروں طرف بے انتہا گندگی ہے اور خوانچہ فروشوں نے مزارِ غالب تک جانے کا راستہ روک رکھا ہے۔

آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے اگلی پیشی پر اپنی رپورٹ پیش کی جس میں بستی حضرت نظام الدین میں واقع تمام آثارِ قدیمہ کی تفصیل بیان کی۔ میونسپل کارپوریشن نے اسی تاریخ کو اپنی رپورٹ پیش کی جس میں بتایا کہ اس علاقے میں سب سے بڑی مشکل پولیس نے پیدا کر رکھی ہے، رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ پولیس والوں کے خلاف عام شکایت ہے۔ غیر قانونی خوانچہ فروش، مختلف چیزوں کے کاروبار کرنے والے اور چرس وغیرہ بیچنے والوں کو پولیس والوں کی سرپرستی حاصل ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہاں ایسے پولیس والے بھیجے جائے جو عوامی مفاد میں کام کریں۔

اس رپورٹ میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ اگرچہ ہمارے جانے سے پہلے سڑکیں خوانچہ فروشوں سے صاف ہوگئی تھیں لیکن پولیس والوں کو چاہیے کہ اسی حالت کو برقرار رکھیں۔ دہلی میونسپل کارپوریشن سڑکیں صاف ہونے سے پہلے اور سڑکیں صاف ہونے کے بعد دو نقشے عدالت کو پیش کرے۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا اور میونسپل کارپوریشن دہلی کو ہدایت دی جانی چاہیے کہ وہ بارہ کھمبے اور چونسٹھ کھمبے میں لوگوں کو بے وجہ نہ آنے دیں۔ میونسپل کارپوریشن کو ہدایت دی جانی چاہیے کہ وہ مزارِ غالب کے چاروں طرف سڑکیں سانے کا پروگرام عدالت میں داخل کریں اور یہ اعلان کردیں کہ اس پورے علاقے میں خوانچہ فروش نہیں بیٹھیں گے۔ میونسپل کارپوریشن دہلی کو یہ بھی ہدایت دی جانی چاہیے کہ وہ یہ بتائے کہ جن خوانچہ فروشوں کو اس نے ہٹایا ہے انھیں کہاں متبادل جگہ دی ہے۔ مزارِ غالب کے گرد و نواح کے علاقے کو صاف ستھرا اور خوب صورت بنانے کے لیے اور بھی کئی تجویزیں پیش کی گئی تھیں۔ (دستاویز۔۱) ۶ر نومبر ۱۹۹۶ء کو مزارِ غالب کی پھر سماعت ہوئی۔ بینچ میں جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس صغیر احمد موجود تھے۔ غالب کے مزار کے بارے میں

عدالت نے کہا کہ ۲۰ر ستمبر ۱۹۹۶ء کو مسٹر رنجیت کمار، مسٹر ایف۔ ایس۔ نریمان اور مسٹر بی۔ وی سہریا نے مزارِ غالب کے علاقے کا دورہ کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جو سڑکیں مزارِ غالب اور درگاہ نظام الدین کی طرف جاتی ہیں ان پر جو خوانچہ فروش بیٹھے تھے ان کو ہٹادیا گیا ہے۔ دہلی میونسپل کارپوریشن کے اڈیشنل کمشنر جناب جگموہن نے عدالت میں حلف نامہ داخل کیا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ خوانچہ فروشوں کو سڑکوں پر سے ہٹادیا گیا ہے لیکن چونسٹھ کھمبے میں اب بھی کچھ لوگ آباد ہیں۔ عدالت نے کہا کہ اس وقت کورٹ میں ڈاکٹر خلیق انجم موجود ہیں ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ مزارِ غالب پر جاکر وہاں کی حالت اور خوانچہ فروشوں پر ایک رپورٹ تیار کرکے عدالت میں پیش کریں۔ چوں کہ ۱۸ر نومبر ۱۹۹۶ء کو اگلی ساعت ہے اس لیے یہ رپورٹ ۱۷ر نومبر ۱۹۹۶ء سے پہلے پیش کردی جائے۔

ڈاکٹر خلیق انجم، جناب خواجہ حسن ثانی نظامی، جناب ایم۔ حبیب خاں اور جناب فیروز بخت نے چونسٹھ کھمبے اور مزار غالب کے علاقے کا ۷ر نومبر ۱۹۹۶ء کو دورہ کیا۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ مزارِ غالب اور چونسٹھ کھمبے کی طرف جانے والی مشرقی اور شمالی سڑکوں پر خوانچہ فروش نہیں رہے۔ غالب اکیڈمی کے پاس البتہ دو سبزی فروش بیٹھے ہوئے تھے۔ مزارِ غالب کی طرف آنے والی مشرقی سڑک کے دونوں طرف تین پہیے والے آٹو رکشہ کھڑے تھے اور اس سڑک کے ایک حصّے میں بڑی تعداد میں بھکاری بیٹھے رہتے ہیں۔ غالب کے مزار کے بالکل سامنے غیر قانونی طور پر آٹو رکشہ کھڑے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے سڑک پر چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سڑکوں پر پانی جمع ہونے کی وجہ سے اس علاقے کی بہت بُری حالت ہے اور بعض اوقات آثارِ قدیمہ تک پہنچنا ممکن نہیں رہتا۔

چونسٹھ کھمبہ

چونسٹھ کھمبہ باہر کے لوگوں سے بالکل خالی کرادیا گیا ہے۔ اس آثارِ قدیمہ کی پائداری کے لیے ضروری ہے کہ اس کے کچھ حصّوں کی مرمت کی جائے۔ چونسٹھ کھمبے کا لوہے کا وہ دروازہ جو بستی حضرت نظام الدین کی طرف کھلتا ہے ٹوٹا ہوا ہے۔ اس حصّے سے لوگ رات کو چونسٹھ کھمبے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

کچھ عرصے پہلے چونسٹھ کھمبے کے صحن میں بہت کوڑا پڑا ہوا تھا جسے صاف کر دیا گیا ہے۔ چونسٹھ کھمبے کے ستون اور قبریں سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں۔ طویل زمانہ گزرنے کی وجہ سے یہ سب کالے پڑ گئے ہیں۔ کئی جگہ سے اس آثارِ قدیمہ کی چھت ٹپک رہی ہے۔

کمیٹی کی سفارشات

۱۔ درگاہ نظام الدین اور مزارِ غالبؔ کی طرف جانے والی تینوں سڑکوں کی مرمت ضروری ہے۔

۲۔ اس علاقے میں چوکیداروں کی تعداد میں اضافہ کیا جانا چاہیے تاکہ آثارِ قدیمہ کے سامنے خوانچہ فروش نہ بیٹھ سکیں۔

۳۔ عدالت سے درخواست ہے کہ مقامی پولیس کو ہدایت دے کہ وہ سرکاری افسروں کی مدد کرے تاکہ ان سڑکوں پر خوانچہ فروش نہ بیٹھ سکیں اور آٹو رکشہ والے نہ کھڑے ہو سکیں۔

۴۔ لودھی روڈ کی طرف سے جب ہم درگاہ نظام الدین میں جاتے ہیں تو دائیں طرف ایک بہت بڑا خالی پلاٹ ہے جو ڈی۔ڈی۔اے کی ملکیت ہے۔ اس پلاٹ کے ایک حصّے میں آٹو رکشاؤں اور موٹر کاروں کے لیے پارکنگ بنائی جا سکتی ہے۔

۵۔ چونسٹھ کھمبے کے مغربی دیوار میں جو لوہے کا دروازہ ہے اس کی فوری طور پر مرمت کی جانی چاہیے۔

۶۔ چونسٹھ کھمبے کے احاطے میں جو لان ہے انھیں مختلف قسم کے پودے لگا کر خوب صورت بنایا جانا چاہیے۔

۷۔ سنگِ مرمر کے ستونوں اور قبروں کو کیمیکل کے ذریعے صاف کیا جانا چاہیے۔

۸۔ چونسٹھ کھمبے کی چھت کی مرمت کی جانی چاہیے تاکہ اس میں سے پانی نہ ٹپک سکے۔ (دستاویز نمبر۔۳)

۱۸ر نومبر ۱۹۹۶ء کو پھر سماعت ہوئی۔ بینچ میں جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس سید صغیر احمد شامل تھے۔ عدالت نے پہلے مزار ذوق کی سماعت کی اور پھر مزار غالب کی سماعت ہوئی۔ مزار غالب کے بارے میں عدالت نے کہا کہ عدالت کی ہدایت کے مطابق ڈاکٹر خلیق انجم نے بستی حضرت نظام الدین اور مزار غالب کے سلسلے میں اپنی رپورٹ پیش کی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے خواجہ حسن ثانی نظامی، جناب ایم۔ حبیب خاں اور جناب فیروز بخت کے ساتھ مزارِ غالب اور بستی حضرت نظام الدین کا معائنہ کیا تھا۔ کمیٹی نے کچھ تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے اپنی رپورٹ الگ سے پیش کی ہے۔ یہ دونوں رپورٹیں دہلی میونسپل کارپوریشن اور ڈی۔ڈی۔اے کو دے دی جائیں تاکہ یہ دونوں اس علاقے کو خوانچہ فروشوں سے صاف رکھیں۔ آٹو رکشاؤں اور ٹیکسیوں کو اس علاقے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ ڈی۔ڈی۔اے کو چاہیے کہ آٹو رکشاؤں اور ٹیکسیوں کی پارکنگ کے لیے کوئی باقاعدہ جگہ بنائے۔ (دستاویز نمبر ۔۴)

مزار غالب کے آس پاس سڑکیں بالکل صاف ہوگئی تھیں، لیکن کچھ ہی دن بعد خوانچہ فروشوں نے پھر سڑکوں کو گھیر لیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ۲۵ر جولائی ۱۹۹۷ء کو عدالت میں ایک حلف نامہ پیش کیا، جس میں انھوں نے بتایا کہ سڑکوں پر دوبارہ خوانچہ فروش آکر بیٹھ گئے ہیں۔ مزار غالب کے سامنے آٹو رکشہ والے پھر کھڑے ہونے لگے ہیں۔ سڑکوں پر پانی بھرا رہتا ہے کہ لوگوں کے لیے چلنا دشوار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس حلف نامے میں بتایا کہ عدالت نے اس سلسلے میں ڈاکٹر خلیق انجم کی پچھلی رپورٹوں اور تجویزوں کو منظور کرتے ہوئے ڈی ڈی اے کو ہدایت دی تھی کہ وہ ان تجویزوں پر عمل کرے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے حلف نامے میں کہا تھا کہ انھوں نے شاہد ماہلی صاحب، فیروز بخت صاحب اور ایم۔ حبیب خاں صاحب کے ساتھ اس علاقے کا پھر معائنہ کیا۔ کمیٹی کے مشاہدات حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ غالب کے مزار کی طرف جانے والی مشرقی اور شمالی سڑکوں کو خوانچہ فروشوں نے پھر گھیر لیا ہے۔

۲۔ درگاہ اور مزار غالب کی طرف آنے والی تینوں سڑکوں کی فوری طور پر مرمت ضروری ہے۔

۳۔ عدالت سے درخواست ہے کہ وہ میونسپل کارپوریشن دہلی یا آرکیالوجیکل سروے آف

انڈیا کو ہدایت دے کہ اس علاقے کے لیے چوکیدار متعین کیے جائیں۔

۴۔ حضرت نظام الدین پولیس اسٹیشن کے ایس۔ایچ۔او کو ہدایت دی جائے کہ وہ ڈی پی ایکٹ کے تحت یہ دیکھے کہ مزارِ غالب کی طرف جانے والی سڑکوں پر خوانچہ فروش قبضہ نہ کر سکیں۔

۵۔ لودھی روڈ سے درگاہ نظام الدین کی طرف آنے والی سڑک کی طرف ایک بہت بڑا پلاٹ خالی پڑا ہوا ہے۔ آٹو رکشاؤں اور اور ٹیکسیوں کو پارکنگ کی جگہ وہاں دی جانی چاہیے۔

۶۔ جب تک مقامی پولیس اور میونسپل کارپوریشن کے ذمہ دار اپنا فرض ادا نہیں کریں گے۔ مزارِ غالب کے آس پاس کی سڑکیں صاف نہیں رہ سکتیں۔ (دستاویز نمبر ۵)

۵راگست ۱۹۹۷ء کی سماعت کی بینچ میں جسٹس ایم۔ کے مکھرجی اور جسٹس سید صغیر احمد شامل تھے۔ مزارِ غالب کے سلسلے میں عدالت نے کہا کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے ۲۵ر جولائی ۱۹۹۷ء کو مزارِ غالب اور چونسٹھ کھمبے کے بارے میں جو رپورٹ پیش کی تھی ہم نے اس پر غور کیا۔ کمشنر میونسپل کارپوریشن اور بستی حضرت نظام الدین کے ایس۔ایچ۔او کو ہدایت دی جاتی ہے کہ مزارِ غالب کی طرف جانے والی سڑکوں پر بیٹھے ہوئے خوانچہ فروشوں کو دو ہفتے کے اندر اندر ہٹادیں اور ۱۹راگست ۱۹۹۷ء سے پہلے عدالت کو اپنی کارگزاری سے مطلع کریں۔ خوانچہ فروشوں کو ہٹانے کے بعد اس کا خیال رکھیں کہ یہ لوگ پھر نہ بیٹھنے پائیں۔ (دستاویز نمبر۔۵)

یہ سب کچھ ہوا۔ عدالت نے ڈاکٹر خلیق انجم کی رپورٹ کی بنیاد پر دہلی میونسپل کارپوریشن کے کمشنر اور بستی نظام الدین کے ایس۔ایچ۔او کو ہدایتیں بھی دیں، کچھ دن تک یہ علاقہ صاف رہا لیکن پھر وہی حالت ہو گئی۔

غالبؔ کا مکان

غالبؔ زندگی بھر کرائے کے مکانوں میں رہے۔ ان کا آخری مکان وہ تھا جس کا کچھ حصہ آج بھی محفوظ ہے۔ یہ مکان گلی قاسم جان کے نکڑ پر ہندوستانی دواخانے کے سامنے ہے۔ غالب

کے اسی مکان کے بارے میں حالی نے "یادگارِ حالی" میں لکھا تھا۔ "سب سے اخیر مکان جس میں اُن کا انتقال ہوا۔ حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوان خانے سے متصل مسجد کے عقب میں تھا۔ جس کی نسبت وہ کہتے ہیں۔

مسجد کے زیر سایہ ایک گھر بنالیا ہے   یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے۔

اسی مکان میں غالب کا انتقال ہوا تھا۔ مختلف ادارے اور افراد کوشش کرتے رہے کہ یہ مکان خالی کر کے یہاں ایک لائبریری اور غالب میوزیم قائم کردیا جائے۔ اس سلسلے میں حکومت سے بھی مطالبے کیے گئے لیکن حکومت پر کبھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ ڈاکٹر خلیق انجم انجمن ترقی اردو (ہند) کی طرف سے کوشش کرتے رہے ہیں کہ اس مکان کو خالی کر کے یہاں لائبریری اور میوزیم قائم کردیا جائے۔ اس مکان کے اب کئی مالک ہیں اور انھیں اس مکان کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ اپنے اپنے حصے کی اتنی قیمت مانگتے ہیں کہ اردو والوں کی بس کی بات نہیں ہے۔ ۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر خلیق انجم نے راجیہ سبھا کے رکن محفوظ علی خاں صاحب سے اس مکان کے بارے میں پارلیمنٹ میں سوال کرایا تھا۔ وزیر مملکت برائے تعلیم و ثقافت محترمہ زہتکی نے اس سوال کے جواب میں پارلیمنٹ کو بتایا کہ غالب کے مکان کو ڈھا کر نئی تعمیر ہو چکی ہے اور اب اس مکان کا کوئی حصہ محفوظ نہیں ہے۔ مسز زہتکی کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم نے "ہماری زبان" کے ۸/ دسمبر ۱۹۸۵ء کے شمارے کے اداریے میں لکھا تھا کہ "رہا سوال غالب کے مکان کا، ہم پوری ذمے داری کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ غالب کا مکان دو منزلہ تھا، اوپر کی منزل میں نئے کمرے بن گئے ہیں، لیکن نیچے کے گھر میں پرانے کمرے اور پرانے گھر کی نشانیاں موجود ہیں۔ اگر ایک لمحے کے لیے ہم یہ بھی فرض کرلیں کہ پوری عمارت ڈھائی جا چکی ہے تب بھی ہماری گزارش یہ ہے کہ اردو والوں کی جذباتی وابستگی اُسی جگہ سے ہے، جہاں غالب کا مکان ہے۔ اگر مرکزی حکومت یہ مکان حاصل کر کے اس میں ایک غالب میوزیم اور لائبریری کھول دے تو ہم اس کے شکر گزار ہوں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر متعلقہ وزیر، دہلی کے لیفٹنٹ گورنر اور سرکاری افسروں کی نیت صاف ہو تو مسئلہ ایک مہینے میں حل ہو سکتا ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی طرف سے اسی مکان کے سلسلے میں ہر ممکن ذمے دار عہدے دار کو میمورنڈم بھیجے گئے، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس مکان کے بارے میں ایم۔ حبیب خاں صاحب مرحوم نے اپنے مضمون "غالب اور ذوق کے مزار" (ہفت روزہ "ہماری زبان" نئی دہلی ۲۲/ ستمبر ۱۹۹۶ء) میں غالب کا مکان کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

غالبؔ کا مکان

انجمن ترقی اردو (ہند) اور اس کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم غالبؔ کا مکان حاصل کرنے کے لیے برسوں سے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں کئی بار انجمن کے وفد لفٹیننٹ گورنروں سے ملتے رہے ہیں۔ ۸؍مارچ ۱۹۹۰ء کے "ہماری زبان" میں ایک خبر شائع ہوئی تھی جسے نقل کرنا کافی ہے

> "انجمن ترقی اردو (ہند) کا ایک وفد مالک رام صاحب کی قیادت میں دلّی کے لفٹیننٹ گورنر ایرمارشل ارجن سنگھ سے ملا۔ اس وفد میں کنور مہندر سنگھ بیدی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر خلیق انجم، ایم حبیب خاں اور مسز شمیم جہاں شامل تھے۔ مالک رام صاحب نے گورنر صاحب کو غالبؔ کے مکان کی تاریخی اہمیت اور موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ خلیق انجم صاحب نے گورنر صاحب کی خدمت میں میمورنڈم پیش کیا جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ حکومت غالبؔ کا مکان حاصل کر کے دہلی اردو اکیڈمی کے حوالے کر دے۔
>
> وفد کے دوسرے اراکین نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ گورنر صاحب نے وعدہ کیا کہ فوری طور پر اس سلسلے میں اقدام کریں گے۔"

ہماری تجویز یہ ہے کہ حکومت یہ مکان حاصل کر کے اسے بھی اس ٹرسٹ کے تحت دیدے جو مزارِ غالبؔ کا نگراں ہوگا۔ اس مکان میں ایک ایسی شان دار لائبریری قائم کی جائے جو غالبؔ کے شایانِ شان ہو۔

کچھ عرصے پہلے فیروز بخت صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ غالبؔ کے مکان کے لیے ہائی کورٹ میں رٹ دائر کی ہے۔ خدا کرے انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو۔

مزارِ ذوق

شاید ہی کسی قوم نے اپنے عظیم شاعر کی یادگار کے ساتھ یہ سلوک کیا ہو جو ہم ہندوستانیوں نے ذوق کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ذوق کا انتقال اس زمانے میں ہوا جب مغل حکومت کے خزانے خالی ہو چکے تھے۔ مغل بادشاہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا وظیفہ خوار تھا اور بادشاہ قلعے کے روزمرہ کے اخراجات کے لیے ایک ایک پیسے کو محتاج تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذوق اور ان کے متعلقین کی قبریں انتہائی سادہ انداز میں بنائی گئیں۔ ان قبروں کے چاروں طرف اینٹوں اور چونے کی دیوار کا احاطہ بنا دیا گیا۔ غرض یہ کہ آخری مغل تاجدار کے استاد کی قبر معمولی سے مقبرے سے بھی محروم رہی۔ استاد ذوق کے شاگردوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ لیکن کسی بھی شاگرد کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ ان کی قبر پر معمولی سا مقبرہ ہی بنا دیتا۔

ممکن ہے کہ کسی اور نے بھی مزار ذوق کا ذکر کیا ہو، لیکن میرے علم کے مطابق پہلی بار اس کا ذکر واقعات دار الحکومت دہلی (جلد ۲) میں ملتا ہے۔

۱۹۱۹ء میں بشیر الدین احمد کی "واقعات دار الحکومت دہلی" شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی دوسری جلد میں مزار ذوق کی کچھ تفصیل ملتی ہے۔ بشیر الدین صاحب احمد صاحب لکھتے ہیں۔

> "قدیم شریف کے پاس کلو کا تکیہ دہلی کا مشہور قبرستان ہے۔ یہیں ایک جگہ املی اور پیپل اور نیم کے تین درخت برابر برابر واقع ہیں۔ جن کے متصل چار دیواری کے اندر طوطی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق، ابو ظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ دہلوی کے استاد آرام فرماتے ہیں اور سرہانے سنگ باسی کی لوح لگی ہے۔ اور اس پر یہ قطعہ کندہ ہے۔

اللہ اکبر

طوطی ہند حضرت استاد ذوقؔ نے

لی گلشن جہاں سے جو باغ جناں کی راہ

سالِ وفات جو کوئی پوچھے تو اے ظفر

کہہ ذوقِ جنتی زسز (کذا) بخشش الہ

۱۲۷۱ھ

افسوس ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں و ہم جرا (کذا) پر کہ ایسے بڑے شاعر نامور فخر ہندوستان کا مزار یوں کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہے۔ اور چار دیواری جابجا سے گر پڑی ہے 'اگر جلد توجہ نہیں کی گئی اور یہی غفلت رہی تو تھوڑے ہی دنوں میں ان کے مزار کا پتا چلنا بھی دشوار ہو جائے گا۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک "[۱]

۱۹۲۲ء کے آس پاس حکیم اجمل خاں اور دہلی کے کچھ لوگوں نے مل کر مزار ذوق کے احاطے اور احاطے کی تمام قبروں کی مرمت کرائی تھی۔ چوں کہ احاطے کی دیوار چونے اور اینٹوں سے بنائی گئی تھی۔ اس لیے بہت جلد اس کی حالت خراب ہو گئی۔

۱۹۳۴ء میں شاد عارفی مرحوم دہلی آئے تھے۔ یہاں انھوں نے غالبؔ اور ذوقؔ کے مزارات تلاش کر کے ان کی زیارت کی۔ ان دونوں شاعروں کے مزاروں کی خستہ حالی پر شاد عارفی نے ایک مختصر سا مقالہ لکھا جو لاہور کے " ہمایوں (اکتوبر ۱۹۳۵ء) میں شائع ہوا[۲]۔ اس مقالے پر حامد علی خاں نے حسب ذیل ادارتی نوٹ لکھا تھا۔

۱۔ بشیر الدین احمد، واقعات دار الحکومت دہلی، دہلی، جلد ۲، ری پرنٹ ۱۹۹۰ء ص ص، ۵۴۲۔۵۴۳

۲۔ یہ مضمون پروفیسر مظفر حنفی نے اپنی کتاب "شاد عارفی، ایک مطالعہ (نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ص ۳۵۳ تا ۳۵۶) میں شامل کیا ہے یہاں اسی کتاب کے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔

حضرت شاد عارفی نے ذیل کے مقالہ میں ایک اہم مسئلہ کی طرف قوم کی توجہ دلائی ہے۔ذوقؔ مرحوم کے مزار کی مرمت اگر وقت پر نہ ہوئی تو عجب نہیں کچھ عرصے بعد اس کا سراغ بھی نہ مل سکے۔غالب کے مزار کی مرمت کے لیے ایک باقاعدہ انجمن بن چکی ہے۔لازم ہے کہ یہی انجمن ذوقؔ کے مزار کی تعمیر کا کام بھی اپنے ذمے لے لے۔اگر یہ انجمن یا کوئی نئی انجمن گزشتہ ادبا واکابر ملک کے مزارات کی تلاش اور ان کی حفاظت و تعمیر کا کام شروع کردے تو ہمیں توقع ہے کہ اہل ملک اپنی گزشتہ تہذیب و ثقافت کی ان مٹتی ہوئی نشانیوں کے تحفظ کے لیے ہر امکانی مدد دے کر ایک زندہ قوم ہونے کا ثبوت دیں گے ۔۔۔شاد عارفی صاحب نے مزار ذوقؔ کی تلاش کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

"بس جناب چلتے چلتے 'گھومتے گھومتے 'تلاش کرتے کرتے 'ظہر کے وقت محلہ بنی رسول کی مسجد میں نماز اور آرام کی خاطر ٹھہرا۔وضو کرنے کے بعد کھانا نہ ملنے پر افسوس کر رہا تھا۔دیکھتا کیا ہوں کہ داک ررگ آئے ہیں مسجد میں خضر کی صورت)بقول حضرت حالی مرحوم میں اپنی جیسوں سے ہوشیار ہو کر ان کے پاس پہنچ گیا۔اور وہی ذوقؔ و غالب کا سوال پیش کردیا۔انھوں نے مجھے دشمن آثار قدیمہ یعنی گڑے مردے اکھاڑنے والوں میں سمجھ کر جواب دیا(تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو) مگر جب میں نے ان کو اطمینان دلادیا کہ میں ایسا خطرناک آدمی نہیں ہوں بلکہ شاعر ہونے کے لحاظ سے ایصالِ ثواب کے لیے ان نامور شعراء کی قبریں تلاش کر رہا ہوں تو انھوں نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا۔اچھا نماز کے بعد میں تمھیں اپنے ہمراہ وہاں لے چلوں گا۔نماز سے من کل الوجوہ فراغت حاصل کرکے انھوں نے قدم شریف کی طرف قدم بڑھائے۔میں بھی ان کے قدم بہ قدم چلتا رہا۔کوئی ۶۰۔۷۰ قدم چل کر وہ ایک جگہ ٹھہرے اور کہنے

لگے۔ دیکھو اس ٹوٹی ہوئی قبر میں جس کا تعویذ اور لوح تک غائب ہیں' ذوقؔ مرحوم آرام کر رہے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ بادشاہ کے ایماء سے یہاں ان کو دفن کیا گیا تھا' کیونکہ بادشاہ سلامت ہر سال قدم شریف آیا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا لوح کیا ہوئی۔ انھوں نے افسردہ خاطری سے جواب دیا۔ آہ نہ پوچھیے کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ یہ مزار اچھی حالت میں تھا۔ لوح جو ایک ڈال سنگ مرمر سے تراش کر بنائی گئی تھی۔ اس کو ایک متعصب[1] گروہ نے (انھوں نے ایک فرقہ کا نام لیا تھا مگر میں عرض نہ کروں گا) و چرا کر تباہ کر دیا۔ لوح کا اکھڑنا تھا کہ امتداد زمانہ نے مزار کی حالت بد سے بدتر بنا دی۔ مزار کی بے کسی اور بربادی پر دل بھر آیا۔ آنسو جاری ہو گئے[2]۔

شاد عارفی صاحب نے مزار ذوق کی مرمت کے سلسلہ میں درج ذیل تجویز پیش کی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں ذوقؔ مرحوم کے سلسلہ سے تعلق رکھنے والے ہزاروں شاعر ہوں گے اور صاحب ثروت بھی۔ اگر کوئی ایک صاحب اس کام کے لیے تیار ہو جائیں تو کیا کہنا۔ ورنہ پھر یہ صورت بہتر ہو گی ہر شخص ایک روپیہ یا حسب توفیق چندہ دینا منظور کرے تاکہ مزار از سر نو تعمیر ہو سکے۔ جو کار نیک ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ایک یادگار کی حفاظت بھی ہو گی۔ چندہ کہاں بھیجا جائے اور کس کے پاس جمع ہو۔ اس کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے معززین میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیا جائے اور عام اطلاع دی جائے کہ ہر وہ شخص جس کے دل میں ذرا بھی درد ہے حسب حیثیت امداد کر کے فرد منتخب سے رسید حاصل کرے اور چندہ جمع ہو جانے پر مزار کی بہ وجہ احسن مرمت کرا دی جائے۔

۱۔ شاد عارفی صاحب نے اس ہندو مسلم فساد کی طرف اشارہ کیا ہے جو قبرستان نبی کریم کے ایک کونے میں مندر تعمیر کرنے پر ہوا تھا۔

۲۔ شاد عارفی، ایک مطالعہ، ص، ۳۵۶۔

امید ہے کہ میری یہ التجا شرف قبولیت حاصل کرے گی۔

آخر میں مدیرانِ جرائد سے عرض ہے کہ وہ اپنے اپنے اخباروں یا رسالوں میں اس مضمون کو جگہ دیں تاکہ یہ گزارش اعلان عام کی صورت اختیار کرلے ۱۔"

۱۸ دسمبر ' کو مولانا اخلاق حسین قاسمی کا ایک خط 'قومی آواز نئی دہلی' میں شائع ہوا تھا، جس میں مزار ذوقؔ کی موجودہ حالت پر اظہار افسوس کیا گیا تھا۔ کچھ دن بعد محترم حکیم عبدالحمید نے مولانا قاسمی کو ایک خط لکھا۔ جس کی بنیاد پر مولانا صاحب نے قومی آواز میں ایک معلوماتی مراسلہ شائع فرمایا۔ حکیم عبدالحمید نے اطلاع دی تھی کہ حکیم صاحب کے بھائی حکیم عبدالوحید کا انتقال (۱۹۳۴ء) میں ہوا۔ اور انھیں قبرستان خواجہ باقی باللہ میں دفن کیا گیا۔ اس کے بعد اس قبرستان میں "ہمدرد احاطہ" کے نام سے ایک احاطہ قائم کیا گیا۔ اس موقع پر حکیم عبدالحمید صاحب کو معلوم ہوا کہ ذوقؔ کے مزار کی حالت بہت خستہ ہے۔ حکیم صاحب نے استاد ذوقؔ کے خانداں کی دس قبروں کی مرمت کرائی۔ ذوقؔ کی قبر پر کتبہ نہیں تھا۔ اس پر کتبہ لگوایا گیا اور قبر کی مرمت اس طرح کرائی گئی کہ وہ باقی دوسری قبروں کے مقابلہ میں نمایاں ہوگئی۔ حکیم عبدالحمید صاحب نے احاطے کی دیوار کی بھی مرمت کروائی اور احاطے کے دائیں طرف بھی کتبہ لگوایا۔ اس طرح یہ احاطہ اور قبریں محفوظ ہوگئیں۔ (دستاویز نمبر ۱)

شاد عارفی کا بیان پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم عبدالحمید صاحب نے ۱۹۳۵ء میں مزار ذوقؔ کی مرمت کرائی تھی۔ کیوں کہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں شاد عارفی کا جو مضمون ہمایوں (لاہور) میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مزار کی خستہ حالی کا ذکر کیا ہے۔ اس کا امکاں ہے کہ حکیم صاحب نے مزار کی مرمت کرادی ہو مگر مضمون شائع کرانے کے وقت شاد عارفی کو اس کا علم نہ ہو۔ ان دونوں بزرگوں میں سے کسی سے بھی غلط بیانی کی ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی۔

دہلی کے وقف بورڈ میں مزار ذوقؔ کی کچھ پرانی تصویریں محفوظ ہیں۔ ایک تصویر سے پتا چلتا ہے کہ مزار ذوقؔ ایک اونچے چبوترے پر بنا ہوا تھا۔ سرہانے کتبہ لگا ہوا تھا۔

---

۱ شاد عارفی، ایک مطالعہ، ص، ۳۵۶۔

۱۹۵۰ میں مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم وقف بورڈ دہلی کے ناظر تھے انھوں نے وقف بورڈ کے ایک انسپکٹر کے ساتھ قبرستان کا معائنہ کیا۔ اور انسپکٹر نے ۲۶ دسمبر ۱۹۵۰ء کو رپورٹ پیش کی کہ مزارِ ذوق اور احاطے کی دیوار کو بہت نقصان پہنچایا گیا ہے۔ قبرستان میں پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھیوں نے رہائش کے لیے چھوٹے چھوٹے کمرے بنا لیے تھے۔ انہوں نے انسپکٹر کی رپورٹ کے مطابق مزار ذوق کے احاطے کو بیت الخلا بنا لیا تھا۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ وقف بورڈ کے ناظر مولانا حفظ الرحمٰن نے مزارِ ذوق کا معائنہ کر کے فرمایا کہ "احاطے کی مرمت کرادی جائے اور دروازہ چڑھوا دیا جائے اور صفائی کرادی جائے" انسپکٹر نے مولانا حفظ الرحمٰن کے اس حکم کے بارے میں لکھا ہے کہ "اس احاطے پر دروازہ محفوظ رہنا بہت مشکل ہے۔ میرے خیال میں حفاظت کے لیے تیغہ لگوا کر احاطہ بند کرا دینا زیادہ مناسب ہوگا" انسپکٹر کی اس رپورٹ پر وقف کے کسی افسر کا نوٹ ہے "معاملہ پراپرٹی کمیٹی میں تخمینے کے ساتھ پیش کیا جائے" پھر کسی کا نوٹ ہے۔ کہ "سب اوورسیر صاحب سے تخمینہ تیار کرائیں جس پر انجینئر صاحب کی منظوری ہو۔ اس کے بعد ایجنڈے کا مسودہ تیار کریں"

۲۶/فروری ۱۹۵۱ء کو وقف بورڈ کے اورسیئر عبدالحمید صاحب نے مزارِ ذوق کی مرمت کا تخمینہ تیار کیا۔ جس کے مطابق سترہ روپے خرچ ہونے تھے۔ (دستاویز نمبر ۳)

"مزار حضرت ذوقؔ کی مرمت و تیپے کا کام کرا دیا گیا ہے۔ مبلغ ۱۲ روپے خرچ ہوئے تھے۔" (دستاویز نمبر ۴)

وقف بورڈ کے ریکارڈ کے مطابق ۱۰ جولائی ۱۹۵۲ء کو وقف بورڈ کے عبدالحمید صاحب نے رپورٹ کی ہے کہ "گزارش ہے کہ قبرستان نبی کریم احاطہ استاد ذوق مرحوم کا کتبہ شرنارتھیوں نے اٹھا لیا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے" اس رپورٹ پر وقف کے چار ملازمین کے دستخط ہیں۔ ایک نوٹ ہے "مولانا خلیل صاحب برائے فائل"۔ ایک اور نوٹ ہے "پولیس کو لکھ دیا جائے"۔ اس رپورٹ پر قائم مقام ناظر اوقاف محمد جعفری صاحب کے بھی دستخط ہیں۔ (دستاویز نمبر ۵)

۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو جناب محمد جعفری قائم مقام ناظر اوقاف نے پہاڑ گنج تھانے کے انسپکٹر

انچارج کو انگریزی میں تحریری شکایت کی کہ وقف بورڈ کے معائنہ کرنے والے ملازمین نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ پہاڑ گنج کے نبی کریم قبرستان میں واقع محمد ابراہیم ذوقؔ کے مزار کا کتبہ غائب کر دیا گیا ہے اور مزار کو نقصان پہنچایا گیا ہے۔ آئی۔پی۔سی کے تحت یہ جرم ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ اس سلسلہ میں تحقیق کر کے اصل مجرم کا پتا چلائیں (دستاویز نمبر ۶)

محمد جعفری صاحب کی اس رپورٹ پر پہاڑ گنج پولیس اسٹیشن کے انسپکٹر نے مزارِ ذوقؔ کا معائنہ کر کے انگریزی میں رپورٹ لکھی۔ جس میں کہا گیا ہے کہ "میں قبرستان کے چوکیدار کے ساتھ جائے وقوع پر گیا۔ ذوقؔ کا مزار بالکل درست حالت میں ہے۔ حال ہی میں قبر کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ البتہ مزار پر کتبہ نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں کتبہ گرا دیا گیا ہے"۔ پولیس انسپکٹر کی اس رپورٹ پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ (دستاویز نمبر ۷) بظاہر یہ رپورٹ وقف بورڈ کے قائم مقام ناظر محمد جعفری صاحب کی اس رپورٹ کے جواب میں میں لکھی گئی تھی۔ جو انھوں نے ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو دہلی کے پہاڑ گنج تھانے میں درج کرائی تھی۔

وقف بورڈ کے فائلوں میں کسی ملازم کی ایک رپورٹ محفوظ ہے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "قبرستان احاطہ استاد ذوقؔ قبرستان نبی کریم کے قریب دو سو گز اراضی سردار علی گورکن کے ایک شرنارتھی کے ہاتھ چھ روپے گز کے حساب سے فروخت کر کے پاکستان چلا گیا۔ رپورٹ برائے اطلاع پیش ہے" رپورٹ کے نیچے وقف کے کسی افسر کی ہدایت درج ہے۔ "جس نے بیعانہ کرایا ہے۔ اس کا پتا معلوم کیا جائے تاکہ تنسیخ بیعانہ کی کارروائی ہو سکے"۔ (دستاویز نمبر ۸) یہ ہدایت ۸ نومبر ۱۹۵۵ء کو لکھی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ہدایت پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر خلیق انجم کو دہلی کی تہذیب، تمدن، زبان، آثار قدیمہ غرض ہر چیز سے والہانہ عشق ہے۔ دہلی سے ان کی محبت کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے سرسید کی آثار قدیمہ تین جلدوں میں مرتب کی 'دہلی کے آثار قدیمہ' اور "دہلی کی درگاہ شاہ مرداں" جیسی اہم کتابیں لکھی ہیں اور آج دہلی کے آثار قدیمہ کے ماہرین میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا کہنا ہے کہ ایک دن وہ مہندیوں کے قبرستان کے پاس سے گزر رہے تھے کہ قبرستان کے احاطے سے باہر مغربی دیوار کے نیچے ایک قبر پر ان کی نظر پڑی۔ قبر پر جو شکستہ سا کتبہ لگا ہوا تھا اس سے معلوم ہوا کہ وہ قبر مومن خان مومن کی ہے۔ قبر

کی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کی مرمت کروا کے لوحِ قبر نصب کروا دیں گے۔ ابھی وہ قبر کی مرمت کی تیاری کر ہی رہے تھے۔ کہ بعض دوستوں کے مشورے سے انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ دہلی میں مدفون تمام شاعروں اور ادیبوں کی قبریں تلاش کریں گے اور جو مرمت طلب ہیں' ان کی مرمت کرائیں گے۔ اس کام کے لیے ابوالکلام اکیڈمی آف لیٹرز کے نام سے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ دہلی کالج (موجودہ ذاکر حسین کالج) کے پرنسپل مرزا محمود بیگ مرحوم اس کے صدر اور ڈاکٹر خلیق انجم سکریٹری منتخب ہوئے۔ اکیڈمی کے اراکین میں کروڑی مل کالج (دلی یونی ورسٹی) کے پرنسپل ڈاکٹر سروپ سنگھ' پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی' ڈاکٹر اسلم پرویز' پروفیسر نثار احمد فاروقی' پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور جناب انور کمال حسینی کے علاوہ اور کئی لوگ شامل تھے۔ تمام اراکین نے سو سو روپے جمع کیے اور اتنی رقم ہو گئی کہ مومن' محمد حسین گویا اور کئی شاعروں کے مزاروں کی مرمت کر کے ان پر کتبے لگا دیے گئے۔

آگے چل کر جب کمیٹی کا کام بڑھنے لگا تو قبرستانوں کے چودھریوں کو اندیشہ ہوا کہ شاید یہ کمیٹی ان قبرستانوں کی زمینوں پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے کمیٹی کی شدت سے مخالفت شروع ہو گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اکیڈمی کو اپنا کام بند کرنا پڑا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا کہنا ہے کہ یہ بات ۱۹۶۳ء کی ہے۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب نے مزارِ ذوق بھی تلاش کیا۔ یہ مزار نبی کریم قبرستان میں واقع تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر اسلم پرویز مزار پر گئے۔ انجم صاحب کا بیان ہے کہ مزار ایک احاطے میں تھا' جس میں آٹھ دس قبریں اور تھیں بالکل درمیان میں دوسری قبروں کے مقابلہ میں ایک اونچی سی قبر تھی۔ کسی قبر پر کوئی کتبہ نہیں تھا۔ لیکن درمیان میں جو قبر دوسری قبروں کے مقابلے میں کچھ اونچی تھی اس کے سرہانے کی دیوار پر کسی نے سیاہی سے موٹا موٹا "استاد ذوق" لکھ دیا تھا۔

تمام قبروں اور احاطے کی دیوار کی حالت بہت خراب تھی احاطہ خاصا بڑا تھا۔ اوقاف کے ریکارڈ سے معلوم ہوا۔ کہ مزارِ ذوق احاطہ ۵۴۰ مربع فٹ تھا۔ چوں کہ قبرستان میں پاکستان سے آنے والے شرنارتھیوں نے رہائش کے لیے چھوٹے چھوٹے کمرے بنا لیے تھے۔ اس لیے کچھ لوگ اور خاص طور سے عورتیں اس احاطے کو بیت الخلا کے طور پر استعمال کرنے لگی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے دہلی کے مشہور سیاسی رہ نماؤں خصوصاً میر مشتاق احمد صاحب' امداد صابری اور دوسرے بزرگوں کو مزارِ ذوق کی حالت سے مطلع کیا۔ سب ہی حضرات

نے لفٹنٹ گورنر اور دہلی کے میونسپل کمشنر سے ملاقات کر کے شکایت کی، لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ بقول ڈاکٹر انجم کچھ عرصے بعد جب وہ مزارِ ذوق پر گئے تو مزار اور اس کے پاس کی تمام قبریں نیست و نابود ہو چکی تھیں۔

انجم صاحب کا کہنا ہے کہ وہ گھنٹوں قبرستان میں گھوم کر مزارِ ذوق کی تلاش کرتے رہے۔ ایک جگہ انھیں برابر برابر تین پیڑ نظر آئے۔ ایک پیپل کا' دوسرا املی کا' اور تیسرا نیم کا' انھیں یاد آگیا کہ بشیر الدین احمد نے واقعات دارالحکومت میں لکھا ہے کہ مزارِ ذوق کے پاس برابر برابر پیپل' املی اور نیم کے تین درخت ہیں۔ ڈاکٹر انجم پورے قبرستان میں گھومے کہ کہیں اور تو اس طرح کے تین درخت ایک ساتھ نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ صرف یہی تین درخت ایک ساتھ ہیں۔ انجم صاحب نے یہ بھی دیکھا کہ ان درختوں کے مغرب میں پیلے رنگ کا ایک چھوٹا سا مکان تھا جو کچھ عرصے پہلے ہی بنا تھا' وہ اب بھی موجود تھا' ڈاکٹر انجم نے مزارِ ذوق کے اصل مقام کے تعین کے لیے ناصر خسرو صاحب' امداد صابری صاحب اور دوسرے لوگوں سے بھی مدد لی۔ عوامی بیت الخلا کے پاس ایک کتبہ زمین میں دبا ہوا تھا۔ اس کا کچھ حصہ زمین سے باہر تھا۔ ڈاکٹر انجم نے ہاتھ سے مٹی ہٹائی تو تھوڑا سا کتبہ باہر آگیا۔ یہ وہی کتبہ تھا جو مزارِ ذوق پر لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر انجم یہ کتبہ زمین سے باہر نکال رہے تھے کہ کچھ لوگوں نے دیکھ لیا۔ شاید وہ ڈاکٹر صاحب کا مقصد سمجھ گئے' اس لیے انھوں نے اعتراض کیا' جب ڈاکٹر صاحب نہیں مانے تو یہ لوگ لڑنے جھگڑنے پر اتر آئے۔ کچھ دن بعد ڈاکٹر صاحب ایک دوست کے ساتھ رات کے بارہ بجے اس مقام پر چھوٹی سی کرنی لے کر پہنچے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ لوگ گھروں سے باہر سو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ابھی کھودنا شروع کیا تھا کہ کسی نے دیکھ لیا اور اس طرح غل مچایا کہ لوگ اکٹھا ہو گئے۔ اگر ڈاکٹر صاحب اور ان کے دوست وہاں سے بھاگ نہ جاتے تو ممکن تھا کہ لوگ مار پیٹ پر اتر آتے۔

غرض مختلف نشانیوں کی مدد سے ڈاکٹر انجم نے مزارِ ذوق کی جگہ کا تعین کر لیا۔ ان قبروں اور احاطے کو مسمار کر کے دہلی میونسپل کارپوریشن نے عوامی بیت الخلا بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر انجم کو کارپوریشن کی حرکت پر سخت تکلیف ہوئی۔ انھوں نے دہلی کے بیشتر بزرگ رہنماؤں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ مولانا امداد صابری ڈاکٹر انجم کو لے کر حکومت کے مختلف ذمہ داران کے پاس گئے۔ میونسپل کارپوریشن کے ایک اعلیٰ افسر نے قطعیت کے ساتھ کہا کہ یہ جگہ وہ نہیں ہے۔ جہاں ذوق کا مزار تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے پیپل' نیم اور املی کے درختوں کی

نشانی بتائی اور ثبوت کے طور پر واقعات دارالحکومت دہلی کی دوسری جلد کی وہ عبارت پیش کی جس میں مزارِ ذوق کے پاس برابر برابر ان تینوں درختوں کا ہونا بتایا گیا ہے چوں کہ کارپوریشن کے افسروں کا رویہ متعصبانہ تھا۔ اس لیے کارپوریشن نے کچھ ہی دن میں ان تینوں درختوں کو جڑ سے اس طرح کٹوادیا کہ کسی بھی درخت کا نشان باقی نہیں رہا۔ ڈاکٹر انجم کا کہنا ہے کہ جب بھی دہلی انتظامیہ یا مرکزی حکومت کے کسی وزیر یا اعلیٰ افسر سے شکایت کی جاتی وہ کارپوریشن سے رجوع کرتا اور کارپوریشن کا رویہ مزارِ ذوق کے سلسلے میں انتہائی متعصبانہ تھا۔ لہٰذا کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوتا۔

مزارِ ذوق کی زمین خالی کرانے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ دہلی کی میونسپل کارپوریشن تھی۔ کچھ تو بیوروکریسی کے حاکمانہ رویے اور کچھ اردو کے خلاف تعصب کی وجہ سے کارپوریشن کے افسر یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ انھوں نے ذوق کا مزار منہدم کر کے وہاں عوامی بیت الخلا بنایا ہے۔ کئی دفعہ ڈاکٹر خلیق انجم کی میونسپل کارپوریشن کے افسران سے بحث ہوئی۔ تنگ آکر افسران انتہائی بدتمیزی پر اتر آئے۔ ان کی تلخ اور بے ہودہ باتوں سے بھی انجم صاحب ہمت نہیں ہارے۔ انھوں نے ۲۱ فروری ۱۹۸۱ء کو منعقد ہونے والی انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں مزارِ ذوق کا معاملہ پیش کیا۔ اراکین نے طے کیا کہ خلیق انجم صاحب کرنل بشیر حسین زیدی کے ساتھ وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ملاقات کر کے ان سے اس معاملہ میں تعاون کی درخواست کریں۔ کرنل بشیر حسین زیدی صاحب نے محترمہ اندرا گاندھی کے نام خط لکھ کر ۱۹ مارچ ۱۹۸۱ء کو اندرا جی سے ملاقات کی۔ زیدی صاحب نے اندرا جی کے نام جو خط لکھا تھا وہ اندرا جی کی خدمت میں پیش کیا۔ کرنل بشیر الدین زیدی صاحب کے کہنے پر ڈاکٹر خلیق انجم نے اندرا جی کو زبانی بتایا کہ نبی کریم قبرستان میں انیسویں صدی کے عظیم شاعر ذوق دہلوی کا مزار تھا۔ ذوق نہ صرف آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے درباری شاعر تھے بلکہ بہادر شاہ ظفر اور بہت سے شہزادے ذوق کے شاگرد تھے۔ ان حقائق کی روشنی میں مزارِ ذوق قومی اہمیت کا حامل تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ذوق کا مزار منہدم کر دیا گیا اور دہلی میونسپل کارپوریشن نے اس مقام پر عوامی بیت الخلاء بنادیا ہے۔ پچھلے بیس سال سے دہلی کی مختلف اردو تنظیمیں میونسپل کارپوریشن سے مطالبہ کرتی آرہی ہیں کہ اس بیت الخلاء کو ڈھادیا جائے تاکہ وہاں ذوق کا مقبرہ تعمیر کیا جاسکے۔ مقبرے کے چاروں طرف جو بہت بڑی زمین تھی اس پر ناجائز قبضے ہو گئے ہیں۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ مزار کے چاروں طرف ایک ہزار میٹر زمین خالی کرا کے دے دی جائے تاکہ ہم یادگار

ذوق تعمیر کر سکیں۔ مذکورہ زمین پر ناجائز قبضے کرنل۔ زیدی نے اندرا جی کے نام جو خط لکھا تھا۔ مؤدبانہ درخواست کی تھی کہ وہ دہلی میونسپل کارپوریشن اور دہلی انتظامیہ کو ہدایت دیں کہ وہ اس بیت الخلاء کو کسی اور جگہ منتقل کر کے یہ زمین ہمارے حوالے کر دیں تاکہ ذوق کے شایان شان یادگار قائم کی جا سکے (دستاویز ۹)۔ اندرا جی کو میونسپل کارپوریشن پر غصہ آگیا۔ انھوں نے کارپوریشن کے افسران کو برا بھلا کہا اور اپنے پرائیویٹ سکریٹری آر۔ کے دھون کو بلا کر کہا کہ وہ دہلی کے لیفٹننٹ گورنر کو خط لکھیں کہ وہ مزار ذوق پر سے بیت الخلاء کی عمارت فوراً گرا کر بیت الخلا کسی اور مقام پر بنا لیں اور یہ جگہ ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے حوالے کر دیں۔

محترمہ اندرا گاندھی کے نام کرنل زیدی کے خط پر ۵ مارچ ۱۹۸۱ کی تاریخ درج ہے۔ اندرا جی سے ملاقات کے فوراً بعد آر۔ کے۔ دھون صاحب نے ڈاکٹر خلیق انجم کو اس خط کی نقل دے دی۔ جو لفٹننٹ گورنر جگ موہن صاحب کو بھیجا گیا تھا۔

محترمہ اندرا گاندھی کے نام کرنل بشیر حسین زیدی کے خط کی نقلیں لیفٹننٹ گورنر دہلی میونسپل کمشنر دہلی اور چیف سکریٹری دہلی ایڈمنسٹریشن کو بھیجی گئی تھیں۔

ڈاکٹر انجم کا کہنا ہے کہ آر۔ کے۔ دھون صاحب نے اسی وقت ہی دہلی کے لفٹنٹ گورنر جگ موہن صاحب کو خط لکھا۔ یہ خط چپڑاسی کے ہاتھ فوراً ہی گورنر ہاؤس بھیج دیا گیا۔ خط میں کہا گیا تھا کہ میں کرنل بشیر حسین زیدی صدر ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا ایک خط منسلک کر رہا ہوں۔ اس خط میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو شاعر ذوق دہلوی کا مزار منہدم کر کے میونسپل کارپوریشن نے وہاں عوامی بیت الخلا بنا دیا ہے۔ زیدی صاحب نے درخواست کی ہے کہ بیت الخلا گرا کر کسی اور جگہ منتقل کر دیے جائیں اور یہ جگہ ان کے حوالے کر دی جائے تاکہ انسٹی ٹیوٹ وہاں ذوق کی قبر اور مقبرہ تعمیر کرا سکے۔ میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ اس معاملہ میں کارروائی کریں۔ اور وزیر اعظم کی اطلاع کے لیے ہمیں بتائیں کہ آپ نے کیا قدم اٹھایا ہے۔ (دستاویز نمبر ۱۰)

ڈاکٹر انجم کا کہنا ہے کہ آر۔ کے دھون صاحب نے ٹیلی فون پر بھی دہلی کے لفٹنٹ گورنر جگ موہن صاحب سے بات کی تھی۔ اور وہ جب ڈاکٹر صاحب گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ جگ

موہن صاحب کے دفتر سے دو دفعہ ٹیلی فون آچکا ہے۔ گورنر صاحب نے دوسرے، دن دس بجے اپنے دفتر بلایا تھا۔ انجم صاحب وقت مقررہ پر گورنر کے دفتر پہنچ گئے۔ جگ موہن صاحب نے مزارِ ذوق کے سلسلہ میں تمام معلومات حاصل کیں اور اس مقام پر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ مزارِ ذوق کے چاروں طرف بہت مکانات بن گئے تھے اور اب وہاں پہنچنا مشکل تھا لیکن یہ تو گورنر کا معاملہ تھا۔ خلیق صاحب نے اس مقام کا ایک نقشہ بنایا ہوا تھا' انھوں نے وہ نقشہ گورنر کے سکریٹری کو دے دیا۔ دوپہر کے دو بجے جب گورنر صاحب خلیق صاحب کے ساتھ اس مقام پر پہنچے تو پولیس اور سیکورٹی نے راستہ صاف کر رکھا تھا۔ گورنر کو وہاں تک پہنچنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ گورنر نے میونسپل کارپوریشن کے افسروں کو بھی بلا رکھا تھا۔ انھوں نے وہیں کارپوریشن کو حکم دیا کہ تین دن کے اندر اندر بیت الخلا کی عمارت ڈھادی جائے۔ خلیق صاحب کا کہنا ہے کہ وہ بہت خوش گھر واپس آئے۔ لیکن ابھی مصیبت کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس علاقے کے کچھ لوگ بیت الخلا ڈھانے کے خلاف عدالت سے اسٹے آرڈر لائے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر ڈاکٹر انجم اس علاقے میں پہنچے وہاں لوگوں سے بات کی اور مقامی لوگوں کے دلوں میں ذوق کی عزت اور مقام بڑھانے کے لیے بتایا کہ وہ بہت بڑے بزرگ تھے اور ان کے کچھ معجزے بیان کیے۔ جب لوگوں کے دلوں میں ذوق کے لیے احترام پیدا ہو گیا تو ڈاکٹر صاحب نے ایک خالی پلاٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر یہ بیت الخلا گرا کر اس پلاٹ پر بنادیا جائے تو کیا آپ کو اعتراض ہوگا۔ سب لوگ بخوشی راضی ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے دوسری تجویز پیش کی کہ بیت الخلا کے پاس جو لوگ رہتے ہیں ان میں دو چار لوگ راضی ہو جائیں انھیں دہلی کے کسی اور کالونی میں مکان دے دیے جائیں اور جو جگہ خالی ہو اس پر بیت الخلا بنادیا جائے۔ وہاں رہنے والوں نے یہ تجویز بھی پسند کی۔ ڈاکٹر انجم نے جگ موہن صاحب کو یہ دونوں تجویزیں بتائیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کارپوریشن کے افسروں کو بلا کر میٹنگ کی جس میں طے کیا گیا کہ بیت الخلا گرا کر کسی دوسرے مقام پر بنایا جائے گا۔ جگ موہن صاحب نے ڈاکٹر انجم سے پوچھا کہ بیت الخلا منہدم کر کے یہ زمین کس کو دی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا انجمن ترقی اردو (ہند) کو۔ جگ موہن صاحب نے کہا کہ آپ ذوق کے نام سے ایک سوسائٹی رجسٹر کیوں نہیں کرا لیتے۔ انجم صاحب نے کہا کہ اس میں تو مہینوں لگیں گے' جگ موہن صاحب نے کہا کہ میں دو تین دن میں رجسٹر کرادیتا ہوں۔ پھر میں یادگار بنانے کے لیے فنڈ کا انتظام کردوں گا جگ موہن صاحب نے دفتر کے ایک صاحب کو بلا کر ہدایت دی کہ ذوق سوسائٹی فوراً رجسٹر کرادیجیے۔ جگ موہن صاحب نے اس سوسائٹی کا نام "ذوق ریسرچ

انسٹی ٹیوٹ تجویز کیا"۲۷ مئی ۱۹۸۱ء کو یہ سوسائٹی رجسٹرار سوسائٹیز کے پاس رجسٹر ہوگئی۔اس کا رجسٹریشن نمبرNos/11769 ہے(دستاویز نمبر ۱۱)

سوسائٹی کے بنیادی اراکین میں درج ذیل نام شامل تھے۔کرنل بشیر حسین زیدی،ڈاکٹر خلیق انجم،سی۔ایس چڈھا صاحب،نفیس بیگم صاحبہ،کوشل کمار شرما صاحب،یوگندر بہل تشنہ صاحب،ضامن علی خاں صاحب۔جناب تمیز الدین قریشی،محترمہ ملکہ ناصری،جناب ظفر ادیب۔

کچھ دن بعد جب انسٹی ٹیوٹ کا انتخاب ہوا تو درج ذیل حضرات منتخب ہوئے۔جناب ایچ کے ایل بھگت سرپرست،صدر کرنل بشیر حسن زیدی،نائب صدور پریم سروریہ صاحب،پروفیسر ظہیر احمد صدیقی،جناب وشواناتھ طاؤس،اعزازی ڈائرکٹر ڈاکٹر خلیق انجم،جوائنٹ ڈائرکٹرز ڈاکٹر اسلم پرویز،جناب یوگندر بہل تشنہ،ضامن علی خاں صاحب،شمیم احمد صاحب خازن۔جناب چندن سروپ چڈھا۔

اہل اردو کی بدنصیبی کہ چند ہی روز بعد محترمہ اندرا گاندھی جگ موہن صاحب سے ناراض ہوگئیں۔جگ موہن صاحب کا تبادلہ کر دیا گیا۔کارپوریشن کے متعصب ذہن کو موقع مل گیا اور پورا پلان ختم ہوگیا۔

یہ واقعات مارچ ۱۹۸۱ء کے ہیں۔جگ موہن صاحب کی جگہ ایس۔ایل کھورانہ صاحب دہلی کے لیفٹننٹ گورنر مقرر ہوئے۔ڈاکٹر انجم نے کھورانہ صاحب کو اس سلسلے میں خط لکھا اور آر۔کے دھون صاحب کے اس خط کی نقل منسلک کی جو وزیر اعظم کی ہدایت پر جگ موہن صاحب کو لکھا گیا تھا(دستاویز ۱۲)۔دو تین مہینے تک کھورانہ صاحب اپنے نئے عہدے کے کاموں میں اس طرح مصروف رہے کہ مزار ذوق کے معاملے پر توجہ نہ کر سکے۔ڈاکٹر انجم کے بار بار یاد دلانے پر کھورانہ صاحب نے کرنل۔بی۔ایچ زیدی اور ڈاکٹر خلیق انجم کو اپنے دفتر بلایا۔زیدی صاحب ہندوستان سے باہر گئے ہوئے تھے۔انجم صاحب نے کھورانہ صاحب کو مزار ذوق کی پوری تفصیلات بتائیں۔

کھورانہ صاحب نے میونسپل کارپوریشن کے افسران کو بلایا تھا۔انھوں نے افسروں کو حکم دیا کہ پندرہ دن کے اندر اندر مزارِ ذوق کی تفصیلات پیش کریں۔اپنے سفر سے واپسی پر کرنل

زیدی نے ۱۵ جولائی ۱۹۸۱ء کو دہلی کے لیفٹنٹ گورنر۔ ایس۔ ایل۔ کھورانہ کو خط لکھا (دستاویز ۱۳) خط میں کہا گیا تھا کہ آپ نے پچھلے مہینے کی ۱۶ تاریخ کو ملاقات کا وقت دیا تھا مجھے افسوس ہے کہ ہندوستان سے باہر ہونے کی وجہ سے میں حاضر نہیں ہو سکا۔ ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خلیق انجم آپ سے ملے تھے اور انھوں نے مزارِ ذوق کی تمام تفصیلات سے آپ کو آگاہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر انجم کا کہنا ہے کہ آپ نے میونسپل کارپوریشن کو ہدایت دی ہے کہ وہ پندرہ دن کے اندر اندر آپ کو مزارِ ذوق کی صحیح پوزیشن سے واقف کرائیں۔ اب تک کارپوریشن کا جواب آپ کو مل گیا ہوگا۔ میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ مجھے یہ بتادیں کہ اس سلسلہ میں اب تک کیا پیش رفت ہوئی ہے۔ (دستاویز ۱۳)

۱۸ اگست ۱۹۸۱ء کو لیفٹنٹ گورنر ایس۔ ایل۔ کھورانہ نے ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے صدر کے نام ایک خط لکھا جس میں زیدی صاحب کے ۱۵ جولائی ۱۹۸۱ء کے خط کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا کہ مجھے ''دہلی کارپوریشن کے افسران نے اطلاع دی ہے کہ ذوق کا مزار قدم شریف کے خسرہ نمبر ۵۲ میں تھا۔ اور ہائی کورٹ نے یہ زمین اکبری دیوی (اصل نام اکبری بیگم) کی ملکیت قرار دیا ہے۔ اس لیے انتظامیہ کے لیے اس زمین پر ذوق کا مقبرہ تعمیر کرنا مشکل ہے۔ گورنر نے یہ بھی لکھا کہ میں نے کمشنر میونسپل کارپوریشن دہلی سے کہا ہے کہ وہ نبی کریم کے رہنے والوں کو راضی کر کے بیت الخلاء کہیں اور بنادے۔ اس سے پہلے جب اس طرح کی کوئی کوشش کی گئی تھی تو اس علاقے کے رہنے والوں نے مدافعت کی تھی۔ (دستاویز ۱۴)

اوائلِ جنوری ۱۹۸۲ء میں دہلی اردو اکادمی کی مجلسِ عام کا جلسہ ہوا۔ ڈاکٹر خلیق انجم تعلیمی کمیٹی کے چیئرمین تھے اور دلّی کے لفٹنٹ گورنر ایس۔ ایل۔ کھورانہ اکیڈمی کے صدر تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے مجلسِ عام کی اس میٹنگ میں مزارِ ذوق کا معاملہ اٹھایا۔ گورنر نے جواب دیا کہ آپ اس معاملے میں میرے سکریٹری سے رابطہ قائم کریں۔ ۲۲ر جنوری ۱۹۸۲ء کو ڈاکٹر خلیق انجم نے لیفٹنٹ گورنر کے سکریٹری کے۔ ایس۔ بیدوان کو خط لکھا جس میں اردو اکادمی کے جلسے میں مزارِ ذوق پر ہونے والی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ ذوق کا مزار بالکل اسی جگہ تھا جہاں عوامی بیت الخلاء بنایا گیا ہے۔ میونسپل کارپوریشن دہلی نے لیفٹنٹ گورنر کو اطلاع دی ہے کہ جس جگہ ذوق کا مزار تھا وہ جگہ اب ہائی کورٹ کے فیصلے کے مطابق ذاتی ملکیت ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا کہ کارپوریشن کا یہ بیان صریحاً غلط ہے۔ یہ معاملے کو ٹالنے کی ترکیبیں

ہیں۔ ڈاکٹر انجم نے اس جگہ کا ایک نقشہ خود تیار کیا تھا، جہاں کبھی مزارِ ذوقؔ تھا۔ اس خط کے ساتھ وہ نقشہ بھی منسلک کیا گیا اور خط کے آخر میں وہی درخواست کی گئی، جو انجم صاحب اور دوسرے متعلقین تمام ذمہ دار حضرات سے کرتے آئے تھے۔ یعنی بیت الخلا منہدم کر کے وہ جگہ ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو دے دیا جائے تا کہ ذوقؔ کے شایانِ شان وہاں ایک یادگار قائم کی جاسکے۔ (دستاویز۔۱۵)

افسوس ہے کہ بقول ڈاکٹر خلیق انجم گورنر آفس نے بالکل خاموشی اختیار کر لی۔ بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ دہلی میونسپل کارپوریشن کے افسر گورنر کو بہکانے میں کامیاب ہو گئے۔

اپریل ۱۹۸۳ء میں جگ موہن صاحب دوبارہ دہلی کے لیفٹننٹ گورنر ہو گئے۔ چوں کہ انھوں نے پہلے اس معاملے میں غیر معمولی دل چسپی لی تھی، اس لیے ڈاکٹر خلیق انجم نے جگ موہن صاحب کے نام ایک خط لکھ کر اُن سے ملاقات کی۔ اس خط میں مزارِ ذوق کا پورا پس منظر بیان کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ اندراجی کی ہدایت پر انھوں نے خود اس معاملے میں بہت دل چسپی لی تھی۔ (دستاویز۔۱۶) جگ موہن صاحب نے کہا کہ ہم ذوق ریسرچ انسی ٹیوٹ اور میونسپل کارپوریشن کے عہدے داروں کی ایک میٹنگ کر لیتے ہیں، جس میں یہ معاملہ طے کر لیا جائے گا۔

جون ۱۹۸۳ء میں ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سرپرست ایچ۔ کے۔ ایل بھگت صاحب نے استعفادے دیا اور اُن کی جگہ جناب سجن کمار (ایم۔ پی) کو سرپرست بنایا گیا۔ دہلی کے لیفٹننٹ گورنر نے جون کے دوسرے ہفتے میں مزارِ ذوق کے سلسلے میں ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے عہدے داروں کی ایک میٹنگ بلائی۔ ۶ر جنوری ۱۹۸۳ء کو ڈاکٹر خلیق انجم نے لیفٹننٹ گورنر کے سکریٹری اسرار احمد صاحب کو اس تمام خط و کتابت کا فائل بھیجا جو مزارِ ذوقؔ کے سلسلے میں صوبائی اور مرکزی حکومت کے مختلف عہدے داروں سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس خط میں یہ بھی لکھا کہ سجن کمار صاحب جو سوسائٹی کے سرپرست ہیں، میٹنگ میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے انھیں بھی اس میٹنگ میں مدعو کیا جائے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ بھی درخواست کی کہ ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نائب صدر پریم سرور یہ صاحب کو بھی اس میٹنگ میں مدعو کیا جائے۔ (دستاویز۔۱۷) ڈاکٹر خلیق انجم کے قول کے مطابق لیفٹننٹ گورنر جگ موہن کے دفتر میں بہت اچھی میٹنگ ہوئی۔ چائے کے ساتھ بہت

مزے کے لوازمات پیش کیے گئے اور بات ختم ہو گئی۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اس میٹنگ کے بعد جگ موہن صاحب نے مزارِ ذوق کے بارے میں قطعی دل چسپی نہیں لی۔ یہ بات ہمیں بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ جگ موہن صاحب اردو کے مخالفوں میں ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا وہ اعلانیہ طور پر بی۔ جے۔ پی میں شامل ہو گئی ہیں اور اس پارٹی کی طرف سے راجیہ سبھا کے رکن بھی ہیں۔ مزارِ ذوق میں ان کی دل چسپی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کی وجہ سے تھی۔ وہ دنیا میں نہیں رہیں تو جگ موہن صاحب کی بھی دل چسپی ختم ہو گئی۔

کچھ عرصے خاموش رہنے کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے مزارِ ذوق کی بازیافت کے لیے پھر جدو جہد شروع کی۔ اس دفعہ انھوں نے دہلی سے شائع ہونے والے ہندوستان کے مشہور انگریزی اخبار STATESMAN سے رجوع کر کے اخبار کے چیف رپورٹر کو مزارِ ذوق کی تفصیلات سے واقف کیا۔ اسٹیٹسمین نے ۲۳ر مئی ۱۹۸۳ کی اشاعت میں مزارِ ذوق کے بارے میں لکھا کہ "مزارِ ذوق نبی کریم قبرستان میں پبلک لیٹرن کے نیچے دبا ہوا ہے۔ ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کے بیان کے مطابق ۱۹۴۷ء سے قبل نبی کریم ایک باقاعدہ قبرستان تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد مزار منہدم کر کے اس پر بیت الخلا بنا دیا گیا ہے۔" اس کے بعد کرنل بشیر حسین زیدی اور ڈاکٹر خلیق انجم کی محترمہ اندرا گاندھی، جگ موہن اور دو دوسرے گورنروں سے ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ "ڈاکٹر خلیق انجم کا کہنا ہے کہ کتنی شرم کی بات ہے کہ ایسے عظیم شاعر کا مزار ہمیشہ بیت الخلا کے نیچے رہے گا۔" (دستاویز ۱۸)

اس کے پانچ دن بعد علی گڑھ کے الیاس احمد صاحب کا ایک خط "قومی آواز" (نئی دہلی) میں ۲۸ر مئی ۱۹۸۳ء کو شائع ہوا۔ الیاس صاحب نے ۲۳ر مئی ۱۹۸۳ء کے States man میں شائع ہونے والے نوٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ذوق کے قبر کی یہ دُرگت بنا بڑے شرم کی بات ہے۔ (دہلی انتظامیہ کم از کم عوامی بیت الخلا کو منہدم کر کے ذوق کے قبر کی تعمیر کر سکتی ہے۔ (دستاویز ۱۹)

انجمن کے اردو آرکائیوز کے فائل میں ضامن علی خاں صاحب کے ایک مضمون کا تراشا محفوظ ہے، جس کا عنوان ہے "مٹے ناموں کے نشان کیسے کیسے" تراشے کے اوپر بائیں طرف کے حاشیے میں ۱۰ر جون ۱۹۸۳ء کی تاریخ لکھی ہے اور نیچے حاشیے میں "قومی آواز" (لکھنؤ) ۱۵ر جون ۱۹۸۳ء لکھا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ضامن علی خاں کا یہ مضمون ۱۰ر جون کو دتی

کے "قومی آواز" میں شائع ہوا تھا اور ۱۵؍ جون ۱۹۸۳ء کو "قومی آواز" (لکھنؤ) میں نقل ہوا۔ یہ مضمون مزارِ ذوقؔ کی تفصیلات پر بہت اچھی روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں مزارِ ذوقؔ پر بیت الخلا کو منہدم کرنے کے سلسلے میں ذوقؔ دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ڈاکٹر خلیق انجم، مولانا امداد صابری، کرنل بشیر حسین زیدی، شری ایچ۔ کے۔ ایل بھگت، جناب سجن کمار (ایم۔ پی) ، محترمہ اندرا گاندھی اور دوسرے لوگوں کی خدمات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ پورا مضمون دستاویز ۱۹ کے تحت نقل کیا گیا ہے۔

۶؍ جون ۱۹۸۳ء کو اردو کے ایک اور اخبار میں کسی کا خط شائع ہوا ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے اردو آرکائیوز کے ریکارڈ میں جو اردو اخبار کا تراشا محفوظ ہے اس میں اخبار کا نام نہیں پڑھا جارہا ہے۔ اس تراشے میں مزارِ ذوقؔ کی بازیافت کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم، کرنل بشیر حسین زیدی اور مولانا امداد صابری کی کوششوں کو سراہا گیا ہے اور مطالبہ کیا گیا ہے کہ جلد سے جلد بیت الخلا منہدم کر کے ذوقؔ کا مزار بنایا جائے۔ (دستاویز ۲۰)

۱۴؍ جون ۱۹۸۳ء کو "قومی آواز" (نئی دہلی) میں مہندر راو برائے کا ایک مراسلہ شائع ہوا۔ انھوں نے صامن علی خاں صاحب کے مضمون "مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے" کا حوالہ دیتے ہوئے مزارِ ذوقؔ کی اس حالت اور دہلی میونسپل کارپوریشن کی شرمناک حرکت پر اظہارِ افسوس کیا ہے اور لکھا ہے کہ مجھ پر اردو شاعری کا جو قرض ہے اُسے میں اس طرح چکانا چاہتا ہوں کہ جب میونسپل کارپوریشن بیت الخلا ڈھادے تو میں اپنے خرچ سے ذوقؔ کا مقبرہ سوادوں۔ (دستاویز ۲۱) او برائے صاحب نے محترمہ اندرا گاندھی، لیفٹننٹ گورنر جناب جگ موہن اور ڈاکٹر خلیق انجم کو ذاتی خط لکھ کر بھی یہ پیش کش کی تھی۔ لیکن کارپوریشن بیت الخلا ڈھانے کے لیے تیار ہی نہ تھی اس لیے مقبرہ بنانے کا سوال ہی نہیں تھا۔

۱۵؍ جون ۱۹۸۳ء کو دہلی کی پانچ چھ انجمنوں نے "قومی آواز" میں مراسلہ شائع کرایا، جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ لیفٹننٹ گورنر فوری طور پر پبلک لیٹرن گرا کر مزارِ ذوقؔ کی تعمیر کریں۔ اس مراسلے پر دستخط کرنے والوں میں ساغر نظامی صاحب، فاروق جمالی صاحب، ملک زادہ صاحب، یوگیندر بہل تشنہ صاحب اور بھیم سین ظفر ادیب تھے۔ (دستاویز ۲۲)

ہندوستان کے بیشتر اخبار مزارِ ذوقؔ کے سلسلے میں دہلی میونسپل کارپوریشن پر لعن وطعن کر رہے تھے۔ مراد آباد کے منصور چودھری کا ایک مراسلہ ۱۸؍ جون ۱۹۸۳ء کے "قومی آواز" (نئی دہلی) میں شائع ہوا، جس میں مزارِ ذوقؔ کی حالت پر اظہارِ افسوس کیا گیا اور کہا گیا

کہ "ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سرپرست سجن کمار صاحب اور اعزازی ڈائرکٹر ڈاکٹر خلیق انجم سے ہماری درخواست ہے کہ دہلی میں مقیم تمام زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کا ایک وفد فوراً مسز اندرا گاندھی جی کے پاس لے جائیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ اندرا گاندھی اس سلسلے میں ہماری مدد نہ کریں۔ اگر وفد میں شرکت کے لیے ہماری ضرورت ہے تو ہم چار پانچ سو کی تعداد میں اپنے خرچ پر دہلی آنے کو تیار ہیں۔" (دستاویز ۲۳)

۲۰؍جون ۱۹۸۳ء کو اردو کے مشہور ادیب وشوناتھ طاؤس صاحب کا خط "قومی آواز" (نئی دہلی) میں شائع ہوا۔ طاؤس صاحب نے خط میں لکھا تھا "حیرت ہے کہ ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو وزیرِ اعظم اور لیفٹنٹ گورنر کی حمایت حاصل ہے اور مسٹر سجن کمار ایم۔ پی اور ڈائرکٹر خلیق انجم جیسے بارسوخ، باصلاحیت اور فعال لوگ انسٹی ٹیوٹ کے سرپرست اور ڈائرکٹر ہیں، پھر بھی معاملہ وہیں کا وہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی ہماری کوششوں میں کوئی کمی ہے۔ اگر انسٹی ٹیوٹ چنڈی گڑھ کے اردو دوستوں کی مدد چاہتا ہے تو ہم ہر طرح حاضر ہیں۔"

"قومی آواز" کے اوائل ۱۹۸۳ء کی کسی اشاعت میں ڈاکٹر خلیق انجم نے مزارِ ذوق کی پوری تفصیلات شائع کرائیں۔ اس کے علاوہ انجم صاحب نے انگریزی اخبار نیشنل ہیرلڈ سے رابطہ قائم کیا، جس نے ۵؍اپریل ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں ڈاکٹر خلیق انجم کے حوالے سے مزارِ ذوق کی تفصیلات بیان کیں۔

مزارِ ذوق کے سلسلے میں اخباروں میں جو خبریں شائع ہوئیں، اُن سے متاثر ہو کر راجیہ سبھا کے کسی ممبر نے پارلیمنٹ میں سوال کیا۔ پارلیمنٹ نے ڈائرکٹر آثارِ قدیمہ ایم۔ ڈی۔ کھرے صاحب سے مزارِ ذوق کے بارے میں دریافت کیا۔ کھرے صاحب نے سپرنٹنڈنٹ آثارِ قدیمہ وقار حسن صدیقی صاحب کو رپورٹ لکھنے کی ہدایت دی۔

۲۵؍جون ۱۹۸۳ء کو صدیقی صاحب نے ایم۔ ڈی۔ کھرے صاحب کو اپنی رپورٹ پیش کی۔ رپورٹ کے آخری پیراگراف میں لکھا کہ دہلی کے کچھ پرانے لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ قبرستان نبی کریم میں جو بیت الخلا ہے اس کے نیچے مزارِ ذوق کا کچھ حصہ دب گیا ہے۔ (دستاویز ۲۵)

۵؍اگست ۱۹۸۳ء کو وقار حسن صدیقی صاحب نے ایم۔ ڈی۔ کھرے صاحب کو اپنی رپورٹ کا دوسرا حصہ پیش کیا۔ چوں کہ وقار صاحب اردو اور فارسی کے بھی اسکالر ہیں، اس لیے

انھوں نے رپورٹ کے دوسرے حصّے میں ذوق کے مختصر اور مستند حالات لکھے۔
(دستاویز ۲۶)

ہر قدم پر ناکامی ہوتی رہی، لیکن ڈاکٹر خلیق انجم صاحب ہمّت نہیں ہارے۔ اب انھوں نے پارلیمنٹ کا سہارا لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے لوک دل کی طرف سے لوک سبھا کے ممبر محفوظ علی خاں صاحب کو مزارِ ذوق کے حالات سے واقف کرایا۔ محفوظ صاحب نے اس سلسلے میں پارلیمنٹ میں سوال کیا۔ "کہ کیا حکومت کو معلوم ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے استاد محمد ابراہیم ذوق کے مزار پر بیت الخلا بنا دیا گیا ہے۔ حکومت ایسی تاریخی عمارتوں کے تحفظ کے لیے کیا اقدامات کر رہی ہے۔"

۲۱ر نومبر ۱۹۸۵ء کو محفوظ علی خاں صاحب کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے مرکزی وزیر مملکت برائے تہذیب و ثقافت محترمہ رہتگی نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ "ذوق کی قبر ایک قبرستان میں بتائی جاتی ہے لیکن اس قبرستان میں یہ تعین نہیں کیا جاسکتا کہ ذوق کی قبر کس جگہ ہے" محترمہ رہتگی کے اس بیان پر ڈاکٹر خلیق انجم نے ۸ر دسمبر ۱۹۸۵ء کے "ہماری زبان" کا اداریہ لکھا۔ انھوں نے محترمہ رُہتگی کے بیان پر بہت سخت الفاظ میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

> "ہمیں نہیں معلوم کہ مسز رُہتگی کو یہ اطلاعات کس نے فراہم کی ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس بیان میں جس دروغ گوئی سے کام لیا گیا ہے اس کی ذمےداری کس پر ہے۔ ممکن ہے بعض سرکاری افسروں نے مسز رُہتگی کو اس طرح کی لغو اطلاعات فراہم کی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود مسز رُہتگی نے اختراع فرمائی ہو۔ بہر حال حقیقت وہ ہے جو ہم کئی سال سے کہہ رہے ہیں۔ استاد ذوق کے مزار پر پبلک بیت الخلا بنا ہوا ہے۔ ہم نے پرانی دہلی والوں سے تحقیق کرکے اس جگہ کی نشان دہی کی تھی۔ آج سے لگ بھگ تین چار سال پہلے کرنل زیدی اور میں (خلیق انجم) مرحومہ اندرا گاندھی سے ملے تھے اور ہم نے مزارِ ذوق کے بارے میں ایک میمورنڈم پیش کیا تھا۔ اندرا جی نے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ مہینہ بھر کے اندر اندر یہ مسئلہ حل کر دیں گی۔ مرحومہ نے حسبِ عادت فوراً اقدام کیا اور اپنے پرسنل

سکریٹری دھون صاحب کو بلا کر ہمارا میمورنڈم ان کو دیا اور ہماری موجودگی میں حکم دیا کہ دہلی کے لیفٹننٹ گورنر سے کہہ کر یہ کام فوراً کرادیا جائے۔ چند دن میں دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جگ موہن صاحب نے ہمیں بلا کر پوچھا کہ مزارِ ذوق کی اصل جگہ کون سی ہے۔ ہم نے نقشہ بنا کر انھیں دے دیا۔ جگ موہن صاحب نے جب کارروائی شروع کی تو معلوم ہوا کہ اس جگہ سے بیت الخلا ہٹانے کے خلاف کچھ لوگ عدالت سے حکم امتناعی لائے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کو اس پر اعتراض نہیں تھا کہ بیت الخلا ہٹایا جارہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ آس پاس کسی دوسری جگہ پہلے بیت الخلا بنایا جائے پھر موجودہ بیت الخلا کو ڈھادیا جائے۔ ابھی یہ کوششیں چل ہی رہی تھیں کہ جگ موہن صاحب کا دہلی سے تبادلہ ہوگیا اور یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ کچھ دن بعد ہم نے پھر نئے لیفٹننٹ گورنر سے بات چیت شروع کی انھوں نے فائل نکلوایا اور پھر کوشش شروع کردی۔ ان کو دفتر نے یہ اطلاع دی تھی کہ آس پاس کوئی ایسی خالی جگہ نہیں ہے جس پر بیت الخلا بنایا جاسکے۔ اس مرحلے پر ہم نے مشورہ دیا کہ آس پاس کے (قریب) رہنے والوں میں سے اگر کسی بھی خاندان کو نئی کولونیوں میں کہیں معاوضہ کے طور پر سوگز زمین دے دی جائے تو وہ خاندان بخوشی راضی ہو جائے گا۔ کوہلی صاحب کو ہماری یہ تجویز پسند آئی۔ انھوں نے اپنے متعلقہ افسر کو حکم دیا کہ وہ اس طرح کا خاندان تلاش کریں۔ ابھی یہ کوششیں جاری ہی تھیں کہ گورنر صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے۔

دلّی اردو اکادمی کے دو تین جلسوں میں میں نے جناب ایم۔ کے ولی لیفٹننٹ گورنر دلّی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ اکادمی کے سارے اراکین گواہ ہیں کہ انھوں نے ہمیشہ وعدہ کیا اور کہا کہ چند دنوں ہی میں یہ مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن ہماری معلومات کے مطابق انھوں نے اس سلسلے میں کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ مسز رُہتگی اگر اصل جگہ کا ثبوت چاہتی ہیں تو ہم تمام ثبوت فراہم کرنے کو تیار

ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ دروغ گوئی بہت ہو چکی۔ طرح طرح کے بہانوں سے ہم اردو والوں کو بہلا چکے اگر ۲۵ر گز زمین اردو والوں کو دے دی جائے تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔ ڈی۔ڈی اے نے اربوں روپوں کی مسلم اوقاف کی زمین پر قبضہ کیا ہے۔ اوقاف کی یہ زمین پانچ پانچ ہزار روپے گز بیچی جارہی ہے۔ اگر ایسی ۲۵ گز زمین واپس کردی جاے اور جس کی قیمت ڈیڑھ دو سو روپے گز سے زیادہ نہیں ہے تو حکومت کا ایسا کون سا نقصان ہو جائے گا۔"

("ہماری زبان" ۸ر دسمبر ۱۹۸۵ء صفحہ ۲۔)

جب قومی پریس اور پارلیمنٹ میں مزارِ ذوق کے مسئلے پر سخت احتجاج شروع ہوا تو آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو بھی کچھ ہوش آیا۔ دہلی آثارِ قدیمہ کے ڈائرکٹر ایم۔ڈی۔ کھرے صاحب نے ۲۱ر جنوری ۱۹۸۶ء کو کرنل بشیر حسین زیدی کو خط لکھ کر ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین کا نام اور انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں دیگر تفصیلات دریافت کیں۔ (دستاویز نمبر ۲۷) کھرے صاحب کے اس خط کا جواب ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے ڈاکٹر خلیق انجم نے ۲۳ر جنوری ۱۹۸۶ء کو ایک خط کے ذریعے دیا۔ اس خط میں مزار ذوق کے سلسلے میں ہونے والی پوری کارروائی، بیان کی گئی تھی نیز محترمہ اندرا گاندھی اور مختلف گورنروں نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا تھا، وہ سب بیان کیا۔ (دستاویز ۲۸)

دہلی اردو اکادمی کی جنرل باڈی کی میٹنگ ۲ر جولائی ۱۹۸۶ء کو لیفٹننٹ گورنر کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں ڈاکٹر خلیق انجم نے بہت شد ومد کے ساتھ مزارِ ذوق کا معاملہ اٹھایا۔ ہوا وہی جو بقول ڈاکٹر خلیق انجم ہر ایسی میٹنگ میں ہوتا تھا۔ لیفٹننٹ گورنر نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد معاملے کو طے کرلیں گے۔ لیکن بات اس سے آگے نہیں بڑھی۔

یہ تمام معاملات چلتے رہے اور ۱۹۵۲ء کے بعد دہلی وقف بورڈ بالکل خاموش رہا۔ اس نے اس معاملے میں قطعی دل چسپی نہیں لی۔ وقف بورڈ کے ریکارڈز میں پرایر ٹی انسپکٹر وقف بورڈ کی لکھی ہوئے ایک مفصل رپورٹ ملتی ہے جو وقف بورڈ کے سکریٹری کو پیش کی گئی۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ "آپ نے ۹ر ستمبر ۱۹۸۶ء کو ہدایت دی تھی کہ میں مزارِ ذوق کے سلسلے میں رپورٹ تیار کروں۔ دوسرے ہی دن میں قبرستان نبی کریم، پہاڑ گنج گیا۔ میں نے دیکھا کہ

قبرستان کے جس حصے پر پختہ مکانات بنائے گئے ہیں وہاں عام لوگوں کی سہولت کے لیے مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے پبلک لیٹرن بنائی گئی ہے آس پاس کے رہنے والے مسلمانوں سے معلوم ہوا کہ پبلک لیٹرن مزارِ ذوق پر تعمیر کیا گیا۔ لوگوں نے پراپرٹی انسپکٹر کو یہ بھی بتایا کہ استاد ذوق کے مزار پر "پختہ کتبہ" تھا۔ پراپرٹی انسپکٹر نے اپنی رپورٹ میں کئی باتیں ایسی کہی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُن کی بس یہ بات درست ہے کہ بیت الخلا مزارِ ذوق پر بنایا گیا تھا۔" (دستاویز ۲۹)

۱۹۹۱ء میں مارکنڈے سنگھ صاحب دہلی کے لیفٹننٹ گورنر تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے مارکنڈے سنگھ صاحب کو ایک خط لکھا، جس میں مزارِ ذوق کی پوری تفصیلات بیان کر کے درخواست کی کہ پبلک لیٹرن منہدم کر کے یہ جگہ دہلی اردو اکادمی یا ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو دے دی جائے۔ کچھ دنوں تک جب مارکنڈے سنگھ صاحب کا کوئی جواب نہیں آیا تو ڈاکٹر انجم صاحب گورنر سے ملنے خود چلے گئے۔ گورنر نے مزارِ ذوق کا فائل منگوایا، فائل میں سب سے اوپر ڈاکٹر خلیق انجم کا وہ خط لگا ہوا تھا، جو انھوں نے ۵ رجون ۱۹۹۱ء کو لیفٹننٹ گورنر مارکنڈے سنگھ کو لکھا تھا۔ اس خط کے حاشیے پر مختلف سرکاری افسروں کے کچھ نوٹ لکھے ہوئے تھے۔ گورنر صاحب نے اس خط کی زیروکس کاپی خلیق انجم صاحب کو دلوادی۔ خط کے سب سے نیچے بارڈر بنا کر لکھا گیا تھا (Most Urgent)۔ خط کے بائیں حاشیے پر ایک نوٹ تھا جو بقول ڈاکٹر انجم لیفٹننٹ گورنر کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور غالباً میونسپل کمشنر کے لیے لکھا گیا تھا۔

"Kindly recall my telephonic conversation in the behalf for removal of the obvious structures from the site of Zauq's grave in Nabi Karim Please do the needful early so that this sore point may not be agitate again and again"

خط کے بائیں حاشیے پر یہ نوٹ ہے

"Is necessary Shri Khaliq Anjum may be contacted He has one plan for it "

اس سے نیچے ایک اور نوٹ ہے۔

" Get this attended to and let me have a report early "

(دستاویز ۳۰)

ڈاکٹر خلیق انجم اس معاملے میں کبھی خاموش ہو کر نہیں بیٹھے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر سید حامد صاحب کے زیر قیادت ایک وفد دہلی کے لیفٹننٹ گورنر سے ۱۹/ اپریل ۱۹۹۱ء کو ملا۔ اس وفد میں سید حامد صاحب کے علاوہ ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی شامل تھے۔ اس وفد نے گورنر کو دو میمورنڈم پیش کیے۔ ایک میمورنڈم دہلی میں اردو کے مسائل کے بارے میں تھا اور دوسرا مزار ذوق کے سلسلے میں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کچھ دن انتظار کیا اور جب گورنر نے کچھ نہیں کیا تو ڈاکٹر خلیق انجم کی قیادت میں پھر ایک وفد لیفٹننٹ گورنر سے ملا۔ اس وفد میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر اسلم پرویز اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی شامل تھے۔ وفد نے پھر ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں بیت الخلاء کو ڈھانے کا پرانا مطالبہ کیا گیا۔ گورنر صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد کچھ کریں گے لیکن افسوس کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ (دستاویز ۳۱)

روزنامہ "عظیم آباد ایکسپریس"۔ پٹنہ نے اس موضوع پر ۲۲/ جون ۱۹۸۳ء کو بہت طویل اداریہ لکھا۔ انھوں نے اداریے میں لکھا کہ مزار ذوق کے سلسلے میں تحریک چلانے والوں کو صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ صاحب کی توجہ مبذول کرانی چاہیے چوں کہ خود وہ بھی ایک شاعر ہیں۔ یقیناً وہ ایک شاعر کے مزار کی بے کسی کو برداشت نہیں کر سکتے اور فوری طور پر اقدام کریں گے۔ رضوان صاحب مدیر "عظیم آباد ایکسپریس" نے اداریے میں مزید لکھا کہ "اس سلسلے میں ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قبل ہی سے کام کر رہا ہے، جس کے سرپرست پہلے ایچ۔ کے۔ ایل بھگت ہوا کرتے تھے جو اب مرکز میں وزیر اطلاعات و نشریات ہیں۔ اب اُس کے سرپرست سجّن کمار (ایم۔ پی) ہیں۔ اس کے صدر کرنل بشیر حسین زیدی اور ڈاکٹر خلیق انجم ہیں۔ ڈاکٹر انجم ہندوستان بھر کے اردو کے مسائل کے لیے جدوجہد کرتے رہتے ہیں اور بہت حد تک حل کرتے رہتے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اُن کی آنکھوں کے سامنے مزار ذوق پر عوامی بیت الخلاء کی تعمیر کر دی گئی اور وہ خاموش ہو کر دیکھتے رہے"۔ (دستاویز ۳۲) رضوان احمد صاحب بہت معقول اور سمجھ دار آدمی ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اس تکلیف کی وجہ سے جو مزار ذوق کے انہدام سے انھیں ہوئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ بقول ڈاکٹر انجم مزار کے انہدام کے بعد انھیں اس تاریخی حادثے کا علم ہوا۔ جب ہندوستان کے وزیرِ اعظم دہلی میونسپل کارپوریشن کی چالاکیوں اور تعصب کے سامنے بے بس ہو گئیں تو ڈاکٹر خلیق انجم کس گنتی میں تھے۔

۱۹۹۶ء کے اوائل میں انگریزی کے مشہور صحافی فیروز بخت صاحب نے کسی انگریزی اخبار میں ایک مقالہ لکھا جس میں بہت مؤثر انداز میں غالب اور ذوق کے مزاروں کی خستہ حالی کا ذکر کرتے ہوئے، اس بیت الخلاء کی تفصیل بیان کی جو مزارِ ذوق پر بنایا گیا تھا۔ سپریم کورٹ کے ایک مشہور ایڈووکیٹ ایم۔ سی۔ مہتہ نے یہ تحریر پڑھی۔ انھیں اردو کے ان عظیم شاعروں کے مزاروں کی اس حالت پر بہت افسوس ہوا۔ انھوں نے عوامی مفاد کے تحت آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا اور دہلی میونسپل کمشنر کے خلاف سپریم کورٹ میں رٹ پٹیشن دائر کر دی۔ اتفاق سے معاملہ جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس صغیر احمد کی بینچ کی عدالت میں پیش ہوا۔

۲۳/ اگست ۱۹۹۶ء کو ذوق اور غالب کے مزاروں کے سلسلے میں سپریم کورٹ میں سماعت تھی۔ عدالت نے انجمن ترقی اردو (ہند) غالب انسٹی ٹیوٹ اور غالب اکیڈمی کے نمائندوں کو بھی عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا تھا۔ انجمن کی طرف سے ڈاکٹر خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شاہد ماہلی صاحب؛ اور غالب اکیڈمی کی طرف سے ڈاکٹر عقیل احمد عدالت کی وزیٹنگ گیلری میں بیٹھے تھے۔ جسٹس صغیر احمد اور جسٹس کلدیپ سنگھ جج تھے۔ مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ میونسپل کارپوریشن کے کمشنر نے بحث کا آغاز کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ نبی کریم میں مزارِ ذوق کی وہ جگہ نہیں ہے جہاں عوامی بیت الخلاء بنے ہوئے ہیں۔ جسٹس صغیر احمد اور جسٹس کلدیپ سنگھ سوال پر سوال کر رہے تھے لیکن میونسپل کمشنر بہت تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ ایک وقت وہ آیا، جب محسوس ہونے لگا کہ عدالت کمشنر کے دلائل کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہی ہے ۔اردو والوں کی خوش نصیبی تھی کہ اس وقت عدالت میں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے مشہور وکیل طاہر صدیقی صاحب اور ڈاکٹر خلیق انجم بھی موجود تھے۔ طاہر صدیقی صاحب کی نظر ڈاکٹر خلیق انجم پر پڑی۔ انھوں نے عدالت سے کہا کہ اس وقت عدالت میں اردو کے ایک ممتاز اسکالر ڈاکٹر خلیق انجم موجود ہیں۔ مزارِ ذوق کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی جو معلومات ہیں وہ کسی اور کی نہیں ہیں کیوں کہ پچھلے تیس پینتیس سال سے مزارِ ذوق کی بازیافت کی کوشش کر رہے ہیں۔ عدالت نے وزیٹنگ گیلری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر خلیق انجم سامنے آ جائیں۔

ڈاکٹرانجم کا کہنا ہے کہ جب میں وزیٹنگ گیلری سے اس مقام کی طرف جارہا تھا۔ جہاں وکیل کھڑے ہوکر بحث کرتے ہیں تو غیر معمولی طور پر نروس تھا۔" ڈاکٹر صاحب نے گفتگو کا آغاز اس طرح کیا

Me Lord, I am appearing before the Supreme Corurt for the first time I dont know the etiquettes of the court I even dont know how to address the Honarable Court

ڈاکٹر خلیق انجم کا شمار اردو کے چند ممتاز ترین مقررین میں ہوتا ہے، لیکن اس وقت اُن کی آواز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بہت نروس ہیں۔ اُن کی بات سن کر جسٹس کلدیپ سنگھ نے ہنس کہا کہ

You are appearing like an experienced lawyer

ڈاکٹرانجم کا کہنا ہے کہ جسٹس کلدیپ سنگھ کے ہنس کر یہ بات کہنے سے مجھ میں اعتماد پیدا ہو گیا۔ شروع میں تو ڈاکٹر صاحب آہستہ آہستہ بولتے رہے، کچھ دیر بعد اُن کی گفتگو میں وہی روانی پیدا ہو گئی، جو اُردو میں تقریر کرتے ہوئے ہوتی ہے۔ میں نے انھیں اب تک اردو میں تقریریں کرتے ہوئے سنا تھا۔ ایسی روانی کے ساتھ انگریزی میں بحث کرتے ہوئے پہلی بار سنا تھا۔ بالکل یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بہت تجربہ کار ممتاز قانون داں بحث کررہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بے شمار دلائل پیش کرکے آدھے گھنٹے کی بحث میں عدالت کو متاثر کرلیا۔ عدالت نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ میونسپل کمشنر صاحب کہتے ہیں کہ بیت الخلاء والی جگہ پر مزار ذوق نہیں تھا، آپ کہتے ہیں کہ تھا۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا مشورہ ہے، ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ میری مؤدبانہ درخواست ہے کہ عدالت آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو حکم دے کہ تحقیق کرکے اس سلسلے میں رپورٹ پیش کرے۔ خود میونسپل کمشنر کی بھی یہی تجویز ہے۔ عدالت کو یہ تجویز پسند آئی۔ جسٹس صغیر احمد نے ڈاکٹر انجم صاحب سے کہا کہ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی مدد کرنے کے لیے آپ ایک کمیٹی تشکیل دے لیجیے۔ ڈاکٹر صاحب نے خواجہ حسن نظامی، شاہد ماہلی، ایم۔ حبیب خاں صاحب، فیروز بخت صاحب اور ڈاکٹر عقیل احمد کے نام اس کمیٹی کے لیے پیش کیے، جسے عدالت نے منظور کرلیا۔ اس سلسلے کی پہلی میٹنگ ۹ر ستمبر ۹۶ء کو میونسپل کارپوریشن کے اڈیشنل کمشنر جگ موہن صاحب کے دفتر میں ہوئی۔ جس میں ڈاکٹر خلیق انجم اور مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ میٹنگ میں کارپوریشن

کے بہت سے انجینئر، اوور سیئر اور دوسرے عہدے دار موجود تھے، میٹنگ شروع ہوئی۔ کارپوریشن کے انجینئروں اور دوسرے عہدے داروں نے لمبی لمبی تقریریں کر کے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جہاں عوامی بیت الخلاء ہے وہاں مزارِ ذوق نہیں تھا۔ ایک گھنٹے بعد جگ موہن سنگھ صاحب نے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈی۔ وی۔ شرما سے اظہارِ خیال کے لیے کہا۔ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ اپنی تحقیق مکمل کیے بغیر میرے لیے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم سے بولنے کے لیے کہا گیا۔ وہ غصّے میں بھرے بیٹھے تھے۔ ایک دم پھٹ پڑے۔ کہنے لگے کہ سپریم کورٹ نے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا سے رپورٹ تیار کرنے کو کہا ہے، آپ نے کس حیثیت میں یہ میٹنگ بلائی ہے۔ آپ کے تمام انجینئروں کو سکھا پڑھا کر بھیجا گیا ہے کہ انھیں کیا کہنا ہے، ورنہ اس میں ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے جو معاملے کی نوعیت سے واقف ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ نے یہ میٹنگ اس لیے بلائی ہے تاکہ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈی۔ وی۔ شرما صاحب کو اردو کمیٹی کے دوسرے اراکین کو غلط اور بے بنیاد حقائق سے متاثر کر سکیں۔ میونسپل کارپوریشن کے منفی رویّے کی وجہ سے اتنی تاخیر ہوئی۔ اگر آپ لوگ مداخلت نہ کرتے تو یادگارِ ذوق کا مسئلہ کبھی کا حل ہو گیا ہوتا۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے سپرنٹنڈنٹ ڈی۔ وی۔ شرما کا رویہ بہت ہمدردانہ تھا۔ انھوں نے مزارِ ذوق کے سلسلے میں مثبت رپورٹ لکھنے میں کمیٹی کی بہت مدد کی۔ وقار حسن صدیقی صاحب جو آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے اڈیشنل ڈائرکٹر رہ چکے تھے، وہ ریٹائر ہو کر رام پور جا چکے تھے، جہاں وہ رضا لائبریری رام پور میں او۔ ایس۔ ڈی کے عہدے پر فائز تھے۔ انھیں بھی اس کمیٹی میں شامل کر لیا گیا تھا۔ وہ ایم۔ ڈی۔ کھرے ڈائرکٹر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی ہدایت پر ۲۵/ جون ۱۹۸۳ء کو مزارِ ذوق پر ایک رپورٹ لکھ چکے تھے۔ جس میں انھوں نے کہا کہ دہلی میونسپل کارپوریشن نے جس جگہ بیت الخلا بنایا، یہیں مزارِ ذوق تھا۔ چوں کہ صدیقی صاحب نے مزارِ ذوق کے سلسلے میں بہت اچھی تحقیق کی تھی۔ اس لیے اس کمیٹی کی رپورٹ لکھنے میں وہ بہت معاون ثابت ہوئے۔

مقدمے کی اگلی سماعت ۶/ دسمبر ۱۹۹۶ء کو ہوئی۔ بینچ میں جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس سید صغیر احمد شامل تھے۔ عدالت میں کمیٹی کی رپورٹ پیش کی گئی یہ رپورٹ بہت طویل ہے۔ اس لیے یہاں نقل نہیں کی گئی۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو (ہند) کے اردو آرکائیوز میں محفوظ ہے۔ جس کی تمام سفارشات کو عدالت نے منظور کر کے حکم دیا کہ بیت الخلا منہدم

کر دیے جائیں اور اُس پلاٹ پر بنائے جائیں جس کی کمیٹی نے سفارش کی ہے۔ کمیٹی نے رپورٹ میں سفارش کی تھی کہ یادگارِ ذوق کی تعمیر کے لیے ۲۵ میٹر × ۲۱٫۵ (۱۵۳٫۷ اسکوائر میٹر) کی ضرورت ہوگی۔ کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی تھی کہ یادگارِ ذوق کی تعمیر کے لیے بیت الخلا کے پاس کے کچھ مکان ڈھانے پڑیں گے۔ عدالت نے کمیٹی کی یہ تجویز منظور کر لی کہ جن لوگوں کے مکان اور دکانیں گرائی جائیں گی انھیں ڈی۔ڈی۔اے متبادل مکان اور دکانیں دے گی۔ عدالت نے یہ بھی حکم دیا کہ یادگارِ ذوق کی تعمیر کا کام تیز رفتاری کے ساتھ عمل میں آنا چاہیے۔

۱۸ر نومبر ۱۹۹۶ء کو مزارِ ذوق کے مقدمے کی سماعت ہوئی۔ بینچ میں جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس ایس۔ صغیر احمد شامل تھے۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے وکیل نے عدالت کو بتایا کہ یادگارِ ذوق کا نقشہ چار ہفتے میں تیار ہو جائے گا۔ عدالت نے حکم دیا کہ یہ نقشہ انجمن ترقی اردو (ہند) (ڈاکٹر خلیق انجم)، دہلی اربن ایریا کمیشن اور ان تمام لوگوں کے مشوروں سے بنایا جائے جو اس معاملے سے متعلق رہے ہیں۔ (دستاویز ۳۳)

۱۹ر دسمبر ۱۹۹۶ء کو مزارِ ذوق کے سلسلے میں سپریم کورٹ میں مقدمے کی سماعت ہوئی۔ جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس ایس۔ صغیر احمد بینچ میں شامل تھے۔

۱۸ر نومبر ۱۹۹۶ء کو عدالت نے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو ہدایت دی تھی کہ وہ مقدمے کی اگلی سماعت پر یادگارِ ذوق کا نقشہ عدالت میں داخل کرے۔ عدالت نے ڈاکٹر خلیق انجم سے پوچھا کہ کیا نقشہ بناتے ہوئے آپ سے مشورہ لیا گیا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے جواب دیا کہ یہ نقشہ انھوں نے اور کچھ اسکالروں نے ساتھ بیٹھ کر بنوایا ہے۔ (دستاویز ۳۴) ڈاکٹر خلیق انجم نے مزید کہا کہ اس سلسلے میں میری کچھ اور تجاویز تھیں جو میں نے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو تحریری طور پر دے دی ہیں۔ (دستاویز ۳۵)

عدالت نے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو ہدایت دی کہ ہم چاہتے ہیں کہ یہ یادگارِ ذوق کے شایانِ شان ہو۔ عدالت کی کارروائی کی رپورٹ اردو کے بہت سے اخباروں میں شائع ہوئی۔ ”قومی آواز“ دہلی نے لکھا کہ ”آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے یادگارِ ذوق کا نقشہ عدالت میں پیش کر دیا، جونہی کریم میں اسی جگہ بنائی جائے گی۔ جہاں پہلے میونسپل کارپوریشن دہلی نے بیت الخلا تعمیر کر دیا تھا۔ یہ یادگار انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کی سربراہی میں قائم کمیٹی کی نگرانی میں تعمیر ہوگی، جس میں فیروز بخت صاحب،

ایم۔ حبیب خاں صاحب، شاہد ماہلی صاحب اور ڈاکٹر عقیل احمد شامل ہیں۔ جسٹس کلدیپ سنگھ کے استفسار پر ڈاکٹر خلیق انجم نے عدالت کو بتایا کہ وہ اس نقشے سے مطمئن ہیں اور یہ کہ انھوں نے نقشہ ساتھ بیٹھ کر بنوایا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے کچھ تجویزیں بھی محکمے کو دی ہیں۔ (دستاویز ۳۶)

روزنامہ "عوام" نئی دہلی نے سپریم کورٹ کا متعلقہ حکم بہت نمایاں طور پر شائع کیا۔ اخبار نے لکھا کہ "عدالت کے حکم کے مطابق ڈاکٹر خلیق انجم تعمیر کی نگرانی کریں گے اور اُن کے ساتھ ایم۔ حبیب خاں، فیروز بخت احمد، جناب شاہد ماہلی اور ڈاکٹر عقیل احمد بھی رہیں گے۔ (دستاویز ۳۷)

ڈاکٹر خلیق انجم، شاہد ماہلی صاحب، ڈاکٹر عقیل احمد وغیرہ یادگارِ ذوق کی تعمیر کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ جب کامیابی نظر آنے لگی تو ایک دو حضرات نے ڈاکٹر خلیق انجم کے خلاف اخباروں میں خطوط شائع کرائے۔ جس میں الزام لگایا گیا کہ وہ یادگارِ ذوق کی تعمیر کا کام اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ جب کہ سپریم کورٹ کی رودادیں موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر خلیق انجم نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ یادگارِ ذوق کی تعمیر دہلی میونسپل کارپوریشن یا آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کرے۔ اس سلسلے میں جب کسی غلط فہمی کی وجہ سے فیروز بخت صاحب کا بھی خط "قومی آواز" میں شائع ہوا تو سپریم کورٹ کے ممتاز وکیل طاہر صدیقی صاحب کا "قومی آواز" میں مراسلہ شائع ہوا، جو خاصا طویل تھا۔ طاہر صاحب نے مزارِ غالب اور مزارِ ذوق کے سلسلے میں ڈاکٹر خلیق انجم کی خدمات بیان کرتے ہوئے لکھا

"مزارِ غالب پر جھگیاں پڑی ہوئی تھیں۔ الخ "

مزارِ ذوق کے سلسلے میں طاہر صدیقی نے بتایا کہ کس طرح آدھے گھنٹے تک ڈاکٹر خلیق انجم نے سپریم کورٹ میں بحث کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مزارِ ذوق کو منہدم کرکے دہلی میونسپل کارپوریشن نے عوامی بیت الخلا بنادیا ہے۔ طاہر صاحب نے مزید لکھا ہے کہ "اردو داں طبقے کو اس بات کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے دہلی میونسپل کارپوریشن کے جھوٹ کی پول کھولی اور جناب جسٹس کلدیپ سنگھ اور جناب سید صغیر احمد کو اس سچائی سے مطمئن کیا کہ ذوق دہلوی مرحوم کا مزار لیٹرین کی جگہ پر ہے۔" (دستاویز ۳۸)

۲۱؍ ستمبر ۱۹۹۸ء کو سپریم کورٹ میں مزارِ ذوق کے سلسلے میں سماعت ہوئی۔ بینچ میں جناب ایس۔ صغیر احمد اور جسٹس بی۔ این کرپال شامل تھے۔ ۸؍ مئی کو عدالت نے حکم دیا تھا کہ ڈاکٹر خلیق انجم کی چیئرمین شپ میں جو کمیٹی تشکیل کی گئی تھی۔ اس کو ہدایت دی جاتی ہے کہ اگلی پیشی پر تعمیر کے کام کے بارے میں رپورٹ پیش کرے۔ حکم کی تکمیل کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم نے عدالت کو بتایا کہ وہ شاہد ماہلی صاحب اور ڈاکٹر عقیل احمد کے ساتھ یادگارِ ذوق کی تعمیر کا معائنہ کرنے گئے تھے۔ وہاں کام بہت سست رفتار سے ہو رہا ہے۔ صرف ایک مزدور اور راج کام کر رہے ہیں۔ ۱۶؍ نومبر کو شیخ محمد ابراہیم ذوق کی ۱۴۴ویں برسی ہے۔ اس موقع پر انجمن ترقی اردو (ہند)، غالب انسٹی ٹیوٹ، ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، غالب اکیڈمی اور دوسرے ادارے مل کر ذوق کی برسی منائیں گے۔ اس موقع پر ایک سمینار بھی منعقد ہو گا، جس میں شرکت کے لیے تمام ہندوستان سے اسکالرز کو مدعو کیا جا رہا ہے۔ (۱)
ڈاکٹر خلیق انجم کے اس بیان کے بعد عدالت نے کہا کہ مزارِ ذوق کی تعمیر کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر خلیق انجم کے بیان کے مطابق ۱۶؍ نومبر ۱۹۹۸ء کو مزارِ ذوق پر سمینار منعقد ہو گا۔ اس لیے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ ۱۶؍ نومبر تک تعمیر کا کام مکمل کر دے تاکہ مزارِ ذوق پر سمینار منعقد ہو سکے۔ (دستاویز ۳۹)

"قومی آواز" (نئی دہلی) نے سپریم کورٹ کی اس سماعت کی متعلقہ رپورٹ ۲۳؍ ستمبر ۱۹۹۸ء کے شمارے میں شائع کی۔ (دستاویز ۴۰)

غالبؔ اور ذوقؔ کے مزاروں

سے متعلق دستاویزیں

مزارِ غالبؔ سے متعلق دستاویزیں

دستاویز نمبر: (۱)

REPORT OF THE COMMITTEE

A common grievance of all seemed to be against the local police The Nizammuddin police station is just outside on the entrance to this area The complaint was the encroachers, illegal vendors, traders in all kinds of goods including drugs have a field day simply because of the local police Known bad characters seem to roam the place freely There seems to be an urgent need for the local police to work in tandem with the honest and straightforward in the area in the public interest This is necessary because they seem to take no action whatsover in the area under section 431 IPC concerning mischief to public roads This is a cognisable, non-compoundable and bailable offence

Conclusions and Directions

1- The area seems to be squatter and vendor free and the public roads/streets to the Ghalib tomb and the Darghah seem to have been cleared This is the impression we gained during

our well advertised visit However, the local police need to ensure this by performing their Statutory duty under section 431 I P C The MCD may be directed to file the two maps it had promised to the commissioner the maps of pre and post clearance of encroachers on the Public streets/roads in the area.

2 The ASI, The Delhi Archaology Department and the MCD with the assistance of the police whereever necessary may be directed to have the twelve piller monument and the sixty four pillar monuments freed of all encroachers The ASI may be directed to ensure the upkeep and maintenance of these and other monuments for this area For this purpose it may be directed to file plan in this Hon'ble Court

3 The ASI may be directed to file a status report on the Shama Burz and the Adige Khan monuments as also concerning the old structures of red sandstone claimed by Mr Fazl Bin Akhlaq and Kazi Syed Mohd Hussain as belonging to them

4 The MCD may by directed to file a plan of construction and upkeep of pavements in the whole area and to declare the whole area as a non-squatter vending zone

5 The MCD may be directed to file a plan for the rehabilitation of the encroachers to be removed from the roof of the Dargah of Hazrat Nizamuddin Aulia as also the plan for a car park near the Lodi Road end.

6 The MCD may be direct to remove the encroachers on the

roof of the Dargah abovementioned and the Dargah Committee may be requested to cooperate in this regard

7 The DDA may be directed to file a map and list of the allottees on its land in the area with the area allotted to each and to clear all other encroachments

8 The MCD may be directed to clear the meat shops from the way to the entrance to the Dargha of the Saint Nizammuddin Aulia and relocate these shops in cooperation with the DDA in that area.

9 The DDA may be directed to immediately have its parks in the area cleared of encroachements and restore them to their intended greenness with a plan for tree plantation in the area

10 The MCD Horticutural Department may be directed to file a plan for greening the area

11 The MCD Zonal Health Officer and Sanitary Officer may be directed to file a plan for garbage removal and DDT sprinkling, fumigation etc in the area since the area has a heavy inflow of pilgrims and others

12 The local police be directed to rid the area of bad characters and Unauthorised traders of illegal goods in that area (12-10-96)

دستاویز نمبر: (۳)

Pursuant to this Court's Order dated September 20, 1996, Mr Ranjit Kumar Mr F S Nariman and Mr V B Saharya have visited the area once again and submitted their Report We place on record our appreciation for assisting this Court The Report Indicates that the road/streets leading to Ghalib's tomb and Dargah have been cleared from squatters and vendors It is further states that the encroachers have been removed Mr Jag Mohan Additional Commissioner, MCD has filed an affidavit alongh with the affidavit a plan has been attached indicating that the encroachers have been removed from the area The Report further indicates that there are some encroachers in the "64 Pillar Monuments Dr Khaliq Anjum is present in Court We request Dr Khaliq Anjum to visit this monument along with Mr Kawaja Hassan Sani Nizami and report to this Court indicating the encroachers and also the condition of the monument and the manner in which it needs repairs and improvements

This may be done before November 17, 1996

To come up on November 18, 1996 at 2 p m

(TK Viswanadhan)

(6-11-96) Court Master

دستاویز نمبر:(۳)

REPORT OF THE COMMITTEE

FORMED BY SUPREME COURT

GHALIB'S TOMB

1- It was found that the eastern and northern roads leading to Ghalib's Tomb and Chaunsath Khamba have almost been cleared from the encroachers and squatters it was, however, found that two vegetable vendors were still squatting adjacent to the eastern side of the Ghalib Academy (the main gate of Chaunsath Khamba)

2- Auto Rickshaws (Three-wheelars are being parked on both the sides of the eastern road and a large number of beggers are sitting on one side of a portion of this road

3- Auto Rickshaw drivers are parking unauthorisedly just in front of Ghalib's Tomb resulting heavy rush and crowed in the main street Photograph attached

4- Due to the water stagnation on the main roads the condition has become more pathetic and it becomes almost impossible to reach upto the monument

CHAUNSATH-KHAMBA

5- Chaunsath Khamba was found fairly cleaned and free from

encroachment internally However, some petty repairs need to be undertaken for stability of the structure

6- The iron entrance towards Basti Hazrat Nizamuddin was found broken Anti social elements enter the monument in the night through this broken gate

7- Earlier there were debris deposit in the lawn located on eastern and southern side of the monument inside the enclosur, which was found clean and removed

8- The pillars and graves of marble have become blackish due to the pollution and age

9- There is water seepage in the roof at quite a few points

RECOMMENDATIONS OF THE COMMITTEE

1- All the three roads leading to Dargah needs urgent repairs and uplift

2- The watch and ward staff needs to be increased so that vendors are prevented squatting in front of the monument

3- The local police may be directed by the Hon'ble Court to assist the authorities in getting the squatters removed and to prevent re-encroachment and auto rickshaw parking on the roads

4- While approaching to the Dargah from Lodi Road, there is located one big plot on right side A portion of this land may

be provided for scooter/car parking

5- The iron gate on western side needs urgent repairs

6- The lawns inside enclosures need, uplift and plantation

7- The marble pillars and graves needs chemical preservation

8- The roof needs repairs and water tightening

9- Longback the literary function/mushiaras were organised in the premises of Ghalib's Tomb and lawns of Chaunsath Khamba. At a later stage a bifurcating wall provided to prevent the unwanted entry from Chaunsath Khamba side to Ghalib's Tomb The same may be removed so that the space is made available for such literary functions (Map provided by Land and Development in 1941 is attached)

10- After the revolt of 1857 British Gevernment annexed most of the muslim graveyards and mosques as a punishment to muslims for taking part in the revolt against Government

Later on under the Agreement muslims were allowed to use some of the graveyards and mosques on the condition that the ownership of these would rest with the Government (Sarkar-e-Daulat Madar)

Though it is now half of the century since the country is independent, the said punishment still continues Meanwhile quite a considerable part of graveyard and land which should have been under the control of Wakf Board is being sold by DDA on very high prices

The members of the above Committee pray your Lordship that the orders of the said punishment may kindly be revoked and control of all the graves and mosques in Delhi be transferred to Delhi Wakf Board

11-(i) According to Delhi Gazette Part IV, Page Nos 384-385 dated 16 4 1970, Ghalib's Tomb was maintained by Ghalib Memorial Society (attested copy of the Delhi Gazette is attached)

(ii) The members of the above Committee feel that the Management of the entire complex (Chaunsath Khamba and Ghalib's Tomb) may be placed under the control of a Managing Committee the composition of this Committee may be as follows

(a) Two members of Loharu Family (as Ghalib was laid buried in the graveyard owned by Loharu Family).

(b) Two representatives of each of the following organisations

- Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
- Ghalib Institute, New Delhi
- Ghalib Academy, New Delhi
- Delhi Wakf Board

(iii) One representative from each of the following organisations

- Archeological Survey of India
- Delhi Administration (Delhi Administration will

have to nominate one eminent Urdu knowing citizen of Delhi

(iv) Begum Hamida Sultan, one of the discendant of Ghalib

(v) Shri Feroz Bakht

Sd/-

(15-11-96)

Khaliq Anjum

دستاویز نمبر (۴)

COURT'S ORDER

Pursuant to this Court's Order dated November 6, 1996, Dr Khaliq Anjum, Vice Chancellor, who visited the area along with khwaja Hassan Sani Nizami, Shri M Habib Khan and Shri Feroz Bakht has filed the report regarding Chaunseth Khamba and Ghalib's Tomb Certain recommendations have been made by the Committee Similarly a separate report has been placed on record by Khwaja Hasan Sani Nizami Copies of both these reports may be given to MCD and DDA The DDA and MCD shall have the area cleared from the squatters No stand for scooter rickshas or taxis be permitted in this area except at regular parking place to be constructed by DDA This shall be done within one week from today Matter to come up on 26 11 96

(Ganga Thakur)
P S to Registrar
(18-11-96)

(S K Dudani)
Court Master

دستاویز نمبر: (۵)

AFFIDAVIT BY

DR. KHALIQ ANJUM AS DIRECTED BY

THE HON'BLE SUPREME COURT ON 8-5-1997

I, Dr Khaliq Anjum, Vice Chancellor, Jamia Urdu, Aligarh, and General Secretary of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, Rouse Avenue, New Delhi-110002, do hereby, solemnly affirm and declare as under

1- That it was brought to the kind notice of the Hon'ble Court that there was heavy enchroachment and squatting around Chaunsath Khamba and Ghalib's Tomb Hon'ble Court constituted a committee headed by Dr Khaliq Anjum, Vice Chancellor, Jamia Urdu, to visit the site and prepare a report regarding the enchroachment

2 That I, (Dr Khaliq Anjum) along with the members of the committeed visited the site and submitted its report to the Hon'ble Court on 18-11-96 A Paragraph of the said report is as follows

(i) It was found that the eastern and northern roads leading to Ghalib's Tomb and Chaunsath Khamba have almost been cleared from the enchroachers and squatters It was, however, found that two vegetable vendors were still squatting adjacent to the eastern side of the Ghalib Academy (the main gate of Chaunsath Khamba)

(ii) Auto-rickshaws (Three Wheelers) are being parked on both the sides of the eastern road and a large number of beggars are sitting on one side of a portion of this road

(iii) Auto-rikshaw drivers are parking unauthorisedly just in front of Ghalib's Tomb resulting in heavy rush and crowd in the main street Photograph attached

(iv) Due to the water stagnation on the main roads the condition has become more pathetic and it become almost impossible to reach the monument

REPORT

I, Dr Khaliq Anjum, visited Ghalib's Tomb along with three scholars of high repute, Mr M Hibib Khan, Asstt Secretary, Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Mr Feroz Bakht and Mr Shahid Mahuli three times and found that the possition is worse than before and needs immediate directions of the Hon'ble Court,

The Findings of the Committee are as follows

(1) It was found that the eastern and northern roads leading to Ghalib's Tomb are again enchroached, vendors are squatting on both the sides of the road and on the space adjacent to the Tomb

(2) All the three roads mentioned above need immediate repairs and uplift

(3) MCD or ASI may kindly be ordered to appoint watch and

ward staff

(4) S H O of Hzt Nizamuddin police station be ordered to take action under the provisions of the D P Act and see that squatting does not take place on the roads mentioned above

(5) Auto-rickshaw and taxi stand may kindly be shifted to a portion of a big plot lying unusesd nearby This plot is situated on the right side of the western road leading to Dargah

(6) Unless the local police and municipal authorities, perform their public and statutory duties regularly the enchroachers and squatters will continue to warsen the situation on Mirza Ghalib's Road

Deponent

(25-7-97) (Dr Khaliq Anjum)

دستاویز نمبر (۲)

ORDER OF THE COURT

We also persued the report submitted by Dr Khaliq Anjum on July 25, 1997 The Commissioner of the MCD and the Station House Officer of Hazrat Nizamuddin are directed to ensure that the vendors who have encroached upon the eastern and northern roads leading to the Ghalib's Tomb and are squatting on both sides of the road and on the space adjacent to the tomb are removed within two weeks and report compliance there of

on or before August 19, 1997 After removing the encroachers, they would also ensure that there is no further encroachment List the matter on 22 8 1997

(Y P Dhamija)
Court Master
(1-8-97)

(Meena Trikha)
Court Master

مزارِ ذوقؔ سے متعلق دستاویزیں

دستاویز نمبر .(۱)

مکرمی۔ استاد ابراہیم ذوق کے مزار کے بارے میں راقم کا جو مراسلہ قومی آواز میں شائع ہ اس پر جناب حکیم عبدالحمید صاحب (ہمدرد دواخانہ) نے ایک معلوماتی نوٹ تحریر فرما میرے پاس بھیجا۔ اس میں حکیم صاحب نے بتایا کہ جب حکیم صاحب کے بھائی حکیم عبدالوحید صاحب کا انتقال (۱۹۳۴ء) میں ہوا اور انھیں قبرستان خواجہ باقی باللہ میں سپر رحمت کیا گیا تو اس کے بعد اس قبرستان میں ایک احاطہ ہمدرد احاطہ کے نام سے قائم ہوا۔ اس احاطہ کی تعمیر کے موقع پر حکیم صاحب نے حکیم امجد علی خاں کے ذریعہ استاد ذوق کے مزا کے بارے میں معلوم کیا کہ اس کا کیا حال ہے۔ معلوم ہوا کہ استاد کے مزار کی اور ان کے لواحقین کے مزارات کی حالت بہت خستہ ہے۔ حکیم صاحب نے یہ کام بھی انجام دیا اور استا کے خاندان کی دس قبریں درست کرائیں اور انھیں احاطہ میں شامل کر دیا اور استاد کی قبر نمایاں کر کے۔ اس پر کتبہ لگوایا اور احاطہ کی مرمت کرا کر اس پر بھی دائیں طرف کتبہ لگوا اور اس طرح یہ احاطہ پختہ اور محفوظ ہو گیا۔

پھر ۱۹۴۷ء کے بعد اس احاطہ کا جو حشر ہوا اس کی تفصیل میں نے اپنے مراسلے میں ظاہر کر دی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ خان بہادر رشید الدین صاحب نے ۱۹۱۹ء میں اس احاطہ کی خستگی اور ان کے شاگردوں کی بے توجہی کی جو شکایت کی تھی وہ ۱۹۳۴ء تک قائم رہی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ایک پختہ احاطہ اور پختہ مزارات کو برباد کر دیا گیا۔

اخلاق حسین قاسمی
لال کنواں، دہلی۔۶"
(روزنامہ "قومی آواز" نئی دہلی، ۱۸؍ دسمبر ۱۹۹۵ء)

دستاویز نمبر:(۲)

ناظر صاحب!

مورخہ ۱۳؍دسمبر ۱۹۸۰ء کو سلسلہ معاینہ نبی کریم قبرستان احاطہ مزار استاد ذوق کو دیکھا۔ احاطہ بہت خراب حالت میں پڑا ہے۔ مزار اور احاطہ کو کافی نقصان پہنچایا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شرنارتھیوں نے اس احاطہ کو مستقل نجاست خانہ بنا رکھا ہے۔

بوقت معاینہ مولانا حفظ الرحمان صاحب نے فرمایا کہ احاطہ کی مرمت کرادی جائے اور دروازہ چڑھوا دیا جائے۔ اور صفائی کرادی جائے۔

قبرستان کی جو حالت بنی وہ تو جناب نے خود ملاحظہ فرمالی۔ ایسی صورت میں اس احاطہ پر دروازہ محفوظ رہنا بہت مشکل ہے۔ میرے خیال میں حفاظت کے لیے تیغہ لگوا کر بند کرادینا زیادہ مناسب ہوگا۔

رپورٹ برائے ملاحظہ پیش ہے۔ اخلاق

۱۶۔۱۲۔۸۰

معاملہ پراپرٹی کمیٹی میں تخمینہ کے ساتھ پیش کیا گیا۔

دستاویز نمبر:(۳)

تخمینہ مرمت و تیغہ و صفائی مزار استاد ذوق صاحب مرحوم واقعہ قدیم شریف

نمبر شمار	تفصیل کام	پیمائش	ریٹ آنہ روپیہ	رقم جمع	
1-	ایک تیغہ لگایا جاویگا 6x6x1/2 چار مزدور، ایک راج، ایک سقہ۔	540 sq		13 00 4 00 ----------	
				17 00 ----------	میزان کل

مزارِ حضرت ذوقؔ کی مرمت کا تخمینہ برائے ارسال ہے۔

دستاویز نمبر: (۴)

مزار حضرت ذوق کی مرمت و تیغہ کا کام کرادیا گیا۔ مبلغ =/12 روپیہ خرچ آئے۔

دستخط

28/03/51

دستاویز نمبر: (۵)

گذارش ہے کہ قبرستان نبی کریم احاطہ استاد ذوق مرحوم کی قبر کا کتبہ شر نار تھیوں نے اٹھالیا ہے اطلاعاً عرض ہے۔

عبدالحمید

۱۰/۷/۱۹۵۲ء

پولس کو لکھ دیا جائے۔ دستخط (محمد جعفری)

دستاویز نمبر (۶)

Mohammed Jafri
Offg: Nazir-e-Aukaf,
Delhi.

U-XV-61/501-502 23rd July,52

Dear Sir,

It has been reported by the Inspecting Staff of this office that the "Katba" (the stone plate on which the name was engraved) erected on the tomb of Sheikh Mohammed Ibrahim 'Zauq'

situated in the compound of graveyard Nabi Karim, Paharganj, Delhi has been removed platform of the grave was demaged which is a congnizable offence under the I P C I shall feel much obliged if you kindly institute some enquiries into the case and would take some measures so that the mausoleum be saved from further damage and destruction

The favour of an immediate action is requested

Faithfully

Sd/-

Offg Nazir

Copy to

The Inspector Incharge,
Police Station Paharganj,
Delhi

For information and necessary action

دستاویز نمبر:(۷)

"I have visited the spot alongwith Safdar Ali S/o Yakub the keeper of the graveyard The grave of Zauq is quite intact No recent injury could be noticed There is however, no stone plate on the hind wall of the grave It appears to be a damage of disturbed days of 1947

Submitted (Photograph copy enclosed)"

Sd/- Illegible

(D S P , Sadar)

The office of issue may please be imformed accordingly

Jagan Nath, (S P City)

(It is curious enough that no date has been given by the Inspector, D C P Sadar or S P (City) below their initials Although it is apparent that the action was taken on the letter of Shri Mohammed Jafri No W-XV-61/501-502 dated 23rd July, 1952, which is quite evident)

دستاویز نمبر (۸)

جناب!

گذارش ہے کہ قبرستان احاطہ استاد ذوق قبرستان نبی کریم کے قریب ۲۰۰ گز آراضی سردار علی گورکن نے ایک شرنارتھی کے ہاتھ چھ روپے گز کے حساب سے فروخت کردی اور وہ پاکستان چلا گیا رپورٹ برائے اطلاع پیش ہے۔

02-11-55

۱۔ یہ قبرستان ہمارے قبضے میں ہے یا نہیں۔

۲۔ جس نے معاملہ کرایا ہے اس کا پتا معلوم کیا جائے تاکہ تنسیخ بیعانہ کی کاروائی ہو سکے۔

محمد جعفری

دستاویز نمبر:(۹)

Col B H Zaidi,

President

5th March, 1981

Respected Indira Ji,

This is regarding the mausoleum of Zauq Dehlvi, which was situated in Nabi Karim, now known as Chinnot Basti, Delhi

Zauq Dehlvi was one of the greatest Urdu Poets of the 19th century He was not only a poet laureate at the court of the last Moughal Emperor, Bahadur Shah Zafar, but the king himself and many other Princes were emongst his disciples These facts give the mausoleum of Zauq a national importance I am sorry to say that his mausoleum was demolished in 1947 and the Delhi Municipal Corporation has built public latrines at that place Different Urdu organisations of Delhi have been urging the Municipal Corporation for the last two decades that these latrines be demolished so that the mausoleum of Zauq could be re-built but all our efforts have been in vain and there fore, I am constrained to approach you, Extensive land surrounding the mausoleum is occupaied by the unauthorise people We do not claim the whole land but at least the land measuring about 1000 metres around the grave could be cleared This piece of land has been occupied by unauthories persons only within the last two year

In this regard we request you kindly to instruct Delhi Municipal Corporation and Delhi Administration to Shift the Public Latrines to some other place and this place be handed over to us so that we could construct the grave and mausoleum of Zauq Dehilvi befitting his memory

I am anclosing a site plan of the mausoleum

With warm regards,

Yours sincerely,

Sd/-

(Col B H Zaidi)

Smt Indira Gandhi,
Prime Minister of India,
Prime Minister's Office,
North Block,
New Delhi

Encl

Copy to

1- Lt Governer, Delhi
2- Municipal Commissioner of Delhi, Town Hall Delhi
3- Chief Secretary, Delhi Administrations
   5, Shamnath Marg, Delhi-110007

R K Dhawan
Specıal Assıstant to
the Pnme Mınıster

March 19, 1981

Dear Shn Jagmohan,

I enclose a letter dated 5th March, 1981 from Col B H Zaıdı, Presıdent Zauq Dehlvı Research Instıtute, New Delhı It has been stated that the mausoleum of Urdu poet Zauq Dehlvı was demolıshed ın 1947 and the Munıcıpal Corporatıon of Delhı has buılt publıc latrınes at that place It has been requested that the publıc latrınes may be shıfted to some other place and that place may be handed over to them so that the Instıtute could construct the grave and mausoleum of Zauq Dehlvı

I shall be greateful ıf you kındly look ınto thıs and let us know the actıon taken for Prıme Mınıster's Informatıon

Yours sıncerely,
Sd/-
(R K Dhawan)

Shn Jagmohan,
Lt Governor of Delhı,
Delhı

Copy to col B H Zaıdı, Presıdent, Zauq Dehlvı Research Instıtute, 1266, Kalan Mahal, New Delhı

Sd/- (R K Dhawan)

دستاویز نمبر (۱۱)

Certificate of Registration of

Society Act XXI of 1860

No S/ 11769 of 1981

I hereby certify that Zauq Dehlvi Research Institute has this day been registered under the Societies Registration Act XXI of 1860

Given under my hand at Delhi this 27th day of May, one thousand Nine Hundred and Eighty one

Registration Fee of Rs 50/- Paid

Sd/-

Registrar of Societies

Delhi Administration Delhi

دستاویز نمبر (۱۲)

3-4-1981

Dr Khaliq Anjum,

Director

Dear Shri Khurana,

Col B H Zaidi, President, Zauq Dehlvi Research Institute, wrote a letter to the Prime Minister regarding the Mausoleum

of Zauq Dehlvi On the instructions of the Prime Minister, Shri R K Dhawan, wrote a letter to Shri Jagmohan, the then Lt Governor A copy of this letter was sent to Col Zaidi

I am sending a copy of letter of Col B H Zaidi addressed to the Prime Minister and copy of the letter sent by Mr R K Dhawan to Shri Jagmohan for your ready reference

I will be thankful, if you could kindly spare some time to meet Col B H Zaidi and myself So that we could explain the whole situation to you

With Warm regards,

Yours sincerely,

Sd/-

(Khaliq Anjum)

Shri S L Khurana,

Lt Governor, Delhi,

Rajnivas,

Ranjivas Marg,

Delhi-110007

دستاویز نمبر: (۱۳)

15th July, 1981

Col B H Zaidi
President

Dear Shri Khurana,

You very kindly gave an appointment on 16th of last month, but I am sorry that I could not see you because I was out of country that time Dr Khaliq Anjum, Director of the Institute, however, met you and apprised you of the whole situation of the mausoleum of Zauq Dr Anjum told me that you have asked the Municipal Corporation of Delhi to tell you the exect position of the Mausoleum within 15 days You might have received the reply by now I would be very much thankful if you could kindly let me know the progress in this regard

with regards,

Yours sincerely

(Col B H Zaidi)

Shri S L Khurana,
Lt Governor, Delhi,
Rajnivas,
Rajnivas Marg,
Delhi-110007

دستاویز نمبر: (۱۴)

August 18, 1981

Dear Col Zaidi,

Kindly refer to your letter dated 15th July, 1981 regarding mausoleum of Zauq.

2 I have been informed by the officers of the Municipal Corporation of Delhi that the mausoleum of poet Zauq is located on Khasra No 52 of Qadam Sharief Estate this Estate has been declared as a private property, belonging to one Smt Akbari Devi, by the High Court It would, therefore, be difficult for the Administration to take up renovation/ construction work of the mausoleum I have, however, asked the Commissioner, MCD, to get the community latrine blocks shifted elsewhers by persuading the residents of the area An earlier attempt made in this regard was resisted by the residents of the area

Yours sincerely,
Sd/-
(S L Khurana)

Col B H Zaidi,
President,
Zauq Dehlvi Research Institute,
1266, Kalan Mahal,
New Delhi-110002

دستاویز نمبر: (۱۵)

22nd January, 1982

Dear Shri Baidwan Sahab,

This has reference to the discussions we had in the meeting of Urdu Academy with Lt. Governot regarding the mausoleum of Zauq Dehlvi. The mausoleum of Zauq was located exactly on the place where the Municipal Corporation of Delhi built public latrines. Officers of MCD informed Lt. Governor that the mausoleum was on a place which has been declared by the High Court as private property of Smt. Akbari Devi. This statement is absolutely wrong and is based on delay tactics. I am enclosing the site plan of the mausoleum giving the exact location. The Institute requests that latrines should be demolished and this space be handed over to the Institute so that a mausoleum befitting to the memory of Zauq be built.
With regards,

Yours sincerely,

(Khaliq Anjum)

Shri K.S. Baidwan,
Secretary to Lt. Governor of Delhi,
Old Secretariet,
Rajnivas, Delhi-110054
Encl. as above

دستاویز نمبر.(۱۶)

23rd April, 1983

Dear Sri Jagmohan,

This is regarding the Mausoleum of Zauq Dehlvi, which was situated in Nabi Karim, now known as Chinnot Basti, New Delhi

Zauq Dehlvi was on of the greatest Urdu poets of the 19th century He was not only a poet laureate at the court of the Moughal Emperor, Bahadurshah Zafar, But the King himself and many other Princes were amongst his disciples These facts give the mausoleum of Zauq, a national importance I am sorry to say that mausoleum of Zauq was demolished in 1947 and the Delhi Municipal Corporation has built public latrines at that place Different Urdu organisations of Delhi have been urging the Municipal Corporation for the last two decades that these latrines be demolished so that the mausoleum of Zauq could be re-built but all our efforts have been in vain Extensive land surrounding the mausoleum is accupied by the unauthorised people we do not claim the whole land but at least the land where the public latrines have been built

With best regards,

Yours sincerely,

(Khaliq Anjum)
Director

Shri Jagmohan,
Lt Governor of Delhi,
Rajnivas,
Rajnivas Marg,
New Delhi-110007

دستاویز نمبر: (۱۷)

6th June, 1983

Dear Asrar Sahab,

Please find enclosed the copies of the letters written to different people with regard to Zauq's Tomb

As I have already stated that Shri Sajjan Kumar, Patron of our Society has expressed his desire to attend the meeting Shri Prem Sarvaria, Vice-President of our Society also want to attend the meeting with Lt Governor

Thanking you,

Yours sincerely,

(Khaliq Anjum)

Shri Asrar Ahmed,
Governor's Office,
Rajnivas
Rajnivas Marg,
Delhi-110007

دستاویز نمبر: (۱۸)

The Statesman, 23rd May, 1983

Zauq's Grave

The grave of Sheikh Ibrahim Zauq, information on which was sought by a reader in these columns, is situated below a public latrine in the congested Nabi Karim area of Paharganj says a colleague who located the place near a butcher's shop after a week-long search According to Dr Khaliq Anjum, President of the Zuaq Research Institute, and Chief of the Urdu Chair of the Anjuman Taraqi Urdu (Hind) the grave was demolished and the latrine built after 1947 in what was then a sprawling cemetery Attention to this was drawn by Mr Imdad Sabri Deputy Mayor of Delhi, during Janata rule Later Dr Anjum got Colonel B H Zaidi to take up the issue with the Prime Minister and the former Lieutenant-Governor, Mr Khurana, who promised to get the matter sorted out in a month's time but later wrote back to say that part of the area claimed for Zauq's Mazar was private property, and it was difficult to find another site for the public latrine for the residents of the area

The matter has lately been taken up with Mr Khurana's successor, Mr Jagmohan, but the Zauq institute claims that nothing has been done so far by the Delhi Administration and the Municipal Corporation to get at least the Public latrine (Which is not private property) demolished to restore the grave of Zauq, who taught poetry to the last Moghul Emperor, Bahadurshah Zafar himself It was Zauq who said "Kon Jaye

Zauq Dıllı Kı Galyıan Chhor Kar" (Who, oh, Zauq, would eave the lanes of Delhı) It ıs parhaps poıgnant that hıs emaıns are so deeply burıed ın the narrow, wındıng, stınkıng anes that none dare even restore the semblance of a grave to hem

What a shame, says Dr Anjum, that the prınce of poets, Zauq, should lıe for ages to come under a publıc convenıence, thus fulfillıng the prophetıc words of hıs contemporaty "Mere Mazar Par dıya Koı Jalaı Kyun" Indeed there ıs none to Lıght a dıya or lamp at the grave of a poet who was at one tıme ranked even above the great Ghalıb

دستاویز نمبر (۱۹)

ذوقؔ دہلوی کا مزار

مکرمی۔ دہلی کے ایک انگریزی روزنامے میں مورخہ ۲۳/مئی ۱۹۸۳ء کی اطلاع کے مطابق استاد ظفرؔ اور خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی قبر واقع نبی کریم پہاڑ گنج نئی دہلی کو مسمار کر کے وہاں عوامی سہولت کے لیے بیت الخلاء بنادیا گیا ہے۔ پہلے یہ مزار خاصی بڑی جگہ گھیرے ہوئے تھا جس کا تھوڑا سا حصہ اب کسی شخص کی ذاتی جائیداد میں شامل ہے اور بقیہ پر انتظامیہ کی طرف سے بیت الخلاء بنا ہوا۔

ذوق کی قبر کی یہ درگت بننا بڑی شرم کی بات ہے۔ دہلی انتظامیہ کم از کم بیت الخلاء کو منہدم کر کے جو کہ کسی کی ذاتی جائیداد نہیں ہے قبر کی تعمیر نو کے لیے راہ ہموار کر سکتی ہے۔

الیاس احمد
سرائے رحمان رسل گنج، علی گڑھ
قومی آواز، ۲۸ مئی ۱۹۸۳ء

دستاویز نمبر: (۲۰)

مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

ضامن علی خاں

۵؍ اکتوبر ۱۹۵۴ء کا آخری چہار شنبہ ہے جسے بڑے جوش و خروش کے ساتھ مغل دربار میں منایا جاتا ہے۔ آخری مغل تاجدار کا دربار سجا ہوا ہے' امرا و وزراء اور دوسرے درباری بیش قیمت لباس پہنے ہوئے حاضر ہیں۔ تمام شہزادے اور سلاطین اپنی اپنی جگہ مؤدب بیٹھے ہیں۔ پورا دربار خاص طور سے آج کے دن لیے سجایا گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ تقریب شروع ہو اچانک خبر آئی کہ ملک شعراء خاقانی ہند محمد ابراہیم ذوق کا انتقال ہو گیا ہے یہ سن کر درباریوں کے چہرے اتر گئے۔ بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بہادر شاہ ظفر کو اپنے نوجوان شاہزادوں مرزا دارا بخت' مرزا شاہ رخ' اور مرزا فرخندہ شاہ کے انتقال پر اتنا صدمہ نہیں ہوا تھا جتنا اپنے استاد کی وفات سے ہوا۔ دربار برخاست کر دیا گیا اور شہزادے' سلاطین اور امراء و وزراء جنازے میں شرکت کے لیے چلے گئے۔

بہادر شاہ ظفر کم عمری ہی سے شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔ ولی عہد مرزا فخرو اور کئی دوسرے شہزادے بھی ذوق ہی کے شاگرد تھے ذوق اردو کے صف اول کے شاعر اور غالب اور مومن کے ہم عصر تھے۔ غالب کو شہرت اور مقبولیت ذوق کی وفات کے بعد ہی حاصل ہوئی۔ اس زمانے میں ذوق کا نام سب سے پہلے پھر مومن اور آخر میں غالب کا نام آتا تھا۔ اس بات سے مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ذوق صرف بہادر شاہ ظفر کے استاد ہی نہ تھے۔ بلکہ تاریخ ادب اردو کا ایک درخشاں باب بھی تھے۔ اگر ذوق نہ ہوتے تو ہم داغ جیسے عظیم شاعر سے بھی محروم رہتے۔

ذوق کو بھی اپنے شاگرد بہادر شاہ ظفر اور اور دلی سے غیر معمولی محبت تھی۔ انھیں اس دربار سے غالباً صرف چار سو روپے ماہوار ملتا تھا نواب حیدر آباد نے اس سے کئی گنا تنخواہ کی پیش کش کی تو ذوق نے یہ شعر لکھ کر معذرت کر لی۔

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

جس شاعر نے دلّی کی خاطر نواب حیدر آباد کی اتنی بڑی دعوت کو ٹھکرادیا اس کے ساتھ دلّی والوں کا برتاؤ یہ رہا کہ اس کی قبر کا نشان تک مٹادیا۔ بات اگر یہیں تک ہوتی تب بھی صبر کرلیا جاتا۔ ہم نے ذوق کے مقبرے کے ساتھ وہ کیا ہے جس پر آنے والی نسلیں ہماری بے غیرتی اور بے کمیتی کی وجہ سے ہم پر لعنت بھیجیں گی۔ دنیا کی کوئی مہذب قوم تو کیا' انتہائی غیر مہذب قوم بھی اپنے بزرگوں کے ساتھ ایسا شرمناک رویہ اختیار نہیں کرسکتی جو ہم نے کیا ہے۔ ہم نے اپنے قابل صد احترام شاعر شیخ ابراہیم ذوق کا مقبرہ ڈھا کر وہاں پبلک لیٹرن بنادیا ہے۔ یہ مقبرہ درگاہ خواجہ باقی باللہ کے قریب نبی کریم میں تھا۔

بہادر شاہ ظفر نے کبھی کسی کی وفات پر قطعہ تاریخ نہیں کہا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ ان کے جوان لڑکے اللہ کو پیارے ہوئے انھوں نے ان لڑکوں کی وفات پر بھی کوئی شعر نہیں کہا' لیکن اپنے استاد سے بہادر شاہ ظفر کی عقیدت اور ارادت کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ نے فوراً ایک قطعہ کہا۔

شب چار شنبہ بہ ماہ صفر
بہ حکم خداوند جان داد ذوق
ظفر روئے اردو بہ ناخون زغم
خراشیدہ و فرمودہ استاد ذوق

یہ قطعہ ذوق مرحوم کے مزار پر کندہ کیا گیا تھا' دہلی کے بزرگوں اور ذوق پر کام کرنے والوں مثلاً شاہد احمد دہلوی مرحوم' شان الحق حقی (مقیم کراچی) مولانا امداد صابری' ناصر خسرو مرحوم' پرنسپل مرزا محمود بیگ مرحوم' پروفیسر نثار احمد فاروقی' پروفیسر صدیق الحسن قدوائی اور ڈاکٹر اسلم پرویز کا بیان ہے کہ انھوں نے یہ لوح مزار خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ ۱۹۳۲' میں ابوالکلام اکیڈمی کی تشکیل ہوئی۔ اس اکیڈمی کے صدر مرزا محمود بیگ پرنسپل دہلی کالج اور سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم منتخب ہوئے۔ اس کی مجلس عاملہ میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ڈاکٹر سروپ سنگھ' ڈاکٹر اسلم پرویز' ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی اور انور کمال حسینی وغیرہ تھے۔ اکیڈمی نے اپنے پہلے جلسے میں فیصلہ کیا کہ اردو شاعروں اور ادیبوں کے مزار تلاش کرکے ان کی مرمت کرائی جائے۔ اور ان پر لوح مزار لگائی جائے۔ اس اکیڈمی نے مومن خاں مومن اور بہت سے دوسرے شاعروں اور ادیبوں کے مزارات تلاش کرکے ان کی مرمت کرائی۔ اس وقت پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ ذوق مرحوم کا مزار منہدم ہوچکا ہے'

ڈاکٹر خلیق انجم کا بیان ہے کہ مزارِ ذوق تلاش کرنے میں ہمیں بہت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ نئے حالات میں اس جگہ کی نشاندہی کرنا بہت مشکل تھا۔ جہاں ذوق کا مقبرہ بنا ہوا تھا۔ دہلی کے بہت سے بزرگوں سے مدد لی گئی۔ ناصر خسرو، شاہد احمد دہلوی مرحوم، شان الحق حقی، مولانا امداد صابری نے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں یہ پبلک لیٹرن بنائے گئے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا۔ ڈھائی سال پہلے اس کے حسب ذیل عہدے داران تھے۔ جناب ای کے ایل بھگت (سرپرست) کرنل بشیر حسین زیدی (صدر) جناب مالک رام (نائب صدر) اور اعزازی ڈائرکٹر ڈاکٹر خلیق انجم پچھلے دنوں جب جناب ایچ کے ایل بھگت وزیر نشریات و اطلاعات بن گئے تو سجن کمار ایم پی اس کے سرپرست منتخب ہوئے۔ اس انسٹی ٹیوٹ نے مرکزی اور صوبائی حکومت کی سطح پر کوشش شروع کی کہ پبلک لیٹرن گرا کر ذوق کا مقبرہ دوبارہ تعمیر کیا جائے۔ اس سلسلہ میں کرنل بشیر حسین زیدی اور ڈاکٹر خلیق انجم وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی سے ملے اور ان کی خدمت میں ایک میمورنڈم پیش کیا۔ اندرا جی کو یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ دلی والوں نے بہادر شاہ ظفر کے استاد کے مزار کا یہ حشر کیا ہے۔ انھوں نے وعدہ فرمایا کہ کچھ ہی دنوں میں یہ جگہ خالی کرادی جائے گی۔ اس سلسلہ میں اندرا جی نے فوراً دہلی کے لفٹنٹ گورنر جناب جگ موہن کو ہدایت دی کہ پبلک لیٹرن کو گرادیا جائے۔ جگ موہن صاحب نے ابھی اسی معاملہ کی تفتیش ہی شروع کی تھی کہ ان کا تبادلہ کردیا گیا۔ اور معاملہ ٹھپ پڑ گیا۔ ذوق انسٹی ٹیوٹ نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اردو اکیڈمی کی مجلس منتظمہ کے ایک جلسے میں اردو کے نامور محققوں اور بالخصوص ذوق پر کام کرنے والوں نے یہ مسئلہ اٹھایا۔ لیفٹنٹ گورنر کھرانا صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ ایک ہفتے میں جگہ خالی کرادیں گے مگر یہ معاملہ وعدے سے آگے نہ بڑھا اب پھر جگ موہن صاحب گورنر کی حیثیت سے دلی آگئے ہیں اور انھیں دہلی کی تہذیب سے دلچسپی عشق کی حد تک ہے۔ اس لیے ہمیں یقین ہے کہ وہ فوری طور پر کارروائی کریں گے۔

(میں دوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے عہدیداروں کا شکر گزار ہوں جن کی عنایت سے مجھے مزار ذوق کے بارے میں تمام معلومات حاصل ہوئیں اور مختلف دستاویزوں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا)

لکھنو ۱۵ جون ۱۹۸۳ء

دستاویز نمبر:(۲۱)

محفل محفل

ڈاکٹر خلیق انجم صدر ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ وصدر اردو چیر انجمن ترقی اردو ہند کے بیان کے مطابق اردو کے مشہور شاعر شیخ ابراہم ذوقؔ کا مزار جو دہلی کے علاقہ پہاڑ گان میں موقوعہ ایک قبرستان میں تھی۔ یے ۱۹۴۷ء میں منہدم کردی گئی اور وہاں ایک بیت الخلاء تعمیر کیا گیا۔ یہ ایک صاحب نے بڑی مشکل سے اس جگہ کا پتہ چلایا ہے جہاں ذوقؔ کی قبر تھی۔ ان کا بیان ہے کہ بنار گان کے اس حصہ میں جو محلّہ نبی کریم کہلاتا ہے اور جہاں ذوقؔ کی قبر تھی وہاں اب ایک قصاب کی دکاں کے قریب ایک بیت الخلا ہے۔ جنتا دور حکومت میں مسٹر امداد صابری نے جو دہلی کے ڈپٹی میئر تھے اس جانب حکومت کی توجہ مبذول کرائی تھی بعد میں ڈاکٹر خلیق انجم نے اس سلسلہ میں کرنل بی ایچ زیدی سے بھی ربط کیا تھا لیکن کافی مراسلات کے بعد بتایا گیا کہ جس علاقہ کی نشاندہی کی گئی ہے وہ خانگی ملکیت ہے اور اس علاقہ کے رہنے والوں کو منظور نہیں عوامی بیت الخلا کسی اور جگہ منتقل کیا ہے۔

دستاویز نمبر (۲۲)

''جو دل پر قرض ہے . . ''

مکرمی۔ ۱۳ جون ۱۹۸۳ء کے قومی آواز میں ضامن مراد آبادی کا مضمون ''مٹے ناموں کی نشان کیسے کیسے '' پڑھا یہ جان کر بے حد دکھ ہوا کہ دلی میونسپل کارپوریشن نے مزار ذوق پر ٹٹیاں بنادی ہیں۔ کارپوریشن ہی نہیں ہم اردو والے بھی اس شرمناک حرکت میں برابر کے ذمے دار ہیں۔ ٹٹیاں بنانے کے لیے ذوق کا مزار ڈھایا جارہا تھا تو ہم کہاں تھے ہم نے کیوں احتجاج نہیں کیا۔ بہر حال جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب میں ایک پیش کش کرنا چاہتا ہوں۔ پیشے کے اعتبار سے میں عمارتوں کا ٹھیکیدار ہوں شاعر نہیں ہوں لیکن اردو شاعری میری زندگی ہے۔ اردو شاعری نے مجھے سکون اطمینان، خوشی ومسرت کی دولت سے مالامال کیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے خوشی اور غم دونوں میں زندہ رہنے کا سلیقہ سکھایا ہے شاعر کا یہ

قرض میں اس طرح چکانا چاہتا ہوں کہ جب کارپوریشن ٹٹیاں ڈھا دے تو میں اپنے خرچ سے یہ مقبرہ بنوا دوں۔

میں آج ہی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی لیفٹننٹ گورنر جناب جگ موہن صاحب اور ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے صدر ڈاکٹر خلیق انجم کو ذاتی خط لکھ کر یہ پیش کش کر رہا ہوں بھگوان کرے مجھے یہ سعادت حاصل کرنے کا موقع مل جائے۔

مہندر راو برائے

وشنو پارک، نئی دہلی

قومی آواز، ۱۴ جون ۱۹۸۳ء

دستاویز نمبر: (۲۳)

مزار ذوق

مکرمی ! قومی آواز مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس نے ضامن علی صاحب کا مقالہ "مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے" شائع کر کے مزار ذوق کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کرائی۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ دہلی کے لفٹنٹ گورنر جگ موہن صاحب فوری طور پر کارروائی کریں اور پبلک لیٹرن گرا کر مزارِ ذوق کی تعمیر کرائیں۔

ضامن علی خاں کو سہو ہوا ہے۔ ذوق کا انتقال ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۴ء کو نہیں بلکہ ۱۵ نومبر ۱۸۵۴ء کو ہوا تھا اس سال ۱۵ نومبر کو ذوق کے انتقال کو ایک سو تیس سال ہو جائیں گے۔ ہماری تمنا ہے کہ اس وقت تک یہ مزار تیار ہو جائے تاکہ ذوق کی ایک سو تیسویں برسی ان کے شایان شان منائی جا سکے۔

ساغر نظامی صدر غالب میموریل ویلفیر سوسائٹی (رجسٹرڈ)۔

فاروق جمالی آفس انچارج غالب اکیڈمی۔ ابرابر کرتپوری سکریٹری علم و دوانش دہلی۔ ملک آزر صدر "شناخت" ۱۴ انور نگر۔ یوگندر بہل تشنہ صدر ایکتا منچ دہلی بہادر گڑھ روڈ۔

شمیم احمد جنرل سکریٹری۔ اندر پرستھ بزم احباب دہلی بھیم سین ظفر ادیب، صدر انجمن شیدائے اردو۔

نئی دہلی

دستاویز نمبر (۲۴)

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں

مکرمی، قومی آواز میں ''میں مزار ذوق پر ضامن علی خاں صاحب کا مضمون پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔ خوشی اس بات کی کہ قومی آواز حق اور صداقت کی آواز بلند کرتا ہے وہ کسی ایک سیاسی جماعت کی ترجمانی کو اپنا مقصد نہیں بنایا ہوا ہے اور افسوس یہ ہوا کہ ہم نے اپنے عظیم شاعر خاقانی ہند حضرت ذوق دہلوی کے مزار کا کیا حال بنایا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دہلی میونسپل کارپوریشن نے دانستہ طور پر یہ حرکت نہیں کی، انجانے میں ایسا ہوا ہے اب اس کا تدارک یہی ہو سکتا ہے کہ جلد سے جلد پبلک لیٹرین ڈھا کر وہاں ذوق کا مزار بنادیا جائے۔

ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سرپرست سجن کمار صاحب اور اعزازی ڈائرکٹر ڈاکٹر خلیق انجم سے ہماری درخواست ہے کہ دہلی میں مقیم تمام زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کا ایک وفد فوراً مسز اندرا گاندھی کے پاس لے جائیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ اندرا جی اس سلسلہ میں ہماری مدد نہ کریں۔ اگر وفد میں شرکت کے لیے ہماری ضرورت ہے تو ہم چار سو، پانچ سو کی تعداد میں اپنے خرچ پر دہلی آنے کو تیار ہیں۔

منصور چودھری

۱۲۲۔ڈی/موتی باغ۔مراد آباد

قومی آوار۔ نئی دہلی۔۱۸جون ۱۹۸۳ء

دستاویز نمبر:(۲۵)

مزار ذوق

مکرمی۔ قومی آواز میں ضامن علی خاں صاحب کے مقالے سے معلوم ہوا کہ ابھی تک مزار ذوق پر پبلک بیت الخلا بنے ہوئے ہیں خاقانی ہند استاد ابراہیم ذوق دہلوی اردو کے باکمال اور ممتاز شاعر ہونے کی وجہ سے لائق صد احترام ہیں۔ ان کے مزارِ مبارک کی بے حرمتی کرنا گناہ ہے جس کے لیے روز حشر حق تعالیٰ کبھی معاف نہیں کرے گا۔

ضامن صاحب کے مقالے سے یہ بھی علم ہوا کہ وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی اور دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جناب جگ موہن کو ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے مطالبے سے پوری ہمدردی ہے۔ حیرت ہے کہ انسٹی ٹیوٹ کو وزیر اعظم اور لیفٹننٹ گورنر کی حمایت حاصل ہے اور مسٹر سجن کمار ایم پی اور ڈاکٹر خلیق انجم صاحب جیسے بارسوخ، باصلاحیت اور فعال لوگ انسٹی ٹیوٹ کے سرپرست اور ڈائرکٹر ہیں۔ پھر بھی معاملہ وہیں کا وہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی ہماری کوششوں میں کوئی کمی ہے۔ اگر انسٹی ٹیوٹ چندی گڑھ کے اردو دوستوں کی مدد چاہتا ہے تو ہم ہر طرح سے حاضر ہیں۔

خادم اردو

وشواناتھ طاؤس

نگراں انجمن ترقی اردو (چندی گڑھ)

قومی آواز۔ نئی دہلی، ۲۰ جون ۱۹۸۳ء

دستاویز نمبر.(۲۶)

GOVERNMENT OF INDIA

PO-16/83BSP-135

Suprintending Archaeologist
Safdar Jang Tomb,
New Delhi

25th June, 1983

Dear Shri Khare,

Kindly refer to your verbal instructions on yesterday afternoon regarding the situation of the Tomb of Shaikh Ibrahim Zauq

It was very dificult to find a reference from the well known historical works on Delhi City because Asar-us-Sanadid (Urdu) and Sairul Manazil (Parsion) were written when famous Urdu poet Zauq was still alive Later literary works provided his biographical details and quote extensively from his Kulliat (Collection of verses), but there have not given correct location of his Tomb

I have however, found out the facts from Maulvi Bashiruddin's monumental work and entitled Waqiat-i-Darulhukumat-i-Dilli Volum II, Pages 533 and 543 which is as under

"The parrot of India Shaikh Mohammad Ibrahim Zauq's Tomb is situated in graveyard known as Kallu-Ka-Takiya which is a famous graveyard of Delhi near the Qadam Shareef It has a ruin enclosure wall and there is a grave stone on the head side of the grave which contains the following epitaph in Urdu Verse

اللہ اکبر

طوطیِ ہند حضرتِ استاد ذوق نے　　لی گلشنِ جہاں سے جو باغِ جناں کی راہ
سالِ وفات جو کوئی پوچھے تو اے ظفر　　کہہ ذوقِ جنتی زسر بخشش الہ
۱۲۷۱ھ

It is a pity that this poet of India who was the tutor to the last Mughal Emperor Abu-Zafar- Mohammad Sirajuddin Bahadur Shah for teaching of art of poetry His tomb is lying in an uncared for condition and its boundary wall has fallen at many places If such negligence continues it is not long, when it would not be possible to find out the trace of the grave of this poet "

The grave, yard better known as Kallu-Ka-Takiya, was situated in Pahar Ganj which is now wholly covered with modern constructions and it is reported by the old men of Delhi City that the vicinity of the grave of Urdu poet Zauq is partly covered by the lavatory blocks, recently erected by the Municipal Corporation

I am sending you this note as per your instructions but will submit detail report with photographs, if needed, after fully exploring the area

With best regards,

Yours sincerely,
Sd/-
(W H Siddiqui)

To,
Shri M D Khare, M A ,
Director, Monument
Archeological Survey of India,
Janpath, New Delhi-110011

دستاویز نمبر:(۲۷)

Dear Shri Khare,

Kindly refer to your letter No 34/33/83-M dated 1st August, 1983, reqarding a question on the tomb of Shaikh Muhammad Ibrahim Zauq, raised in the Rajya Sahba I am submitting herewith a comprehensive report on the tomb of the famous Urdu poet Shikh Mohammad Ibrahim Zauq, in continuation of my d o letter No P-16/83-BSP-135, dated the 25th June, 1983

It will be seen from the report that all relevant informations have been collected by me and so-called the site of the tomb of Zauq has also been inspected by me with my photographer Shri M M Sriwastava who took the photographs on the spot

With regards,

Yours sincerely,
Sd/-
(W H Siddiqui)

Encl Report and 9 photographs

To
Shri M D Khare, M A
Director (Monuments)
Archeological Survey of India,
Janpath, New Delhi-110011

Inspect, the so-called site of the grave of Shaikh Muhammad Ibrahim Zauq, the famous Urdu poet, who was the ustad (tuter) of the last mughal Emperor Bahadur Shah Zafar (1775-1862 A D) The site is now completely covered by modern construction of shabby houses The locality is now called Chinnord Basti Some of the old residents of this locality informed us that the site where once the grave of Urdu poet Zauq existed is now covered with modern construction of lavatory blocks (Photographs enclosed) for men and women separetaly, erected by Municipal Corporation Delhi- The lavatory blocks are closely covered and overshadowed by modern construction of houses and there is no evidence in the form of any vestige of the past to indentify the site where once the grave of Urdu poet Zauq existed That the entire area was the graveyard is however evidenced by the existence of the graveyard, called Nabi Karim-Ka-Qabristan, which has a thick rubble ruined wall partly still standing not far from the above mentioned site The same is still being used for burying the dead who have traditional rights The graveyard has a Commitee whose sign board is fixed over its entrance That the whole area was once a graveyard and there was not a single residential structure around the grave of Ibrahim Zauq, which existed on a raised platform and had a stone sarcophagus with a head stone is evidenced by the old photographs of the site and grave of Zauq, found in the old records of the Waqf Board, Delhi The original epitaph on the head stone of the

grave of Zauq was noticed and quoted by Maulana Bashiruddin is as under

طوطی ہند حضرتِ استاد ذوق نے   لی گلشن جہاں سے جو باغ جناں کی راہ
سال وفات جو کوئی پوچھے تو اے ظفر   کہہ ذوق جنتی ز سر بخشش الہ

It was extant till 1919 when Bashiruddin noticed and quoted its text But it appears that sometime after this date the original tablet was lost and a new square stone tablet with Persian and Urdu verses with date of death of Zauq was fixed at the head side of the grave whose photograph is preserved in the office of Delhi Waqf Board

There is an inspection note in Urdu of the grave of Shaikh Muhammad Ibrahim Zauq submitted by an employee of the Delhi Muslim Waqf Board whose English translation is as under

> "On 16th December 1950, I inspected the enclosure and grave of Ustad Zauq The enclosure is lying in an uncared for condition The grave and the enclosure has been badly damaged It seems that the refugees are using this enclisure as lavatory During the course of inspection Maulana Hifzur Rehman Sahib asked for immediate clearence of the site and providing a door after repairing the walls The sad condition of the Qabristan has been seen by your goodself (Nazir) Under these circumstances it is very difficult to keep the

door intact In my opinion it would be safe to provide an iron railing of spearheaded variety"

The report is submitted for perusal

Sd/- illegible
16-12-1950

Following are the remarks by the Waqf authorities

"The case should be placed before the committee with estimate for consideration

sd/- illegible
16/12

I/A the Sub-overseer may be asked to prepare the estimate which should be checked and approved by the Engineer and then should be included in the agenda

sd/- illegible
16-12

Noted please

sd/- illegible
17-12-1950

This later tablet was probably extant upto 1950 It appears that between 1950 and 1952 this later stone of the grave was also removed from the site and a letter of complaint was addressed to the S P (City), Delhi with a copy to the Inspector Incharge Police Station Paharganj, Delhi, for information and necessary action (photograph copy enclosed) by Shri Mohammad Jafri

Offg Nazır-e-Aukaf, Delhı

The report over this complaint submitted by the Police Inspector, Paharganj Police Station, Delhi, to D S P Sadar and seen by the S P (City) with the remarks "The Office of issue may please be informed accordingly" sd/- Jagannath, S P (City) is quoted as under

> "I have visited the spot alongwith Safdar Ali S/o Yakub the keeper of the graveyard The grave of Zauq is quite intact No recent injury could be noticed There is however, no stone plate on the hind wall of the grave It appears to be a damage of disturbed days of 1947 Submitted, (Photograph copy enclosed)

It is curious enough that no date has been given by the Inspector, D S P Sadar or S P (City) below their initials, Although it is apparent that the action was taken on the letter of Sh Mohammad Jafri No W-XV-61/501-502 dated 23rd July, 1952, which is quite evident

It is also clear that the grave and most probably the later head stone containing the epitaph of the grave of Ibrahim Zauq were intact when the inspection note by one of the employees of the Waqf Board was drawn on 16th December, 1950, mentioned above

It is interesting to note that the later text of the persian epitaph is also composed by one Zafar and it is difficult to identify him with Bahadur Shah Zafar, the disciple of Zauq

The later epitaph (Qita-e-tarikh) in Urdu is composed by a Urdu poet Sail, dated A H 1357 (1938 A D), (Photo copy enclosed) The Urdu poet Sail was none other then famous Urdu poet of Delhi named Sirajuddin Ahmed Khan, Sail Dihlavi He was born in 1868 and died in 1945 He was the disciple and son-in-law of the illustrious Urdu Poet Dagh Dihlawi[1]

Shaikh Muhammad Ibrahim Zauq was the son of Shaikh Muhammad Ramzan He was born in Delhi in A H 1202 (1787 A D) a tutor to the last Mughal Emperor Bahadur Shah Zafar who honoured him with the title 'Khaqani-i-Hind' He died on Thursday 24th Safar A H 1271 (17th October, 1854 A D) Zauq composed the following notable verse[2] only three hours before his death

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

He was buried in an enclosure situated near the Kallu-Ka-Takiya, Paharganj, Delhi

1- Ijaz Husain, Mukhtasar Tarikh-i-Adab-i-Urdu (Urdu, Delhi 1964) p 232

2- Waqiat-i-Darulhukumat-i-Dihli Volume II (Agra, 1919) p 533-542, Ijaz Husain, Mukhtasar Tarikh-i-Adab-i-Urdu (Urdu, Delhi, 1964), p 128

دستاویز نمبر.(۲۸)

To

The President
Zauq's Institution/Academy
Rouse Avenue,
New Delhi

Sir,

I Shall be gratefull if you could kindly let me know the name of the President of Zauq's Institution and also the details of the Institution along with a small pamphlet, if available, per bearer

Thanking you,

Your faithfully

(M D Khare)
Director (Monuments)

(21-01-86)

دستاویز نمبر (۲۹)

Dear Mr Khare,

This has reference to your letter No 34/64/85 Dt 21 1 86 I am thankful that you are taking interest in Zauq Dehlvi's Tomb We have been trying to aquire the site of Zauq's Tomb for the last 20 years, but all our efforts proved futile as MCD

did not agree to demolish public latrines built on that site A deputation of ZRI met Late Smt Indira Gandhi on 5th March, 1981 and submitted a letter to her (copy enclised), in which Col B H Zaidi, President, Zauq Dehlvi Research Institute requested that the public latrines built on the zauq's Tomb be domolished immediately and the site be handed over to ZRI Smt Indira Gandhi was shocked to learn the plight of the great poet's tomb She immediately called her Secretary, Mr R K Dhawan, handed over our letter to him and asked him to contact Shri Jagmohan the than Lt Governor and see to it that the site was handed over to the Institute as early as possible

After a few days Shri Jagmohan personally rang me up and asked me for the details of the tomb I provided all the details alongwith the site plan to Shri Jagmohan, Shri Jagmohan enquired whether our Institute was registered with the Registrar of Societies I informed him that we had applied for the registration Shri Jagmohan told that site would be handed over to us only when we get the registration certificate from the Registrar of Societies He asked his PA to contact the Registrar of Societies for expediting the process of registration, which he did, and the society was registered on 27th May, 1981 (copy of Registration Certificate enclosed) Before the site could be handed over, Shri Jagmohan was transfered to Goa I contacted Shri S L Khurana and provided all the details of the tomb to him also He looked into the matter, made certain enquiries and wrote us a letter on 14 8 81 (Copy enclosed) The matter lingered on and no decision has

been taken so far I am the Chairman of Education Committee formed by the Delhi Urdu Academy of Delhi Administration and Lt Governor the Ex-Officio Chairman of the Academy In all the meetings of the Academy, I raised the question of Zauq's tomb and requested the Lt Governor to acquire the site of Zauq's tomb and hand it over to the Institute, Nothing came out except promises

As you are aware, Zauq Dehlvi was one of the greatest poets of the nineteenth century He was not only a poet laureate of the court of the last Moughal Emperor, Bahadurshah Zafar, but king himself and many other Princes were amongst his disciples It is shameful for us that the tomb of such a great poet has been turned into public latrines and the latrines are not being demolished on one or the other pretext

I will be extremely thankful if you kindly take an immediate step in this regard

The names of various office-bearers of ZRI are printed on our letter-head

Thanking you,

Yours sincerely,

(Khaliq Anjum)

Director

دستاویز نمبر:(۳۰)

آپ کی ہدایت مورخہ 17-09-86 کے مطابق اور متعلقہ ریکارڈ فائل کا مطالعہ کرنے کے بعد آج مورخہ 18-09-86 مزار استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کا موقعہ معائنہ کرنے نبی کریم پہاڑ گنج گیا۔ موقعہ پر دیکھا کہ قبرستان نبی کریم کے اس حصہ پر جہاں پختہ مکانات تعمیر ہوگئے ہیں اور کثیر آبادی کی رہائش ہے ان لوگوں کے استعمال کے لیے مونسپل کارپوریشن نے مردوں و عورتوں دونوں کے لیے علاحدہ علاحدہ Public Latrines بنا رکھی ہیں آس پڑوس کے کچھ مسلمانوں سے معلومات کرنے پر پتہ چلا کہ یہ Latrines دراصل استاد ذوق مرحوم کے مزار والے حصہ پر تعمیر ہیں۔ موقعہ پر کسی جگہ مزار کے نشانات نہیں ہیں لوگوں نے بتایا کہ یہ سرکاری Latrines ۱۹۷۵ء کے لگ بھگ اس وقت علاقے کے مونسپل کاونسلر جناب اے این کمار (جن سنگھ پارٹی) کی مدد سے تعمیر کرادی گئیں تھیں اس سے پہلے اس جگہ استاد ذوق کے مزار کے علاوہ چار دوسرے مزارات بھی تھے جو پختہ تھے۔ جن کی تصویر فائل کے صفحہ نمبر ۲۳ پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے استاد ذوق کے مزار پر پختہ کتبہ تھا جو فائل کی تصویر نمبر ۲۲ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ اس وقت ان مزاروں کے چاروں طرف چار چار فٹ اونچی دیوار کی چار دیواری تھی اور اس وقت علاقہ کی غیر مسلم خواتین اس دیوار کی آڑ میں پاخانہ کرتی تھیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ کافی عرصہ چلتا رہا اس کے علاوہ اس وقت علاقہ کے لوگ اس حصہ پر اپلے لگاتے تھے۔ نبی کریم قبرستان پر رہ رہے شری عبدالقدیر نے بتایا کہ انھوں نے 1965ء تک باقاعدہ مزار دیکھا ہے انھوں نے بتایا کہ جنتا پارٹی کے دور میں کارپوریشن کے ڈپٹی منسٹر، مولانا امداد صابری نے اس وقت کے لیفٹننٹ گورنر، جناب ایس۔ این۔ کوہلی صاحب کو اس پاخانے کا موقعہ معائنہ کروایا تھا اور انھوں نے ذوق کے مزار پر سے سرکاری Latrines ہٹوانے کے سلسلہ میں مطالبہ کیا تھا اور کارپوریشن کے اعلیٰ افسران معہ میونسپل کمشنر اس وقت معائنہ کے دوران موجود تھے۔

مزار کی Repair کا سوال جب ہی اٹھ سکتا ہے جب اس جگہ پر تعمیر دونوں gents اور ladies کی latrines کو گرایا جائے اور اس تمام حصہ کو صاف کر کے مزارات بحال کیے جائیں۔

مزار کی جگہ پر بنی latrines کا موقعہ پر کوئی میونسپل نمبر نہیں ہے البتہ latrines سے ملحقہ دوسری جائیداد پر موقع پر نمبر C-338 چینوتی بستی، قدم شریف (تکیہ کلو بخشی) نبی کریم لکھا تھا۔ مزار کی جگہ بنی latrines کے لیے نبی کریم بازار سے باقاعدہ passage ہے۔

رپورٹ برائے ملاحظہ وضروری کارروائی پیش ہے۔

(معہ ٹرسٹ فائل W/15/46)

پراپرٹی انسپکٹر وقف بورڈ

سکریٹری وقف بورڈ

دستاویز نمبر (۳۱)

Respected Markandey Singh,

This is regarding the Mausoleum of Zauq Dehlvi which was situated in Nabi Karim, now known as Chinnot Basti, New Delhi Zauq Dehlvi was one of the greatest Urdu poets of the 19th century He was not only a poet laurete at the court of the Mughal Emperor, Bahadur Shah Zafar, but the King himself and many other Princes were amongst his disciples These facts lend the mausoleum of Zauq, a national importance

It is a pity that mausoleum of Zauq was demolished in 1947 and it is shocking that the Delhi Municipal Corporation has built public latrines at this very site Different Urdu organisations of Delhi have been urging the Municipal Corporation for the last two dacades that these latrines be demolished so that the mausoleum of Zauq could be re-built, but all our efforts have been in vain Extensive land,

surrounding the mausoleum is occupied by the unauthorised people We do not claim the whole land but at least the land where the public latrines have been built should be vacated

We, therefore, request you to kindly issue orders for the demolition of latrines The site should be handed over either to Delhi Urdu Acadmy or Zauq Dehlvi Research Institute or Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

With warm regards,

Yours sincerely
Sd/-
(Khaliq Anjum)

Shri Markandey Singh,
Lt Governor of Delhi,
Rajnivas,
Rajnivas Marg,
Delhi

دستاویز نمبر:(۳۲)

مزارِ ذوق کے سلسلے میں

انجمن ترقی اردو (ہند) کے ایک وفد کی لیفٹنٹ گورنر سے ملاقات

۱۱۹پریل ۹۱ء کو جناب سید حامد کی زیرِ قیادت ایک وفد دلی کے لیفٹنٹ گورنر سے ملا تھا۔ وفد نے لیفٹنٹ گورنر کی خدمت میں دہلی میں اردو کے مسائل سے واقف کیا۔ اس سلسلہ میں ایک میمورنڈم بھی پیش کیا تھا جس میں دلی میں اردو تعلیم کے مسائل پیش کیے تھے۔ اور مزار ذوق کے بارے میں بتایا تھا کہ مزار کو منہدم کر کے میونسپل بیت الخلا کی عمارت بنادی گئی

ہے۔وفد نے مطالبہ کیا تھا کہ بیت الخلا کو منہدم کرا کے اس جگہ پر مزارِ ذوقؔ تعمیر کیا جائے۔ وفد میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ڈاکٹر اسلم پرویز اور ڈاکٹر خلیق انجم شامل تھے۔

چوں کہ گورنر کی طرف سے مزارِ ذوقؔ کے سلسلہ میں کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا تھا اس لیے انجمن کا ایک اور وفد ڈاکٹر خلیق انجم کی قیادت میں لیفٹنٹ گورنر سے ملا۔ اس وفد میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ڈاکٹر اسلم پرویز اور ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی شامل تھے۔ وفد نے پھر مطالبہ کیا کہ مزارِ ذوقؔ کی جگہ خالی کرا کے انجمن ترقی اردو (ہند) یا دہلی اردو اکادمی کے حوالہ کر دی جائے۔

گورنر صاحب نے وعدہ کیا وہ اس سلسلہ میں بہت جلد قدم اٹھائیں گے۔ انھوں نے متعلقہ افسروں کو اس سلسلہ میں ہدایت دیں۔

دستاویز نمبر.(۳۳)

مزارِ ذوقؔ پر بیت الخلاء

ایران میں انقلاب کے بعد علامہ آیت اللہ خمینی بر سر اقتدار آئے تو انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کے والد محمد رضا کے شاندار مقبرے کو مسمار کر کے اس پر عوامی بیت الخلاء کی تعمیر کی گئی تاکہ عوام اس کی بے حرمتی کر سکیں۔ یہ ان کا شاہی خاندان سے نفرت کے اظہار کا ایک طریقہ تھا۔ مگر دہلی کی حکومت کو پتہ نہیں کیا ہوا کہ اس نے آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ کے استاد اور ملک الشعراء شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے مزار کو مسمار کر کے اس پر عوامی بیت الخلا کی تعمیر کر دی۔ حالاں کہ ذوقؔ کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ بے بدل شاعر تھے۔ دہلی کے نمائندہ شاعر تھے جنھوں نے داغ جیسے شاگرد پیدا کیے جنھوں نے اردو ادب کو اپنے فکری سرمائے سے مالا مال کیا۔ مگر آزادی کے بعد ہماری عوامی حکومت نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ بہادر شاہ ظفرؔ جلاوطنی کی موت یہ کہتے ہوئے مرے کہ۔

ہے کتنا بد نصیب ظفرؔ دفن کے لیے دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

مگر وہ بد نصیب نہیں خوش نصیب تھے کہ ان کا مزار رنگون میں بنا اور بے کسی کا مزار نہیں کہ۔

پے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

بے وطنی کے باوجود ان کے مزار پر ہزاروں اشخاص جاتے ہیں جاکر فاتحہ پڑھتے ہیں پھول چڑھاتے ہیں مگر ان کے استاد کے ساتھ دہلی والوں نے یہ سلوک کیا کہ اس کی جو آخری حد تک بے حرمتی ہو سکتی تھی وہ کر ڈالی۔

جنتا حکومت کے دوران مولانا امداد صابری جو دہلی کے ڈپٹی میئر بھی تھے انھوں نے مزار ذوق کا معاملہ اٹھایا تھا اور اس پر پاخانے بنانے کے خلاف سخت احتجاج کیا تھا مگر کچھ بھی نہیں ہو سکا۔ حکومت ٹس سے مس نہیں ہو سکی، حکومتیں بدلتی رہیں مگر مزارِ ذوق کے ساتھ ان سلوک نہیں بدلا کیا ہم اتنے بے حس ہوگئے ہیں کہ منبع علم کے مزار کے ساتھ یہ سلوک کریں۔ یہ درست ہے کہ ہماری حکومتیں بہت ادب نواز نہیں ہیں۔ صرف ادیبوں اور فنکاروں کے لیے دکھاوے کی غرض سے کچھ کر دیا کرتی ہیں مگر ہمیں اس حد تک بھی بے حس نہیں ہونا چاہیے کہ ایک جلیل القدر شاعر کے مزار کے ساتھ ایسا توہین آمیز سلوک کریں۔

اب دہلی کے کچھ ادباء و شعراء اور فنکاروں نے مزارِ ذوقؔ کی جانب توجہ کی ہے اور حکومت سے یہ درخواست کی ہے کہ مزارِ ذوقؔ سے سرکاری پاخانے ہٹائے جائیں اور یہاں مزار کی از سر نو تعمیر کی جائے اس سلسلہ میں ذوق انسٹی ٹیوٹ قبل ہی سے کام کر رہا ہے۔ جس کے سرپرست پہلے ایچ کے ایل بھگت ہوا کرتے تھے جو اب مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات ہیں۔ اب اس کے سرپرست سجن کمار ایم پی ہیں اس کے صدر کرنل بشیر حسین زیدی اور نائبین صدر میں مالک رام اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی شامل ہیں، اس کے ڈائرکٹر خلیق انجم جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہیں۔ ڈاکٹر انجم ہندوستان بھر کے اردو کے مسائل کے لیے جدو جہد کرتے رہتے ہیں۔ اور بہت حد تک حل کرتے رہتے ہیں مگر عجیب بات ہے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے مزارِ ذوقؔ پر عوامی بیت الخلا کی تعمیر کر دی گئی اور وہ خاموش ہو کر دیکھتے رہے۔ انھیں تو ادب نوازوں کو ساتھ لے کر دھرنا دینا چاہیے تھا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔

خیر دیر سے ہی سہی اب ان لوگوں نے تحریک شروع کی ہے اور وزیر اعظم نے تحریک شروع کی ہے۔ اور وزیر اعظم و لیفٹننٹ گورنر تک بات پہنچائی ہے ان کا کہنا ہے کہ مسز گاندھی نے خود بھی اس پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ دہلی کے لیفٹننٹ گورنر مسٹر جگ موہن خود بھی ایک

شاعر ہیں انھوں نے کیوں کر گوارا کیا کہ ایک شاعر کے مزار کو یوں مسمار کر کے اس کی بے حرمتی کی گئی۔ اس کاان کو فوراً ازالہ کرنا چاہیے تھا۔

اس سلسلہ میں تحریک چلانے والوں کو صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ کی بھی توجہ مبذول کرانی چاہیے۔ کیوں کہ وہ خود بھی ایک شاعر ہیں یقیناً وہ ایک شاعر کے مزار کے بے کسی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اور فوری طور پر کوئی اقدام کریں گے۔

ذوقؔ کے مزار کی اس بے حرمتی پر تمام ادبی اداروں کو سخت احتجاج کرنا چاہیے۔ وزیراعظم صدر جمہوریہ 'لفٹنٹ گورنر اور چیف اکزی کیوٹیو کونسلر کی توجہ مبذول کرانا چاہیے۔

اصحاب علم کے مزارات دیکھ کر لوگ عبرت بھی حاصل کرتے ہیں اور علم بھی اس لیے ان کے مزارات کی عزت کرنی چاہیے ورنہ آنے والی نسل ہمیں معاف بھی نہیں کرے گی اور ہمارا مذاق اڑائے گی کہ ہم اپنے اسلاف کے ساتھ کیسا سلوک کرتے تھے۔ ہم نے اہل علم کی تو عزت کی ہی نہیں ان کے مزارات تک کی بے حرمتی کا بھی ارتکاب کیا۔

اس غلطی کی اصلاح جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

اخبارات کو بھی اس سلسلہ میں پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ اس پر احتجاجی اداریے لکھنا چاہیے اور مضامین شائع کرے چاہیں۔ خدا کرے کہ ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اربابِ حل و عقد کی مساعی بار آور ہو اور یہ ادارہ آئندہ ذوقؔ پر کچھ تحقیقی کام کو بھی آگے بڑھا سکے۔

دستاویز نمبر:(۳۴)

Supreme Court Order

Archeological Survey of India states that the plan for construction of Zauq monument shall be prepared within 4 weeks from today It shall be done in consultation with the Anjuman Taraqqi-e-Urdu Society and Delhi Urban Area Commission and all the public men who have been associated in this matter

18th November, 1996

دستاویز نمبر:(۳۵)

Supreme Court Order

Pursuant to this Court's order dated November 26, 1996, the Archaeological Survey of India has filed a Plan of the Monument to be constructed at the Tomb of Poet Zauq Mr Khaliq Anjum, Vice Chancellor of the Jamia Urdu University, present in Court states that the Plan was prepared in consultation with him and other scholars We only wish to record that the monument must be befitting to Zauq, the Great poet of the era The Archaeological Survey of India shall file progress report in this case after every 3 months

19th December, 1996

دستاویز نمبر:(۳۶)

12th December, 1996

Mr D B Sharma,

Suprintending Archaeologist,

Archaeologist Survey of India,
New Delhi

Dear Mr Sharma,

The DYS AE and A S AE of your office came to my office with the site plan of Mazar-e-Zauq I fully approve this plan, however, I make following suggestions

1- The black granite should be used for parming the plateform

2- Kota stone could be used for path way flooring

3- The estimated amount of the construction of the Zauq Memorial may be worked out so that it could be placed before the court on 17th of December, 1996

Thanking you,

Yours faithfully
Sd/-
(Khaliq Anjum)
General Secretary

دستاویز نمبر: (۳۷)

یادگارِ ذوق کا نقشہ
پریم کورٹ میں پیش

نئی دہلی۔ ۱۹/ دسمبر (اپنے نمائندے سے) مزار ذوق کی کی تعمیر کا راستہ اب صاف ہوتا جارہا

ہے۔ آج سپریم کورٹ میں جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس صغیر احمد کی عدالت میں مزار ذوق کے معاملے کی سماعت کے دوران آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے یادگارِ ذوق کا نقشہ عدالت میں پیش کر دیا جو نبی کریم میں اسی جگہ بنائی جائے گی جہاں پہلے میونسپل کارپوریشن دہلی نے بیت الخلا تعمیر کر دیا تھا۔ یہ یادگار انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کی سربراہی میں قائم کمیٹی کی نگرانی میں تعمیر ہوگی۔ جس میں فیروز بخت، مسٹر ایم حبیب خاں، مسٹر شاہد ماہلی اور ڈاکٹر عقیل احمد شامل ہیں۔ جسٹس کلدیپ سنگھ کے استفسار پر ڈاکٹر خلیق انجم نے عدالت کو بتایا کہ وہ اس نقشے سے مطمئن ہیں۔ اور یہ کہ انھوں نے نقشہ ساتھ بیٹھ کر بنوایا ہے انھوں نے بتایا کہ کئی تجاویز بھی اس سلسلہ میں محکمہ کو دی گئی تھیں۔ میونسپل کارپوریشن کے نمائندے سے جسٹس کلدیپ سنگھ نے کہا کہ یہ یادگار ایسا ہونی چاہیے جو ذوق جیسے عظیم شاعر کے شایانِ شان ہو۔ میونسپل کارپوریشن کو اس سلسلے میں ۱۰ر جنوری ۱۹۹۷ کو پیش رفت کے بارے میں رپورٹ دینے کے لیے کہا گیا ہے۔ ججوں نے ڈی ڈی اے کو اس یادگار کی تعمیر سے متاثر ہونے والے چھ گھروں کے مالکوں کو معاوضہ ادا کرنے کی بھی ہدایت دی ہے۔

قومی آواز (۲۰ر دسمبر ۱۹۹۶ء)

دستاویز نمبر (۳۸)

Order of Supreme Court

The Committee constituted to over-see the work regarding the construction for the Mazar of Zauq headed by Dr Khaliq Anjum, Vice-Chancellor, Jamia Urdu University shall submit a status report

10th May, 1997

دستاویز نمبر: (۳۹)

غالب اور ذوق کے مزارات

دہلی کے ایک معاصر روزنامے میں مزار ذوق کے بارے میں جناب فیروز بخت کا مراسلہ نظر سے گزرا۔ بہت زمانے سے ڈاکٹر خلیق انجم دہلی میں مرحوم اردو ادیبوں اور شاعروں کے مزارات کے تحفظ کے سلسلے میں عملی طور پر سرگرم ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے ۱۹۶۳ء میں ابوالکلام آزاد اکیڈمی آف لیٹرس کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ جس کے صدر دہلی کے کالج کے پرنسپل مرزا محمود بیگ مرحوم تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم اس کے سکریٹری تھے۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ' ڈاکٹر اسلم پرویز' ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی' پروفیسر زاہد' ایم قریشی' پروفیسر نثار احمد فاروقی' پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور جناب انور کمال حسین وغیرہ اس کے ممبر تھے۔ اس سلسلے میں تمام دستاویزات سپریم کورٹ میں پیش کی جاچکی ہیں۔ اس کمیٹی نے بہت سے شاعروں کے مزارات پر لوحیں نصب کرائی ہیں۔ مزارِ غالب پر جھگیاں پڑی ہوئی تھیں اور وہاں چرس اور گانجا جیسی چیزیں فروخت ہوتی تھیں۔ یہ ڈاکٹر خلیق انجم ہی کا کارنامہ تھا کہ انھوں نے جھگیاں صاف کروائیں۔ ۶۴ کھمبا اور مزارِ غالب کے احاطے کے درمیان جو دیوار تھی اس میں ایک راستہ بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ذاتی خرچ سے پوری دیوار اٹھوائی اور مزار غالب کے احاطے کے دروازے پر تالا لگوایا۔ انھوں نے مزارِ غالب پر قبضہ نہیں کیا' بلکہ چابی غالب اکیڈمی کے حوالے کردی اور وہ چابی اکیڈمی کے پاس ہی رہتی ہے۔ اور انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے مزارِ غالب کی صفائی کرانے والے کارکن کو ماہانہ تنخواہ دی جاتی ہے"

میرا چوں کہ اپنے مقدمات کے سلسلے میں سپریم کورٹ بھی جانا رہتا ہے۔ اس لیے میں نے سپریم کورٹ میں مزار ذوق اور مزار غالب کے مقدمے کی سماعت میں شریک رہ کر ذاتی طور پر کوشش کی ہے کہ جسٹس صاحبان کے سامنے صحیح صورت حال آجائے۔

فیروز بخت صاحب کے مراسلے سے مجھے تعجب ہوا۔ ایک دفعہ خود فیروز بخت صاحب بھی عدالت میں حاضر تھے اور ڈاکٹر خلیق انجم اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود ہر پیشی پر حاضر رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مشہور' ممتاز ایڈووکیٹ جناب ایم سی مہتہ نے سپریم کورٹ میں درخواست دی تھی کہ غالب کے مزار کی حالت بہت خراب ہے اور مزارِ ذوق پر دلی میونسپل کارپوریشن نے بیت الخلاء بنا رکھا ہے۔ جب اس مقدمے کی سماعت ہوئی تو میونسپل

کارپوریشن کے کمشنر نے حلفیہ بیان دیا کہ جہاں بیت الخلا بنے ہوئے ہیں یہ مزارِ ذوق کی جگہ نہیں ہے۔اس وقت راقم نے آنریبل جسٹس صاحبان سے اپنے طور پر گزارش کر کے ایک کمیٹی کی تشکیل کرائی جس میں ڈاکٹر خلیق انجم جناب خواجہ حسن ثانی نظامی اور جناب ایم۔ حبیب خاں کے نام پیش کیے۔ جسے عدالت نے منظور کرلیا۔ اس وقت ڈاکٹر خلیق انجم عدالت میں موجود نہیں تھے۔(طاہر صاحب کو سہو ہوا ہے،اس دن ڈاکٹر خلیق انجم اور میں دونوں عدالت میں موجود تھے اس دن کی عدالت کی کارروائی متن میں بیان کردی گئی ہے۔) آنریبل مسٹر جسٹس کلدیپ سنگھ اور آنریبل مسٹر جسٹس سید صغیر احمد سے درخواست کی کہ وہ ڈاکٹر خلیق انجم کو بلا کر اس کے بارے میں دریافت کریں۔ڈاکٹر صاحب نے عدالت کے حکم پر اگلی تاریخ میں صحیح پوزیشن بیان کی۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عدالت نے کمیٹی کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ اس کام میں دوسرے اردو اسکالروں کو بھی شریک کر سکتی ہے۔ بعد میں ڈاکٹر خلیق انجم نے شاہد ماہلی' جناب فیروز بخت' ڈاکٹر وقار حسن صدیقی' اور جناب سراج پراچہ کو بھی شامل کرلیا۔اس کمیٹی نے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے مسٹر ڈی۔ وی شرما کی مدد سے ایک تفصیلی رپورٹ بنا کر کے ثابت کیا کہ مزارِ ذوق کی وہی جگہ ہے جہاں بیت الخلا بنے ہوئے ہیں۔اس رپورٹ میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ بیت الخلا منہدم کر کے قریب ہی خالی پڑے پلاٹ بنوا دیے جائیں۔عدالت نے یہ تجویز بھی منظور کرلی۔عدالت نے آثار قدیمہ کو یہ بھی حکم دیا کہ یادگار ذوق کا نقشہ بنا کر پیش کرے اور ڈاکٹر خلیق انجم کو ہدایت کی کہ وہ نقشہ دیکھ لیں۔اگر اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہو تو کر دیں۔ آثار قدیمہ نے یہ نقشہ تیار کر کے کچھ ہی دن میں عدالت میں پیش کر دیا۔ جسے عدالت نے منظور کرلیا۔ اور عدالت نے اس کی تعمیر کا کام میونسپل کارپوریشن اور ڈی۔ڈی۔اے کو سونپ دیا ۔چوں کہ مزارِ ذوق کی کمیٹی نے تجویز پیش کی تھی کہ بیت الخلا کے آس پاس سات مکانات خالی کر کے یادگار ذوق میں شامل کر لیے جائیں اور ڈی۔ڈی۔اے ان مکانوں میں رہنے والوں کو متبادل مکان فراہم کرے۔یہ اطمینان بخش بات ہے کہ سپریم کورٹ نے ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے احکامات جاری کیے ہیں۔اور بیت الخلا دوسری جگہ پر بنایا جاچکا ہے اور مزارِ ذوق پر یرانالیسرین ڈھادیا گیا ہے۔ جن لوگوں سے مکان خالی کرانے جارہے تھے ان کے اور ڈی۔ ڈی۔اے کے درمیان کچھ اختلافات تھے۔عدالت نے یہ اختلافات دور کرادیے ہیں اور جن لوگوں کا ان مکانوں پر قبضہ ہے ان کے معاوضے ادائیگی میں کچھ قانونی اور محکماتی اڑچنیں پیدا ہوگئی ہیں۔ان رکاوٹوں کے دور ہونے کے بعد یادگار ذوق کی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا۔

مزارِ ذوقؔ کا کام سرکاری محکموں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس پروجیکٹ سے ڈاکٹر خلیق انجم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اردو داں طبقے کو اس بات کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے ایم۔ سی۔ ڈی کے جھوٹ کی پول کھولی اور جناب جسٹس کلدیپ سنگھ اور جناب جسٹس سید صغیر احمد کو اس سچائی سے مطمئن کیا کہ ذوق دہلوی مرحوم کا مزار لیٹرین کی جگہ ہی پر تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ جناب فیروز بخت کو کسی غلط فہمی کی بنا پر ایسا لکھنا پڑا۔ مناسب ہوگا کہ وہ اب تک کی عدالتی کارروائیوں سے اپنے اعتراضات کی تحقیق کر لیں۔

گزشتہ چند ہفتوں سے چوں کہ جناب جسٹس سید صغیر احمد صاحب علیل چل رہے تھے۔ اس لیے ان کی بنچ نہیں بیٹھ رہی تھی۔ جناب جسٹس کلدیپ سنگھ صاحب نے ریٹائر ہونے سے پہلے یہ حکم دیا تھا کہ اس طرح کے سارے معاملات اس بنچ کے سامنے پیش ہوں گے۔ جس کے ایک رکن جناب جسٹس سید صغیر احمد صاحب بھی ہوں گے۔ توقع ہے کہ ماہ دسمبر سے پہلے ہفتہ سے یہ بنچ دوبارہ کام شروع کر دے گی اور مزارِ ذوق کے پروجیکٹ کی اصل صورتِ حال پبلک کے سامنے آجائے گی اور اس سے یقیناً فیروز بخت صاحب کے گلے شکوے بھی دور ہو جائیں گے۔

آپ کا مخلص

طاہر صدیقی

ایڈوکیٹ، سپریم کورٹ آف انڈیا، نئی دہلی 110001

دستاویز نمبر: (۴۰)

Upon hearing counsel the Court made the following:

ORDER

It is stated by Dr Khaliq Anjum, Chairman of the Committee constitute by this Court, who is present in person, that on 16 11 98 a seminar will be held at the site in memory of Urdu

Poet Mohd Ibrahim Zauq, and therefore, the Archaelogical Survey of India be directed to see that the construction work is completed by the said date The counsel for the Union of India has already placed before us some photographs indicating the construction work made at the site which indicate that the work is progressing quite satisfactorily However, It shall be seen by the Archaelogical Survey of India that the construction are completed by 16 11 98 so that the proposed function may be held at the site

(21st september, 1998)

محمد حسین آزاد

ذوق

('آب حیات' سے ذکر ذوق کی تلخیص)

جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہان میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا۔ اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چناں چہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا وہ باغ برباد ہو گیا۔ نہ ہم صفیر رہے نہ ہم داستان رہے۔ نہ اس بولی کے سمجھنے والے رہے۔ جو خراب آباد اس زبان کے لیے ٹکسال تھا وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے۔ شہر چھاؤنی سے بدتر ہو گیا۔ امرا کے گھرانے تباہ ہو گئے۔ گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہو کر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں جو بات بات میں دل پسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں۔ آج جن لوگوں کو زمانے کی فارغ البالی نے اس قسم کے ایجاد و اختراع کی فرصتیں دی ہیں وہ اور اور اصل کی شاخیں ہیں۔ انھوں نے اور پانی نشو و نما پائی ہے وہ اور ہی ہواؤں میں اڑ رہے ہیں۔ پھر اس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ۔ کیسا مبارک زمانہ ہوگا۔ جب کہ شیخ مرحوم اور میرے والد مغفور ہم عمر ہوں گے۔ تحصیل علمی ان کی عمروں کی طرح حالت طفولیت میں ہو گی۔ صرف و نحو کی کتابیں ہاتھ میں نہیں ہوں گی۔ اور ایک استاد کے دامن شفقت میں تعلیم پاتے ہوں گے۔ ان نیک نیت لوگوں کی

ہر ایک بات استقلال کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی۔ وہ رابطہ ان کا عمروں کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا ۔اور اخیر وقت تک ایسا نبھ گیا کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا۔ ان کے تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے۔ مگر کیا کروں جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے۔ لیکن نہیں اس شعر کے پتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کار کی کل میں کون سے پرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو یہ کام کا نہیں اور کون سی حرکت اس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ اسی واسطے میں لکھوں گا اور سب کچھ لکھوں گا۔ جو بات ان کے سلسلۂ حالات میں مسلسل ہو سکے گی ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔ شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ مگر زمانے کے تجربے اور بزرگوں کی صحبت نے انھیں حالات زمانہ سے ایسا باخبر کیا تھا کہ ان کی زبانی باتیں کتب تاریخ کے قیمتی سرمائے تھے۔ وہ دلی میں کابلی دروازہ کے پاس رہتے تھے۔ اور نواب لطف علی خاں نے انھیں معتبر اور بالیاقت شخص سمجھ کر اپنی حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے۔ شیخ علیہ الرحمہ ان کے اکلوتے بیٹے تھے۔ کہ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت کسے خبر ہوگی کہ اس رمضان سے وہ چاند نکلے گا جو آسمان سخن پر عید کا چاند ہو کر چمکے گا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ ان کے گھر کے پاس رہتے تھے محلے کے اکثر لڑکے انھی کے پاس پڑھتے تھے۔ انھیں بھی وہیں بٹھادیا۔

حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے، شوق تخلص کرتے تھے۔ اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں ویسے شعر کہتے تھے۔ محلے کے شوقین نوجوان دلوں کی امنگ میں ان سے کچھ کچھ کہلوا لے جایا کرتے تھے۔ اکثر صلاح بھی کر لیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت ان کے ہاں یہی چرچہ رہتا تھا۔ شیخ مرحوم خود فرماتے تھے کہ وہاں سنتے سنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے۔ نظم کے پڑھنے اور سننے میں دل کو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی تھی۔ اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھرا کرتا تھا۔ دل میں شوق تھا اور خدا سے دعائیں مانگتا تھا کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آجائے۔ ایک دن خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے۔ اور یہ فقط حسن اتفاق تھا کہ ایک حمد میں تھا ایک نعت میں۔ اس عمر میں مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا کہ اس مبارک مہم کو خود اس طرح سمجھ کر شروع کرتا کہ پہلا حمد میں ہو دوسرا نعت میں ہو جب یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس قدرتی اتفاق کو مبارک فال سمجھوں۔ مگر ان دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی اس کا مزہ اب تک نہیں بھولتا۔ انھیں کہیں کہیں اپنی کتاب میں کہیں جابجا کاغذوں پر رنگ

برنگ کی روشنائیوں سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو سناتا تھا۔ اور خوشی کے مارے پھولوں نہ سماتا تھا۔ غرض کہ اسی عالم میں کچھ کچھ کہتے رہے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے۔

اسی محلّے میں میر کاظم حسین نام ایک ان کے ہم سن ہم سبق تھے کہ نواب سید رضی خاں مرحوم کے بھانجے تھے۔ بیقرار تخلص کرتے تھے۔ اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے مگر ذہن کی جودت اور طبیعت کی براقی کا یہ عالم تھا کہ کبھی برق تھے اور کبھی بادوباراں انھیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں تحصیل کمال کے لیے اچھے اچھے موقعے ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور وہ اتحاد طبعی کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے۔ انھیں دنوں کا شیخ مرحوم کا ایک مطلع ہے کہ نمونہ تیزی طبع کا دکھاتا ہے۔

ماتھے پہ ترے جھمکے ہے جھومر کا پڑا چاند لابوسہ 'چڑھے چاند کا وعدہ تھا چڑھا چاند

ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سنائی۔ شیخ مرحوم نے پوچھا یہ غزل کب کہی؟۔ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے انھیں سے یہ اصلاح لی ہے۔ شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا اور ان کے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے۔

اصلاح جاری تھے مشاعروں، میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ لوگوں کی واہ واطبیعتوں کو بلند پروازیوں کے پر لگاتی تھی۔ کہ رشک جو تلامید الرحمان کے آئینوں کا جوہر ہے استاد شاگردوں کو چمکانے لگا۔ بعض موقعے پر ایسا ہوا کہ شاہ صاحب نے ان کی غزل کو دیکھ کر بے اصلاح پھیر دیا اور کہا کہ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ کبھی کہہ دیا کہ یہ کچھ نہیں۔ پھر سوچ کر کہو بعض غزلوں کو جو اصلاح دی تو اس سے بے ادائی پائی گئی۔ ادھر انھیں کچھ تو یاروں نے چمکادیا کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزردگی پیدا کی کہ شاہ صاحب اصلاح میں بے توجہی یا پہلو تہی کرتے ہیں۔ چناں چہ اس طرح کئی دفعہ غزلیں پھیر دیں۔ بہت سے شعر کٹ گئے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین منیر تھے جو براقی طبع میں اپنے والد کے خلف الرشید تھے۔ ان کی غزلوں میں توارد سے یا خدا جانے کس اتفاق سے وہی مضموں پائے گئے۔ اس لیے انھیں زیادہ رنج ہوا۔

اگرچہ ان کی طبیعت حاضر و فکر رسا' بندش چست اس پر کلام میں زور سب کچھ تھا۔ مگر چوں کہ یہ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے نہ دنیا کے معاملات کا تجربہ تھا نہ کوئی ان کا دوست

ہمدرد تھا اس لیے رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی قیل و قال میں ایک دن سودا کی غزل پر غزل کہی۔ دوش نقش پا۔ آغوش نقش پا۔ شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ انھوں نے خفا ہو کر غزل پھینک دی کہ استاد کی غزل پر غزل کہتا ہے؟ اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اڑنے لگا۔ ان دنوں میں ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق نے بے قرار کر کے گھر سے نکالا۔ مگر غزل بے اصلاح تھی۔ دل کے ہراس نے روک لیا کہ ابتدائے کار ہے احتیاط شرط ہے۔ قریب شام افسردگی اور مایوسی کے عالم میں جامع مسجد تک آ نکلے۔ آثار شریف میں فاتحہ پڑھی۔ حوض پر آئے وہاں میر کلو حقیر بیٹھے تھے۔ چوں کہ مشاعروں کی گرم غزلوں نے روشناس کر دیا تھا اور سن رسیدہ اشخاص شفقت کرنے لگے تھے میر صاحب نے انھیں پاس بٹھایا اور کہا کہ کیوں میاں ابراہیم؟ آج کچھ مکدر معلوم ہوتے ہو۔ خیر ہے؟ جو کچھ ملال دل پر تھا انھوں نے بیان کیا میر صاحب نے کہا کہ بھلا وہ غزلیں ہمیں تو سناؤ۔ انھوں نے غزل سنائی۔ میر صاحب کو ان کے معاملے پر درد آیا۔ کہا کہ جاؤ بے تامل غزل پڑھ دو۔ کوئی اعتراض کرے گا تو جواب ہمارا ذمہ ہے۔ اور ہاتھ اٹھا کر دیر تک ان کے لیے دعا کرتے رہے۔ اگر چہ میر صاحب کا قدیمانہ انداز تھا مگر وہ ایک کہن سال شخص تھے۔ بڑے بڑے باکمال شاعروں کو دیکھا ہوا تھا۔ اور مکتب پڑھایا کرتے تھے۔ اس لیے شیخ مرحوم کی خاطر جمع ہوئی۔ اور مشاعرے میں جا کر غزل پڑھی وہاں بہت تعریف ہوئی۔

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ انھیں تو شعر سے کچھ رغبت نہ تھی مگر مرزا ابو ظفر ولی عہد کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے شعر کے عاشق شیدا تھے اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اس لیے دربار شاہی میں جو کہنہ مشق شاعر تھے مثلاً حکیم ثناءاللہ خان فراق، میر غالب علی خان سید عبدالرحمٰن خان احسان، برہان الدین خان زار، حکیم قدرت اللہ خان قاسم، ان کے صاحبزادے حکیم عزاللہ خان عشق، میاں شکیبا شاگرد میر تقی مرحوم مرزا عظیم بیگ عظیم شاگرد سودا، میر قمر الدین منت ان کے صاحبزادے میر نظام الدین ممنون وغیرہ سب مشاعرے میں آ کر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سناتے تھے۔ مطلع اور مصرع جلسے میں ڈالتے تھے۔ ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا تھا، مصرع پر مصرع لگا کر طبع آزمائی کرتا تھا۔ میر کاظم حسین بیقرار کہ ولی عہد موصوف کے ملازم خاص تھے، اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے تھے۔ شیخ مرحوم کو خیال ہوا کہ اس جلسے میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوت فکر کو خوب بلند پروازی ہو لیکن اس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی۔ جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا۔ چناں چہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعے میں پہنچے۔ اور

اکثر دربار ولی عہد میں جانے لگے۔

شاہ نصیر مرحوم کہ ولی عہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے دکن چلے گئے۔ میر کاظم حسین ان کی غزل بنانے لگے۔ انھیں دنوں میں جان الفنسٹن صاحب شکار پور سندھ وغیرہ سرحدات سے لے کر کابل تک عہد نامے کرنے کو چلے۔ انھیں ایک میر منشی کی ضرورت ہوئی کہ قابلیت وعلمیت کے ساتھ امارت خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔ میر کاظم حسین نے اس عہدہ پر سفارش کے لیے ولی عہد سے شقہ چاہا۔ مرزا مغل ان دنوں میں ان کے مختار کل تھے اور وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ جس پر ولی عہد کی زیادہ نظر عنایت ہو اسے کسی طرح سامنے سے سرکاتے رہیں۔ اس قدرتی پیچ سے میر کاظم حسین کو شقہ سفارش آسان حاصل ہو گیا اور وہ چلے گئے۔

چند روز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولی عہد کے ہاں گئے تو دیکھا کہ تیر اندازی کی مشق کر رہے ہیں انھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ میاں ابراہیم! استاد تو دکن گئے میر کاظم حسین ادھر چلے گئے تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا؟ غرض اس وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے تو بنا دو! یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سنائی۔ ولی عہد بہادر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنایا جایا کرو۔

دلی میں نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ ایک عالی خاندان امیر تھے۔ علوم ضروری سے باخبر تھے۔ اور شاعری کے کہنہ مشاق۔ مگر اس فن سے ایسا عشق رکھتے تھے کہ فنافی الشعر کا مرتبہ اسی کو کہتے ہیں۔ چونکہ لطف کلام کے عاشق تھے اس لیے جہاں متاع نیک دیکھتے تھے نہ چھوڑتے تھے۔ زمانے کی درازی نے سات شاعروں کی نظر سے ان کا کلام گزرانا تھا چناں چہ ابتداء میں شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح لیتے رہے اور سید علی خاں غمگین وغیرہ وغیرہ استادوں سے بھی مشورہ ہوتا رہا۔ جب شیخ مرحوم کا شہرہ ہوا تو انھیں بھی اشتیاق ہوا۔ یہ موقع وہ تھا کہ نواب موصوف نے اہل فقر کی برکت صحبت سے ترک دنیا کر کے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ چناں چہ استاد مرحوم فرماتے تھے کہ میری ۱۹۔ ۲۰ برس کی عمر تھی۔ گھر کے قریب ایک قدیمی مسجد تھی ظہر کے بعد وہاں بیٹھ کر میں وظیفے پڑھ رہا تھا۔ ایک چوبدار آیا اس نے سلام کیا اور کچھ چیز رومال میں لپیٹی ہوئی میرے سامنے رکھ کر الگ بیٹھ گیا۔ وظیفہ سے فارغ ہو کر اسے دیکھا تو اس میں ایک خوشہ انگور تھا۔ ساتھ ہی چوبدار نے کہا کہ نواب صاحب نے دعا فرمائی ہے۔ تبرک بھیجا اور فرمایا ہے کہ آپ کا کلام تو پہنچا ہے مگر آپ کی زبان سے سننے

کو جی چاہا ہے۔ شیخ مرحوم نے وعدہ کیا اور تیسرے دن تشریف لے گئے۔ وہ بہت اخلاق سے ملے اور بعد گفتگوئے معمولی کے شعر کی فرمائش کی۔ انھوں نے ایک غزل کہنی شروع کی تھی اس کا مطلع پڑھا۔

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی　　　چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

سن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ خیر حال تو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا مگر تمھاری زبان سے سن کر اور لطف حاصل ہوا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ عجیب اتفاق یہ کہ حافظ غلام رسول شوق یعنے استاد مرحوم کے قدیمی استاد اسی وقت آ نکلے۔ نواب انھیں دیکھ کر مسکرائے اور شیخ مرحوم نے اسی طرح سلام کیا کہ جو سعادت مند شاگردوں کا فرض ہے۔ وہ ان سے خفا رہتے تھے کہ شاگرد میرا اور مجھے غزل نہیں دکھاتا اور مشاعروں میں میرے ساتھ نہیں چلتا۔ غرض انھوں نے اپنے شعر پڑھنے شروع کر دیے۔ شیخ مرحوم نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور رخصت چاہی۔ چوں کہ نواب مرحوم کے برابر بیٹھے ہوئے تھے نواب نے چپکے سے کہا کان بدمزہ ہو گئے کوئی شعر اپنا سناتے جاؤ۔ استاد مرحوم نے انھی دنوں میں ایک غزل کہی تھی۔ دو مطلعے اس کے پڑھے۔

جینا نظر اپنا ہمیں اصلا نہیں آتا　　　گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا
مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا　　　پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

اس دن سے معمول ہو گیا کہ ہفتے میں دو دن جایا کرتے اور غزل بنا آیا کرتے تھے۔ چناں چہ جو دیوان معروف اب رائج ہے وہ تمام و کمال انھی کا اصلاح کیا ہوا ہے۔

حافظ احمد یار نے چند روز پہلے خواب میں دیکھا کہ ایک جنازہ رکھا ہے بہت سے لوگ گرد جمع ہیں۔ وہاں حافظ عبدالرحیم کہ حافظ احمد یار کے والد تھے ایک کھیر کا پیالہ لیے کھڑے ہیں اور شیخ علیہ الرحمہ کو اس کے چمچے بھر بھر کر دیتے جاتے ہیں۔ حافظ موصوف نے ان سے پوچھا کہ کیا معرکہ ہے اور جنازہ کس کا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ مرزا رفیع کا جنازہ ہے اور میاں ابراہیم اس کے قائم مقام مقرر ہوئے ہیں۔ خاقانی ہند کے خطاب پر لوگوں نے بڑے چرچے کیے کہ بادشاہ نے یہ کیا کیا۔ کہن سال اور نامی شاعروں کے ہوتے ہوئے ایک نوجوان کو ملک الشعرا بنایا اور ایسا عالی درجے کا خطاب دیا۔ ایک جلسے میں یہی گفتگو ہو رہی تھی کہ کسی نے کہا کہ جس قصیدے پر یہ خطاب ہوا ہے اسے بھی تو دیکھنا چاہیے۔ چناں چہ قصیدہ مذکور لا کر پڑھایا

گیا میر کلو حقیر کہ شاعر سن رسیدہ اور شعرائے قدیم کے صحبت یافتہ تھے سن کر بولے کہ بھئی انصاف شرط ہے۔ کلام کو بھی تو دیکھو۔ ایسے شخص کو بادشانہ نے خاقانی ہند کے خطاب سے ملک الشعر ابنایا' تو کیا برا کیا۔ مجھے یاد ہے جب استاد مرحوم نے یہ حال بیان کیا تھا اس وقت بھی کہا تھا تو فرماتے تھے کہ بے انصافی یا ان کی بے خبری یا بے بصری سے دق ہو کر کچھ کہتا تو فرماتے تھے کہ بے انصافوں ہی میں سے کوئی باانصاف بھی بول اٹھتا ہے۔ بے خبروں میں باخبر بھی نکل آتا ہے اپنا کام کیے جاؤ۔ ۳۶ برس کی عمر تھی جبکہ جملہ منہبات سے توبہ کی اور اس کی تاریخ کہی اے ذوق بگو سہ بار توبہ۔

خاص حالات اور طبعی عادات

شیخ مرحوم قد و قامت میں متوسط اندام تھے۔ چناں چہ خود فرماتے تھے۔

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو

رنگ سانولا چیچک کے داغ بہت تھے۔ کہتے تھے کہ ۹ دفعہ چیچک نکلی تھی۔ مگر رنگت اور وہ داغ کچھ ایسے مناسب و موزوں واقع ہوئے تھے کہ چمکتے تھے اور بھلے معلوم ہوتے تھے۔ آنکھیں روشن اور نگاہیں تیز تھیں۔ چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا تھا اور بدن میں پھرتی پائی جاتی تھی۔ بہت جلد چلتے تھے۔ وہ اکثر سفید کپڑے پہنتے تھے اور وہ ان کو نہایت زیب دیتے تھے۔ آواز بلند اور خوش آیندہ جب مشاعروں میں پڑھتے تھے تو محفل گونج اٹھتی تھی۔ ان کے پڑھنے کی طرز ان کے کلام کی تاثیر کو زیادہ زور دیتی تھی۔ اپنی غزل آپ ہی پڑھتے تھے۔ کسی اور سے ہرگز نہ پڑھواتے تھے۔

اس میں کسی کو کلام نہیں کہ انھوں نے فکر سخن اور کثرت مشق میں فنافی الشعر کا مرتبہ حاصل کیا اور انشا پردازی ہند کی روح کو شگفتہ کیا۔ مگر فصاحت کا دل کملا جاتا ہوگا جب ان کے دیوان مختصر پر نگاہ کرتی ہوگی۔ اس کے سبب کا بیان کرنا ایک سخت مصیبت کا افسانہ ہے اور اس کی مرثیہ خوانی کرنی میرا فرض ہے۔ ان کی وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے کہ وہ بھی باپ کی طرح اکلوتے بیٹے تھے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں۔ متفرق غزلوں کے بستے اور بڑی بڑی پوٹیں تھیں بہت سی تھیلیاں اور مٹکے تھے کہ جو کچھ کہتے تھے گویا بڑی احتیاط سے ان میں بھرتے جاتے تھے۔ ترتیب اس کی پسینے کی جگہ خون بہاتی تھی کیوں کہ بچپن سے لے کر دم واپسیں کا کلام انھی میں تھا۔ بہت سی متفرق غزلیں بادشاہ کی۔

بہتیری غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں۔

چناں چہ اول ان کی اپنی غزلیں اور قصائد انتخاب کر لیے۔ یہ کام کئی مہینے میں ختم ہوا غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام کو میں نے جاری کیا۔ مگر بااطمینان کیا مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانہ کا ورق الٹ جائے گا۔ عالم تہ و بالا ہو جائے گا۔ حسرتوں کے خون بہہ جائیں گے۔ دل کے ارمان دل ہی میں رہ جائیں گے۔ دفعتہً ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا۔ چناں چہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسمٰعیل ان کے فرزند جسمانی کے ساتھ ہی ان کے فرزندان روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے۔ میرا یہ حال ہوا کہ فتح یاب لشکر کے بہادر دفعتہً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد یہاں سے نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کیا کچھ اٹھا کر لے چلوں۔ ان کی غزلوں کے جنگ پر نظر پڑی۔ یہی خیال آیا کہ محمد حسین اگر خدا نے کرم کیا اور زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا مگر استاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو یہ غزلیں پھر آکر کہیں گے۔ اب ان کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو وہ مر کر بھی زندہ ہیں یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا۔ وہی جنگ اٹھا بغل میں مارا سجے سجائے گھر کو چھوڑ ۲۲ نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا۔ ساتھ ہی زبان سے نکلا کہ حضرت آدم بہشت سے نکلے تھے۔ دلی بھی ایک بہشت ہے انھی کا پوتا ہوں۔ دہلی سے کیوں نہ نکلوں۔ غرض میں تو آوارہ ہو کر خدا جانے کہاں کا کہاں نکل آیا مگر حافظ غلام رسول ویران کہ محبت کے لحاظ سے میرے شفیق دوست اور حضرت مرحوم کی شاگردی کے رشتے سے روحانی بھائی ہیں انھوں نے شیخ مرحوم کے بعض اور درد خواہ دوستوں سے ذکر کیا کہ مسودوں کا سرمایہ تو سب دلی کے ساتھ برباد ہوا اس وقت یہ زخم تازہ ہے اگر اب دیوان مرتب نہ ہوا تو کبھی نہ ہو گا۔ حافظ موصوف کو خود بھی حضرت مرحوم کا کلام بہت کچھ یاد ہے۔ اور خدا نے ان کی بصیرت کی آنکھیں ایسی روشن کی ہیں کہ بصارت کی آنکھ کے محتاج نہیں۔ اس لیے لکھنے کی سخت مشکل ہوئی۔ غرض یہ کہ ایک مشکل میں کئی مشکلیں تھیں۔ انھوں نے اس مہم کا سرانجام کیا۔ اور اپنی یاد کے علاوہ نزدیک بلکہ دور دور سے بہت کچھ بہم پہنچایا۔ سب کو سمیٹ کر ۱۲۷۹ھ میں ایک مجموعہ جس میں اکثر غزلیں تمام اکثر ناتمام بہت سے متفرق اشعار اور چند قصیدے ہیں کہ چھاپ کر نکالا۔

جو غزلیں اپنے تخلص سے کہیں تھیں اگر جمع کی جاتیں تو بادشاہ کے چاروں دیوانوں کے برابر ہوتیں۔ غزلوں کے دیوان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ عام جوہر ان کے کلام کا

تازگی۔ مضمون' صفائی کلام' چستی ترکیب' خوبی محاورہ' اور عام فہمی ہے مگر حقیقت میں رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا۔ ابتداء میں مرزا رفیع کا انداز تھا۔ شاہ نصیر سے ان دنوں معرکے ہو رہے تھے۔ ان کا ڈھنگ وہی تھا۔ اس لیے انھوں نے بھی وہی اختیار کیا اس کے علاوہ مرزا کی طرز کو جلسے کے گرمانے میں اور لوگوں کے لب و دہن سے واہ وا کے نکال لینے میں ایک عجیب جادو کا اثر ہے۔ چناں چہ وہی شکل طرحیں' چست بند شیں' برجستہ ترکیبیں' معانی کی بلندی' الفاظ کی شکوہیں ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ چند روز کے بعد الٰہی بخش خاں معروف کی خدمت میں اور ولی عہد کے دربار میں پہنچے تو معروف ایک دیرینہ سال مشاق اور فقیر مزاج شخص تھے۔ ان کی پسند طبع کے بموجب انھیں بھی تصوف اور عرفان اور درددلی کی طرف خیالات کو مائل کرنا پڑا۔ نوجوان ولی عہد طبیعت کے بادشاہ تھے۔ ادھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی۔ وہ جرات کے انداز کو پسند کرتے تھے اور جرات اور سید انشا اور مصحفی کے مطلع اور اشعار بھی لکھنو سے اکثر آتے رہتے تھے۔ ان کی غزلیں انھی کے انداز میں بناتے تھے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اصلی میلان ان کی طبیعت کا سودا کے انداز پر زیادہ تھا۔ نظم اردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف نے قصیدہ پر دستکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے بعد شیخ مرحوم کے سوا کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا۔ اور انھوں نے مرقعے کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا۔ انوری' ظہیر' ظہوری' نظیری' عرفی' فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں۔ لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان کر دکھایا۔ ہر جشن میں ایک قصیدہ کہتے تھے۔ اور خاص خاص تقریبیں جو پیش آتی تھیں وہ الگ تھیں۔ اس لیے اگر جمع ہوتے تو خاقانی ہند کے قصائد خاقانی شروانی سے دو چند ہوتے جب تک اکبر شاہ زندہ تھے تب تک ان کا دستور تھا کہ قصیدہ کہہ کر لے جاتے اور اپنے آقا یعنی ولی عہد بہادر کو سناتے۔ دوسرے دن ولی عہد ممدوح اس میں اپنی جگہ بادشاہ کا نام ڈلوا کر لے جاتے۔ اور دربار شاہی میں سنواتے۔ افسوس یہ ہے کہ عالم جوانی کی طبع آزمائی سب برباد ہوئی۔ جو کچھ ہیں وہ چند قصیدے ہیں کہ بڑھاپے کی ہمت کی برکت ہے۔

کئی مخمس تھے کئی رباعیاں تھیں۔ صدہا تاریخیں تھیں۔ مگر تاریخوں کی کمائی بادشاہ کے حصے میں آئی۔ کیوں کہ بہت بلکہ کل تاریخیں انھی کی فرمائش سے ہوئیں۔ اور انھی کے نام سے ہوئیں۔ مرثیہ سلام کہنے کا انھیں موقع نہیں ملا۔ بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ شاہ عالم اور اکبر شاہ کی طرح محرم میں کم سے کم ایک سلام ضرور کہتے تھے۔ شیخ مرحوم بھی اسی کو اپنی سعادت اور عبادت سمجھتے تھے۔ ہزاروں گیت' ٹپے' ٹھمریاں' ہولیاں کہیں۔ وہ بادشاہ کے نام سے عالم

میں مشہور ہوئیں۔ اور ان باتوں میں وہ اپنی شہرت چاہتے بھی نہ تھے۔ میرے نزدیک ان کے اور ان کے دیکھنے والوں کے لیے بڑے فخر کی بات یہ ہے کہ خدا نے کمال شاعری اور ایسا اعلیٰ درجہ قادر الکلامی کا انھیں دیا۔ اور ہزاروں آدمیوں سے انھیں ناراضی یا رنج پہنچا ہو گا مگر انھوں نے تمام عمر میں ایک شعر بھی ہجو میں نہ کہا۔ خدا ہر شخص کو اس کی نیت کا پھل دیتا ہے اس کی شان دیکھو کہ ۶۸ برس کی عمر پائی مگر خدا نے ان کی ہجو بھی کسی کے منہ سے نہ نکلوائی۔

اکثر نئے ایجاد و اختراع کے ارادے میں تھے اور بعض بعض ارادے شروع ہوئے مگر ناتمام رہے۔ کیوں کہ بادشاہ کی فرمایشیں دم لینے کی مہلت نہ دیتی تھیں اور تماشہ یہ کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا۔ اتنا تھا کہ بات نکالتا مگر اسے سمیٹ نہ سکتا تھا۔ اس کا کیا ہوا انھیں سنبھالنا پڑتا تھا۔

وہ اپنی غزل بادشاہ کو سناتے تھے۔ اگر کسی طرح اس تک پہنچ جاتی تو وہ اسی غزل پر خود غزل کہتا تھا۔ اب اگر نئی غزل کہہ کر دیں اور وہ اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچہ نہ تھا۔ ۷۰ برس کا سخن فہم تھا۔ اگر اس سے چست کہیں تو اپنے کہے کو آپ مٹانا بھی کچھ آسان کام نہیں۔ ناچار اپنی غزل میں ان کا تخلص ڈال کر دیتے تھے۔ بادشاہ کو بڑا خیال رہتا تھا کہ وہ اپنی کسی چیز پر زور طبع خرچ نہ کریں۔ جب ان کے شوق طبع کو کسی طرف متوجہ دیکھتا تو برابر غزلوں کا تار باندھ دیتا کہ جو کچھ جوش طبع ہو ادھر ہی آجائے۔

عموماً انداز کلام

کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین ستارے آسمان سے اتارے ہیں۔ مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے انھیں ایسی شان و شکوہ کی کرسیوں پر بٹھا دیا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں۔ انھیں قادر الکلامی کے دربار سے ملک سخن پر حکومت مل گئی ہے کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں۔ کبھی تشبیہ کے رنگ سے سجا کر استعارے کی بو سے بساتے ہیں۔ کبھی بالکل سادے لباس میں جلوہ دکھاتے ہیں۔ مگر ایسا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ دل میں نشتر سا کھٹک جاتا ہے۔ اور منہ سے کبھی واہ نکلتی ہے اور کبھی آہ نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہونٹوں میں شستہ اور برجستہ لفظوں کے خزانے بھرے ہیں اور ترکیب الفاظ کے ہزاروں رنگ ہیں۔ مگر جسے جہاں سجتا دیکھتے ہیں وہ گویا وہیں کے لیے ہوتا ہے۔ وہ طبیب کامل کی طرح ہر مضمون کی طبیعت کو پہچانتے تھے کہ کون سا ہے کہ سادگی

میں رنگ دے جائے گا اور کون سار نگینی میں۔ کامل مصور کی تیزی قلم کو اس کے رنگوں کی شوخی روشن کرتی ہے۔ اسی طرح ان کے مضمون کی باریکی کو ان کے الفاظ کی لطافت جلوہ دیتی ہے۔ انھیں اس بات کا کمال تھا کہ باریک سے باریک مطلب اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کر جاتے تھے گویا ایک شربت کا گھونٹ تھا کہ کانوں کے رستے سے پلادیا۔ اس وصف نے نادانوں کو غلطی میں ڈالا ہے جو کہتے ہیں کہ ان کے ہاں عالی مضامین نہیں بلکہ سیدھی باتیں اور صاف صاف خیالات ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان ہونٹوں میں خدا نے عجب تاثیر دی تھی۔ کہ جو لفظ ان سے ترکیب پاکر نکلے ہیں۔ خود بہ خود زبانوں پر ڈھلکتے آتے ہیں۔ جیسے ریشم پر موتی۔ خدا جانے زبان نے کسی آئینے کی صفائی اڑائی ہے یا انھوں نے الفاظ کے نگینوں پر کیوں کر جلا کی ہے جس سے کلام میں یہ بات پیدا ہو گئی ہے۔ حقیقت میں اس کا سبب یہ ہے کہ قدرت کلام ان کے ہر ایک نازک اور باریک خیال کو محاورہ اور ضرب المثل میں اس طرح ترکیب دیتی ہے۔ جیسے آئینہ گر شیشہ کو قلعی سے ترکیب دے کر آئینہ بناتا ہے۔ اسی واسطے صاف ہر ایک شخص کی سمجھ میں آتا ہے اور دل پر اثر بھی کرتا ہے۔

ان کے کلام میں یہ بھی خصوصیت ہے کہ شعر کا کوئی لفظ بھول جایئے جب تک وہی لفظ اس کی جگہ نہ رکھا جائے شعر مزا نہیں دیتا۔ چناں چہ لکھنو میں میر انیس مرحوم کے سامنے سلسلہ تقریر میں ایک دن میں نے ان کا مطلع پڑھا۔

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھیرے گا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھیروں نہ ٹھیرے گا

انھوں نے پوچھا کہ یہ شعر کس کا ہے؟ میں نے کہا شیخ مرحوم کا ہے دو چار باتیں کر کے انھوں نے پھر فرمایا کہ زیادہ شعر پڑھیے۔ میں نے پھر پڑھا۔ انھوں نے دوبارہ خود اپنی زبان سے پڑھا پھر باتیں ہونے لگیں چلتے ہوئے پھر کہا کہ ذرا وہ شعر پڑھتے جایئے گا۔ اور ساتھ اس کے یہ بھی کہ صاحب کمال کی یہ بات ہے کہ جو لفظ جس مقام پر اس نے بٹھادیا ہے اسی طرح پڑھا جائے تو ٹھیک ہوتا ہے نہیں تو شعر رتبے سے گر جاتا ہے۔

ان کا مضمون جس طرح دل کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح پڑھنے میں زبان کو مزا آتا ہے۔ ان کے لفظوں کی ترکیب میں ایک خداداد چستی ہے۔ جو کلام میں زور پیدا کرتی ہے۔ وہ زور فقط ان کے دل کا جوش ہی نہیں ظاہر کرتا۔ بلکہ سننے والے کے دل میں ایک خروش پیدا کرتا ہے۔ اور یہی قدرتی رنگ ہے جو ان کے کلام پر سودا کی تقلید کا پرتو ڈالتا ہے۔

ان کے دیوان کو جب نظر غور سے دیکھا جاتا ہے تو اس سے رنگا رنگ کے زمزمے اور بوقلموں آوازیں آتی ہیں۔ ہر رنگ کے انداز موجود ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے دیکھنے سے دل اکتا نہیں جاتا۔ وہ لفظ لفظ کی نبض پہچانتے تھے اور مضامین کے طبیب تھے۔ جس طرح برجستہ بیٹھتا دیکھتے تھے اسی طرح باندھ دیتے تھے۔ خیال بندی ہو یا عاشقانہ یا تصوف۔ ان کے سینے میں جو دل تھا گویا ایک آدمی کا دل نہ تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے دل تھے۔ اس واسطے کلام ان کا مقناطیس کی طرح قبول عام کو کھینچتا ہے۔ دل دل کے خیال باندھتے۔ اور اس طرح باندھتے تھے گویا اپنے ہی دل پر گزری ہے۔

ایک دن دربار سے آکر بیٹھے تھے جو میں پہنچا۔ افسردہ ہو کر کہنے لگے کہ آج عجیب ماجرا گزرا۔ میں جو حضور میں گیا تو محل میں تھے وہیں بلالیا اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے استاد آج مجھے دیر تک ایک بات کا افسوس رہا۔ میں نے حال پوچھا کہا کہ وہ جو قصیدہ تم نے ہمارے لیے کہا تھا۔ اس کے وہ اشعار مجھے یاد آگئے۔ ان کے خیالات سے طبیعت کو عجیب لطف حاصل ہوا۔ مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ اب تم یہ قصیدے ہمارے لیے کہتے ہو۔ ہم جائیں گے تو جو تخت پر بیٹھے گا اس کے لیے کہو گے۔ میں نے عرض کی کہ حضور کچھ تردد نہ فرمائیں۔ خیمہ پیچھے گرتا ہے میخیں اور طنابیں پہلے ہی اکھڑ جاتی ہیں۔ ہم حضور سے پہلے ہی اٹھ جائیں گے۔ اور حضور خیال فرمائیں کہ عرش آرام گاہ کے دربار کے لوگ حضور کے دربار میں کہاں تھے؟ فردوس منزل کے امراء ان کے عہد میں کہاں تھے۔ عرش منزل کے فردوس منزل کے دربار میں کہاں تھے۔ فردوس منزل کے امیر عرش آرام گاہ کے دربار میں کہاں تھے۔ عرش آرام گاہ کے امراج آج حضور کے دربار میں کہاں ہیں! بس یہی خیال فرمایئے۔ جو جس کے ہوتے ہیں وہ اسی کے ساتھ جاتے ہیں۔ نیا میر مجلس نئی ہی مجلس جماتا ہے اور اپنا سامان مجلس بھی اپنے ساتھ ہی لاتا ہے۔ یہ سن کر حضور بھی آبدیدہ ہوئے۔ میں بھی آبدیدہ ہوا مگر خیال مجھے یہ آیا کہ دیکھو ہم ہمیشہ نماز کے بعد حضور کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ خدا شاہد ہے کہ اپنا خیال اس طرح آج تک کبھی نہیں آیا۔ حضور کو ہمارا خیال بھی نہیں۔ میاں! دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے۔

بادشاہ کے چار دیوان ہیں پہلے میں کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں کچھ میر کاظم حسین بیقرار کی ہیں۔ غرض پہلا دیوان نصف ہے زیادہ اور باقی تین دیوان سر تا پا حضرت مرحوم کے ہیں۔ جن سنگلاخ زمینوں میں قلم کو چلنا مشکل ہے ان کا نظام و سرانجام اس خوب صورتی سے کیا ہے کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمھارا زمین کا بادشاہ

ہے۔ طرحیں خوب نکالتا ہے مگر تم سر سبز کرتے ہو ورنہ شورزار ہو جائے۔ مسودہ خاص میں کوئی شعر پورا کوئی ڈیڑھ مصرع کوئی ایک کوئی آدھا مصرع فقط بحر اور ردیف قافیہ معلوم ہو جاتا تھا باقی بخیر۔ یہ ان ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے۔ ایجادی فرمایشوں کی حد نہ تھی۔

تنویر احمد علوی

ذوق ایک صاحبِ علم وفن شخصیت

شیخ ابراہیم ذوق آخری مغل عہد کی ایک بہت ممتاز علمی شخصیت ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن کی شہرت علم کے نقطہ نظر سے نہیں بلکہ شعر و سخن کے اعتبار سے ہوئی۔ جس میں وہ اپنے عہد میں ایک نشانِ ادب اور ماہر فن کی حیثیت رکھتے تھے۔

اُن کا جنم ایک غریب خاندان میں ہوا تھا جو کسی بھی اعتبار سے معزز و ممتاز نہیں تھا۔ اُن کے والد شیخ محمد رمضان جن کے گھر میں یہ مبارک چاند نکلا تھا اصلاً قصبہ شاہ پور تحصیل بڈھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے اور ان کے اہلِ خاندان کے بیان کے مطابق اُن کا آبائی پیشہ ظروف سازی تھا۔

یہ جو لکھا گیا ہے کہ وہ لوگ جراحی کا پیشہ کرتے تھے ممکن ہے کہ کچھ لوگ یہ بھی کرتے ہوں کہ یہ پیشہ مختلف ذاتوں اور برادریوں میں رائج تھا اس کی وجہ سے یہ کہنا کہ وہ نائی تھے شاید مناسب نہیں۔ اُن کے اپنے زمانے میں ممکن ہے اُن کو کسی نے سلمانی بھی لکھا ہو لیکن اُن کے اہلِ خاندان سے گفتگو کرنے پر یہ معلوم ہوا کہ ایسا کوئی خاندانی نام ان لوگوں میں رائج نہیں تھا۔

ذوق کے والد نواب لطف علی خاں کی سرکار میں مُلازم تھے۔ نواب لُطف علی خاں اپنے وقت کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور اُن کے بھائی نواب رضی خاں وکیلِ سلطانی تھے۔ اس سے بھی اس خاندان کی وجاہت و نجابت کا کچھ حال معلوم ہوتا ہے۔

شیخ محمد رمضان پڑھے لکھے شخص غالباً نہیں تھے لیکن اچھے لوگوں کی صحبت نے اُن کو زندگی کے تجربوں کے ساتھ ذہنی معلومات سے بھی آراستہ کر دیا تھا۔

ذوقؔ کی تعلیم مولانا عبدالرزاق کے مدرسے میں ہوئی جو مکتب داری کیا کرتے تھے۔ اُن کا یہ مدرسہ یا مکتب محلہ کابلی دروازہ میں کہیں تھا۔ یہیں مولانا محمد باقر سے اُن کی بچپن میں ملاقات ہوئی تھی اور وہ ایک دوسرے کے جگری دوست بن گئے تھے۔ عالمِ طفولیت کی یہ دوستی تمام عمر نبھی۔

مولانا محمد باقر مولانا محمد حسین آزادؔ کے والد تھے۔ اور جس طرح ذوقؔ کا نام اُردو شاعری کی تاریخ میں محفوظ ہے اسی طرح مولانا محمد باقر کا نام بھی اُردو ادب و صحافت کی تاریخ کا ایک بہت ممتاز نام ہے۔

دہلی اُردو اخبار شمالی ہندوستان میں اُردو کا پہلا باقاعدہ اخبار ہے وہ مولانا محمد باقر ہی کی ملکیت تھا اور وہی اُس کے مدیر تھے۔ یہ کہیے کہ اس اخبار سے اُردو میں باقاعدہ صحافت نگاری کا کہکشانی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

یہ اخبار ۱۸۳۶ء سے نکلنا شروع ہوا اور ۱۸۵۷ء تک جاری رہا۔ اس کے آخری چند شمارے "اخبار الظفر" کے نام سے نکلے جن میں انگریزی سلطنت کے باغیوں کی حمایت کی گئی تھی۔ یہی مولانا محمد باقر کے لیے انگریزوں کے دہلی پر دوبارہ قبضے کے بعد شدید مشکلات کا باعث بنا۔

مولانا گرفتار کیے گئے اور شہیدِ راہ آزادی ہوئے جس کے باعث یہ خاندان دہلی سے اُجڑ گیا اور مولانا محمد حسین آزاد اپنے افرادِ خاندان کو لے کر اس تہذیبی شہر سے ہمیشہ کے لیے رُخصت ہو گئے۔

یہ تو خیر ان کی ضمنی کہانی تھی۔ ذوقؔ مرحوم مولوی عبدالرزاق کے مکتب سے فارغ ہونے کے بعد دوسرے اہلِ علم سے استفادہ کرتے رہے اور انھوں نے اپنے ذاتی مطالعے کو بھی جاری رکھا۔ یہ مطالعہ صرف شعر و شاعری سے متعلق نہیں تھا بلکہ اس میں اُس وقت کے مُروج اور مُتداول علوم بھی شامل تھے جس کا اندازہ اُن کے قصائد سے ہوتا ہے۔

ذوقؔ ابھی نوعُمر ہی تھے کہ اُن کی رسائی شہزادہ ابوظفر کی مجلسِ شعر و سُخن تک ہو گئی۔ اس سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ اُنھیں بہت جلد زبان و بیان اور شعر و سُخن پر اتنی

قدرت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ شہزادے کی بزم سخن میں شریک ہو سکیں۔ شاعری میں اُن کے پہلے اُستاد و غلام رَسول شوق تھے اور انھی کے ایما پر انھوں نے اپنا تخلص ذوقؔ اختیار کیا تھا۔ شروع شروع میں وہ میاں ابراہیم کہلاتے تھے جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ تھوڑی عمر ہی سے سنجیدہ اور شریف النفس انسان تھے۔ اُن کا زیادہ تر وقت حصولِ علم اور اکتساب فن میں گزرتا تھا۔ ان کی شاعری کی طرف دہلی کے اربابِ سخن اس وجہ سے متوجہ ہو گئے تھے اور اُن کے فنّی شعور کا چرچا اِدھر اُدھر ہونے لگا تھا۔ اُن کے بچپن کے ایک دوست میر کاظم حُسین بیقرار تھے جن کی رسائی شہزادہ ابو ظفر کی بزم سخن تک تھی۔ یہ نواب رضی خاں کے بھانجے تھے اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے جو اُس زمانے کے مشہور استادان سخن میں تھے۔ مرزا غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف ان کے شاگردوں میں تھے۔ ظفر اور مومن خاں مومنؔ بھی ان کے سلسلۂ کے تلامذہ میں داخل تھے۔

اِن کی شہرت دُور دُور پھیلی ہوئی تھی اور سنگلاخ زمینوں میں غزلیں لکھنے اور غزل در غزل لکھنے کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔

ذوقؔ میر کاظم حُسین بیقرؔار کے ساتھ اُن کی خدمت میں گئے۔ اور اکتسابِ فن کیا۔ شاہ نصؔیر جلد ہی دکن چلے گئے اور میر کاظم حسین بیقؔرار نے بھی سرکاری ملازمت میں آکر دہلی سے کسی دوسرے شہر کی طرف سفر اختیار کیا۔

اُس زمانے میں شہزادہ ابو ظفر نے ذوقؔ کو اپنی غزل دکھانی شروع کی اور رفتہ رفتہ وہ اُستادِ شاہ خیال کیے جانے لگے اور ان کے نام کے ساتھ استاد کا لفظ متصل طور پر شامل ہو گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شاہ نصؔیر کے دکن روانہ ہونے کے بعد نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ بھی ذوقؔ کو غزل دکھانے لگے تھے اور ذوقؔ غزل بنانے میں اُن کی فرمائشوں کے نکتے نکتے کا حق ادا کرتے تھے۔ اس امر سے اختلاف بھی کیا گیا ہے مگر راقم الحروف نے اُن کی ایسی غزلیں دیکھی ہیں جو ذوقؔ کے دست و قلم کی مرہونِ منت ہیں۔ اس لیے اس کو ایک سچائی ماننا پڑتا ہے کہ وہ نواب الٰہی بخش خاں معروف جیسے کہنہ مشق شاعر کے مُشیر سخن ضرور تھے۔ وہ کہہ کر دیتے ہوں یا نہ دیتے ہوں۔ ظفر کے سلسلے میں بھی یہ بات مولانا محمد حسین آزؔاد نے بطورِ خاص دہرائی ہے کہ ذوقؔ ظفر کی غزل نہیں بناتے تھے اکثر انھیں اپنی طرف سے شعر کہہ کر بطورِ ادبی تحفہ پیش کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ بھی ہوتا ہو کہ اُس زمانے میں یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں تھی۔ شاگرد اپنے اساتذہ کو اساتذہ اپنے شاگردوں کو اس طرح شعری تحفوں سے

نوازتے رہتے تھے۔

اس طرح کے مُسودات بھی موجود ہیں اور راقم الحروف نے اپنے ریسرچ مقالات میں اُن کے عکس پیش کیے ہیں جہاں زبانِ قلم ذوقؔ کی ہے اور اشعار ظفرؔ تخلص کے ساتھ آئے ہیں۔

بہر حال یہ ایک الگ مسئلہ ہے ذوقؔ کا اپنا کمال اور کلام اپنی جگہ اور ظفرؔ کے ہزاروں اشعار اپنی جگہ اس میں اختلاف کی گنجائش ذوقؔ کے زمانے سے لے کر آج تک باقی ہے۔ ذوقؔ بہت اچھے زبان داں تھے دہلی کے روز مرّہ اور شہری محاورے پر قدرت رکھتے تھے اور اس اعتبار سے اُن کے اشعار کی نوک پلک پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔ اور نہ اُن کے زمانہ میں ہوا بلکہ رفتہ رفتہ انھیں دہلی کے بہت ہی معتبر اور ممتاز اہلِ زبان اور اصحاب شعر و شعور میں شامل کیا جانے لگا۔

غالبؔ اور مومنؔ جیسے غزل گو اور ندرت پسند شاعروں کے مقابلے میں بھی اُن کی ادبی و شعری حیثیت غیر معمولی تسلیم کی جاتی تھی۔

ظفرؔ کے علاوہ بہت سے شہزادگان اور سلاطین اُن کے حلقۂ شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ دہلی کے محاورے اور روز مرّہ کے معاملے میں اُن کے کلام کو سند مانا جاتا تھا۔

اُس دور میں جب کہ غزل بے حد مقبول تھی اور عالم و عامی کوئی اس چھپک (شوق) سے خالی نہیں تھا مگر جو شخص شاعر ہوتے ہوئے قصیدہ نہیں لکھ سکتا تھا اُسے پورا نہیں ادھورا شاعر سمجھا جاتا تھا۔

ذوقؔ اپنے زمانے کے بہت معروف اور ممتاز قصیدہ نگار تھے اُن کے قصائد کی فضاء علمی ادبی اور فنی اعتبار سے بہت لایقِ تحسین اور قابلِ تعریف تھی اور آج بھی ہے۔

ہم اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتے کہ ذوقؔ کا زمانہ بڑے بڑے اہلِ علم اور اربابِ فکر و نظر کا زمانہ ہے۔ شہر دہلی کا یہ دور ایک ایسا دور تھا جس کی علمی محفلوں کو دیکھ کر عہدِ اکبری اور دورِ شاہجہانی کے جلسے یاد آتے تھے۔

مولوی فضلِ حق خیر آبادی اُن کے والد مولانا فضلِ امام خیر آبادی مفتی صدر الدین آزردہ حکیم محمود خاں اور شاہ عبدالعزیز کے اہلِ خاندان معمولی افراد نہیں تھے۔ غیر معمولی شخصیتیں تھیں ان میں مولوی رشید الدین خاں، اور مولانا مملوک العلی کو بھی شامل رکھیے تو

روشنیوں اور تابناکیوں کا سلسلہ اِدھر سے اُدھر تک آگے بڑھتا ہوا نظر آئے گا۔

مولانا مملوک العلی ایک طرف مولانا قاسم کے پھوپا مولانا یعقوب کے والد ہیں اور دوسری طرف سرسید نے اُن سے استفادہ کیا ہے ایک نہایت اہم تاریخی بات ہے کہ ایک شخصیت دیو بند اور علی گڑھ دونوں کے لیے سرچشمہ فکر و فن کی حیثیت رکھتی ہے۔

قدیم دہلی کالج بھی اُسی زمانے میں قائم ہوا۔ اُس کے طالب علموں اور استادوں میں بڑی بڑی شخصیتیں شامل ہیں جنھوں نے اُردو شعر و ادب میں نئی جہتیں پیدا کیں اُس وقت کے بڑے مشاعرے لالِ قلعے میں ہوتے تھے یا قدیم دہلی کالج میں اور ذوقؔ ہر جگہ اور ہر موقعے پر قلعہ و شہر کے استادِ سخن کی حیثیت سے جانے جاتے تھے اور مانے جاتے تھے۔ قلعے کے مشاعروں کا ذکر اُس زمانے کے بعض اخبارات میں بھی آتا رہا اور غالب نے اُس کا تذکرہ اپنے فارسی خطوط میں بھی کیا۔

غالبؔ کے بیانات کی حیثیت آج ہماری ادبی تاریخ کے لیے غیر معمولی طور پر اہم اور لائق سند ہے۔ ان مشاعروں میں ظفرؔ کا کلام اکثر بیشتر ذوقؔ ہی پڑھ کر سناتے تھے اور اس طرح بادشاہ کو Represent کرتے تھے یہ معمولی اعزاز نہیں تھا۔

ذوقؔ نے جو قصیدے لکھے وہ اُردو میں ہیں فارسی اُن کو آتی تھی عربی وہ جانتے تھے فلسفہ و منطق جیسے علوم سے وہ واقف تھے "فنِ رمل" علم نجوم کے علاوہ فنِ طب سے بھی بخوبی آگاہ تھے اُن کو ایک سے زیادہ زبانیں بھی اس حد تک آتی تھیں کہ وہ اپنے ایک قصیدے میں اٹھارہ زبانوں میں اٹھارہ شعر کہہ کر داخل کرتے ہیں جن پر اکبر شاہ ثانی کے دربار سے اُن کو خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا گیا تھا جو آیندہ کے لیے اُن کے نام کا جُز بن گیا اور وہ خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوقؔ کہلانے لگے۔ خاقانی شیروانی فارسی زبان کے بہت ممتاز شاعروں اور زبان دانوں میں تھا۔ اسی نسبت سے ذوقؔ کو یہ خطاب دیا گیا تھا جو حضرت امیر خسروؔ کے خطاب طوطیٔ ہند کی طرح ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھا گیا۔

۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ ظفرؔ اکتوبر کے مہینے میں مسند نشین قلعۂ معلی ہوئے تو ذوقؔ نے اپنے بادشاہ کے لیے ایک بہت خوب صورت قصیدہ لکھا جس کی ردیف تھی "نورِ سحر رنگِ شفق" اس میں طرح طرح کی صنعتیں استعمال کی گئیں تھیں۔

بہادر شاہ ظفرؔ نے اس قصیدے پر اُن کو سلطان الشعرا یا ملکِ الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ اور اُن کی

تنخواہ کو آگے بڑھا کر سو (۱۰۰) روپے ماہوار تک پہنچادیا تھا جو اُس دور زندگی میں ایک بڑا وثیقہ تھا۔

ذوقؔ جشنِ سالگرہ،جشنِ تخت نشینی، جشنِ نوروز اور دوسرے مبارک مواقع پر قصیدہ ہائے تہنیت پیش کرتے تھے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کی شدید بیماری کے بعد صحت یابی کے موقعے پر انھوں نے اپنا معروف قصیدہ

زہے نشاطِ اگر کیجیے اسے تحریر

پیش کیا۔اس میں فنِ طب کی بہت اصطلاحیں آئی ہیں۔ویسے بھی یہ ذوقؔ کے بہترین قصائد میں سے ہے۔اُن کا آخری بڑا قصیدہ وہ ہے جو اِس مصرعے سے شروع ہوتا ہے

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خواب راحت

اس قصیدے کی نگارش کے وقت اُن پر علم و فن اور شعر و سُخن کا یہ کہیے کہ نشہ چھایا ہوا تھا۔ اس قصیدے میں انھوں نے اگر غور کیا جائے تو اٹھارہ علوم کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں یہ معمولی بات نہیں ہے کہ ایک شاعر کی نظر اتنے علوم پر ہو کہ وہ اُن کی اصطلاحوں کو صحت کے ساتھ اپنے قصیدے میں استعمال کر سکے اور اُس کا قصیدہ آیندہ کے لیے اپنے زمانہ کی علمی و ادبی فضاء کا اشاریہ بن جائے۔وقت کے ساتھ ہمارا ادبی ذوق بدلتا ہے۔فنّی سطح پر پسند و ناپسند کے معیار بدلتے ہیں اور اسی نسبت سے قدیم شعراءاُدباءاور علما کے بارے میں ہمارا زاویۂ نگاہ بدلتا ہے۔ذوقؔ کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ اپنے زمانہ کا یہ اتنا بڑا صاحبِ فکر و فن انسان اور شعر و ادب کی دنیا کا ایک منارۂ روشن ہماری نگاہوں سے اپنی عظمتوں کے ساتھ اوجھل ہوتا چلا گیا۔ آج نہ اُس کا کمال ہماری نگاہوں میں ہے اور نہ اُس کا کلام۔ مگر ہم اس کو نہیں بھول سکتے کہ وہ ہمارے شعر و ادب کی تاریخ کا ایک بڑا جواہر ہے۔

ظفرؔ اور داغؔ جیسے اُس کے شاگرد آیندہ کے لیے کلاسیکی شاعری کی توسیعات کا حصّہ بن گئے اور مولانا محمد حسین آزادؔ جیسا بے مثال ادیب اور انشا پرداز اُسی کے حلقہ تربیت کی ایک زندہ اور پایندہ یادگار کے طور پر ہمارے سامنے آیا اور آج وہ سامنے ہے۔

خلیق انجم

ذوقؔ اور غالبؔ کے ادبی معرکے

غالبؔ کے تین اہم اور قابلِ ذکر ادبی معرکے ہوئے تھے۔ اردو کا معرکہ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے ساتھ ہوا تھا۔ چوں کہ ذوقؔ بہادر شاہ ظفرؔ کے استاد تھے' اس لیے یہ معرکہ تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں آیا۔ فارسی کا پہلا معرکہ کلکتے میں اس وقت ہوا جب غالبؔ اپنی پنشن کے سلسلے میں کلکتے گئے ہوئے تھے۔ وہاں کے ایک مشاعرے میں غالب کے ایک شعر پر لوگوں نے اعتراضات کیے اور سند کے طور پر قتیلؔ کا یہ شعر پیش کیا

جز از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موے کہ بتاں را ز میاں بر خیزو

یہ معرکہ کچھ ہی دن چلا' لیکن غالبؔ تمام زندگی قتیلؔ کو گالیاں دیتے رہے۔ دوسرا فارسی کا معرکہ قاطع برہان کے سلسلے میں ہوا' جس کی تفصیل غالب کے مداحوں کو معلوم ہے۔ ان معرکوں کا اثر غالب پر یہ ہوا کہ وہ ہندوستان کے تمام شاعروں' ادیبوں اور فرہنگ نگاروں کی شاعری اور فارسی دانی کے یکسر منکر ہوگئے۔ اسی لیے انھوں نے ہندوستان کے فارسی شاعروں اور لغت نگاروں کو قرم ساق' غول بیابانی' خرانِ نا مشخص' گدھا' ولد الزنا' کھتری بچہ' بھاٹ اور ہیچ دپوچ جیسے نازیبا الفاظ سے یاد کیا۔ غالبؔ نے چودھری عبد الغفور سرورؔ کو ایک خط لکھا ہے

"ہندوستان کے سخن وروں میں امیر خسرو کے سوا کوئی مسلم الثبوت نہیں۔"

غالبؔ کا خیال تھا کہ ہندوستان میں صرف دو قابل ذکر فارسی شاعر پیدا ہوئے ہیں ایک امیر خسرو اور دوسرے وہ خود۔

ہندوستان کے فارسی شاعروں ' ادیبوں اور لغت نویسوں کے ادبی کارناموں کے ساتھ غالبؔ کے حقارت آمیز رویّے کی داستان خاصی طویل ہے۔ میرا خیال ہے کہ غالبؔ کا یہ رویہ ادبی اور علمی سے زیادہ نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ غالبؔ کے تمام معرکوں کا اس نقطۂ نظر سے بھی مطالعہ کیا جائے۔

میں یہاں غالبؔ اور ذوقؔ کے ادبی معرکہ کی تفصیلات پیش کر رہا ہوں۔

ذوقؔ ۲۲/اگست ۱۷۹۰ء میں پیدا ہوئے تھے اور غالبؔ ۲۷/اگست ۱۷۹۷ء میں۔ اس کا مطلب ہے کہ غالبؔ ذوقؔ سے عمر میں تقریباً آٹھ سال چھوٹے تھے۔ غالب نے ۱۲۲۶ھ یعنی ۱۸۱۲ء ۱۳ء میں دہلی میں سکونت اختیار کی۔ اس وقت ان کی عمر لگ بھگ پندرہ سال تھی اور شعر گوئی کے میدان میں قدم رکھے ہوئے انھیں چار پانچ سال ہی ہوئے تھے۔ حکیم ثناءاللہ خاں فراقؔ ' حافظ عبدالرحمٰن خاں احسانؔ ' میر قمرالدین منتؔ ' مرزا عظیم بیگ عظیمؔ ' میر نظام الدین ممنونؔ ' حکیم قدرت اللہ قاسمؔ وغیرہ اکبر شاہ ثانی کی بزم کی رونق تھے۔ بہادر شاہ ظفر نوجوان تھے اور ولی عہد ہونے کے مدّعی۔

غالبؔ کے ادبی معرکوں کی بنیاد اکبر شاہ ثانی کے دربار میں پڑی تھی۔ اس وقت غالبؔ کی عمر ستائیس سال تھی اور انھیں دہلی میں مستقل سکونت اختار کیے ہوئے بارہ سال ہو چکے تھے۔ یہ واقعہ ہے ۱۸۲۴ء کا۔ غالبؔ نے اکبر شاہ ثانی کے فرزند مرزا سلیم کی مدح میں کئی شعر کہے۔ اس مدح کا پس منظر یہ ہے کہ اکبر شاہ ثانی کے گیارہ بیٹے تھے۔ ان میں بہادر شاہ ظفر سب سے بڑے تھے۔ عام قاعدے کے مطابق انھیں ولی عہد مقرر ہونا چاہیے تھا لیکن اکبر شاہ ثانی ان کے بجائے اپنے تیسرے بیٹے میرزا جہانگیر کو ولی عہد مقرر کرنا چاہتے تھے۔ جب ۳۱ سال کی عمر میں ۱۸۲۱ء میں میرزا جہانگیر کا انتقال ہو گیا تو اب بادشاہ نے چوتھے بیٹے میرزا سلیم کے لیے کوشش شروع کر دی۔ ولی عہدی کے اس جھگڑے نے قلعے میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ اکبر شاہ ثانی مستقل کوشش کر رہے تھے کہ بہادر شاہ کو ان کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ظفر پر یہ الزام لگایا کہ شاہ عالم کے زمانے میں ظفر نے بادشاہ کی ایک بیگم کی عصمت دری کی تھی۔ بقول اسپیئر کم سے کم دو بار میرزا جہانگیر نے بہادر شاہ ظفر کو زہر دے کر مارنے کی کوشش کی تھی۔ جب اکبر شاہ ثانی میرزا سلیم کو ولی عہد

بنانے کی کوشش کر رہے تھے تو غالبؔ کو ضرور خیال ہوا ہوگا کہ آخر ہوگا وہی جو بادشاہ چاہتے ہیں، یعنی میرزا سلیم ولی عہد اور پھر بادشاہ بنیں گے۔ اسی خیال کے تحت انھوں نے قصیدے میں نہ صرف شہزادہ سلیم کی تعریف کی بلکہ یہ ثابت کیا کہ اس کی تربیت اس انداز سے کی گئی ہے کہ مغل تخت و تاج کے وارث ہونے کا حق صرف انھیں کو پہنچتا ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ اکبر شاہ یا شہزادہ سلیم نے خود فرمائش کر کے یہ قصیدہ لکھوایا ہو تاکہ انگریزوں کی رائے کو متاثر کیا جا سکے۔ اس قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زہے مناسبتِ طبعِ شاہزادہ سلیم
بفیضِ تربیتِ پادشاہِ ہفت اقلیم

نہ مہر و ماہ و لیکن چو مہر و ماہِ منیر
نہ ابرو بحر، ولیکن چو ابرو بحرِ قسیم

ہمش بہ بار گہِ ناز زہرہ خنیاگر
ہمش در انجمن راز، تیر چرخ ندیم

ستودہ ایست بنازش بپادشاہِ انیس
ستارہ ایست بتابش، بہ آفتاب سہیم

خدایگانِ سلاطیں محمد اکبر شاہ
نہ کرد گار، ولیکن چو کردگار کریم

خلیفۂ حق و صاحبقرانِ روے زمیں
بدیں مباہی و در دہر واجب التعظیم

یہ ممکن نہیں کہ اس قصیدے سے بہادر شاہ کبیدہ خاطر نہ ہوئے ہوں۔ غالبؔ نے یہ قصیدہ ۱۸۳۴ء میں پیش کیا اور تھوڑے ہی دن بعد انگریزوں نے بہادر شاہ کو ولی عہد مقرر کر دیا۔ ۲۸/ستمبر ۱۸۳۷ء کو اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہوا اور دوسرے ہی دن بہادر شاہ کی تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی۔ غالبؔ نے میرزا سلیم کی مدح کر کے جو غلطی کی تھی، اس کی سزا انھیں کافی

عرصے تک ملی۔ غالبؔ کے ساتھ ظفرؔ کا جو رویہ رہا تھا' اس کا صحیح اندازہ ذوقؔ اور غالبؔ کے تعلقات کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔

ظفرؔ نہ صرف شاعروں کی سرپرستی کرتے تھے' بلکہ خود بھی شاعر تھے۔ دہلی میں غالبؔ کے مستقل سکونت اختیار کرنے سے دو سال پہلے مطبع سلطانی قلعہ معلا دہلی سے ظفرؔ کا پہلا دیوان شائع ہو چکا تھا۔ ظفر شاہ' نصیرؔ' عزت اللہ عشقؔ اور میر کاظم حسین بے قرارؔ کے شاگرد رہ چکے تھے۔ غالباً ۱۲۳۲ھ کے لگ بھگ' یعنی غالبؔ کے دہلی آنے سے تین سال قبل بہادر شاہ ظفرؔ تک ذوقؔ کی رسائی ہو چکی تھی۔ اس کا امکان ہے کہ ذوقؔ کو ۱۲۲۵ھ سے قبل بہادر شاہ ظفرؔ سے قربت ضرور حاصل ہو گئی تھی۔

اس وقت غالبؔ اتنے کم عمر تھے کہ ان کا اکبر شاہ ثانی کے دربار سے متوسل ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اس کا بھی امکان ہے کہ آگے چل کر غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کی محفلوں میں باریاب ہونے کی کوشش کی ہو' لیکن غالبؔ کی مخصوص اُفتادِ طبع' مزاج' شعری اور شاعری میں اندازِ گفتار یہ سب ان کے راستے میں رُکاوٹ بنے ہوں گے۔ یہ وہ زمانہ تھا' جب قلعے اور شہر کے لوگ غالبؔ اور ان کے کلام سے بہت کم واقف تھے۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفرؔ کی شعری محفلوں میں غالبؔ کی رسائی کے راستے میں ایک اور رکاوٹ کا امکان ہے۔ وہ رکاوٹ یہ تھی کہ غالبؔ کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے ۱۸۰۳ء میں آگرے کا قلعہ لارڈ لیک کے سپرد کردیا گیا تھا۔ نصر اللہ بیگ کی وفات کے بعد ان کے جن وارثوں کو پنشن ملتی تھی' ان میں غالبؔ بھی شامل تھے۔ عین ممکن ہے کہ اس بنیاد پر غالبؔ کی مخالفت ہوئی ہو اور غالبؔ کو قلعے میں داخل نہ ہونے دیا گیا ہو۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ظفرؔ کی محفل میں غالبؔ کی رسائی نہ ہو سکی۔

اردو میں ایسے شاعروں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو پہلے فارسی میں شعر کہتے تھے اور پھر اردو میں کہنے لگے۔ لیکن ایسے شاعروں کی تعداد کم ہے جنھوں نے شعر گوئی کا آغاز اردو سے کیا اور بعد میں فارسی میں آگئے۔ غالب اسی قبیل کے شاعر تھے انھوں نے اردو میں شعر گوئی کا آغاز کیا اور پھر فارسی میں شعر کہنے لگے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس تبدیلی کی ایک وجہ ذوقؔ سے معاصرانہ چشمک بھی تھی۔ ذوقؔ کو فارسی پر وہ قدرت حاصل نہیں تھی جو غالبؔ کو تھی۔ اس لیے انھوں نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں جو قصیدے کہے تھے وہ اردو میں تھے' جب

کہ غالب نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں فارسی میں قصیدہ کہا۔ غالب بتانا چاہتے تھے کہ ان کا اصل مقام فارسی میں ہے نہ کہ اردو میں۔ اسی لیے انھیں ذوق اور اپنے دوسرے معاصرین پر فوقیت حاصل ہے۔

ذوق نے شہزادہ سلیم کی شادی کے موقعے پر جو قصیدہ لکھ کر اکبر شاہ ثانی کی خدمت میں پیش کیا تھا' اس میں یہ شعر بھی شامل تھا

مدحِ حاضر کے لیے حاضرِ دربار ہو ذوق
تو ہے خاقانیِ ہند' اور وہ خاقانِ زماں

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ذوق کو اکبر شاہ ثانی نے خاقانیِ ہند کا خطاب دیا تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرے "گلشن بے خار" مصنفہ ۱۸۳۵ء میں لکھا کہ اکبر شاہ ثانی نے ذوق کو خاقانیِ ہند کے خطاب سے نوازا تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس شعر میں خاقانیِ ہند محض تعلّی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ بادشاہ نے یہ خطاب دیا تھا یا نہیں۔ بہر حال یاں' ذوق کو لوگ خاقانیِ ہند کہنے لگے تھے۔ غالب کے ایک طویل قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ یہ قصیدہ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہے

بالد بخویش خواجہ ' چوگوی سخن ورش
غافل کہ ایں ترانہ ' بہ بہتاں برابر است

نے ہر ترانہ سنج نکیسا نوا بود
نے ہر سخن سرائے ' بہ سحباں برابر است

نے ہر شتر سوار' بہ صالح بود ہمال
نے ہر شباں' بموسیِ عمراں برابر است

نے ہر کہ گنج یافت ' زپرویز گوے بُرد
نے ہر کہ باغ ساخت' بہ رضواں برابرست

گفتی کہ این و آں بود از نطق مایہ در
ایں در شمارِ شیوہ نہ با آں برابر است

گیرم کہ ہر گیا برد از ابر و باد فیض
خر زہرہ کے بسنبل و ریحاں برابر ست

امروز من نظامی و خاقانیم بہ دہر
دہلی زمن بہ گنجہ و شرواں برابرست

ان اشعار میں غالبؔ نے کہیں ذوقؔ کا نام نہیں لیا، لیکن ظفرؔ کو مخاطب کر کے اگر غالبؔ کسی سخن ور سے اپنا مقابلہ کریں تو وہ ذوقؔ کے سوائے اور کون ہو سکتا ہے۔ پہلے شعر میں غالبؔ نے کہا ہے کہ خواجہ یعنی ذوقؔ سے جب لوگ اس کی شاعری کی تعریف کرتے ہیں تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور نہیں جانتا کہ لوگ اس کی تعریف نہیں بلکہ اس پر بہتان باندھتے ہیں۔ ان اشعار میں غالبؔ نے یہ ثابت کیا ہے کہ شاعری کے فن میں ذوقؔ کا مرتبہ ان سے کم تھا۔ ظاہر ہے کہ ان اشعار کا ذوقؔ کے شاگرد ظفرؔ پر اچھا اثر نہیں ہوا ہوگا۔ غالبؔ کو فخر تھا کہ ان کا اصل میدان فارسی ہے۔ انھوں نے ایک فارسی قطعے میں اپنی فارسی گوئی پر فخر کرتے ہوئے ذوقؔ پر چوٹ کی ہے۔ ۱۹ اشعار کے اس قطعے میں ذوقؔ کو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں

اے کہ دربزمِ شہنشاہ سخن رس گفتہ
کے بہ پر گوی فلاں در شعر ہمسنگِ منست

راست، لیک میدانے کہ نبود جاے طعن
کمتر از بانگِ دہل گر نغمہ چنگِ منست

نیست نقصاں یک دو جزو است از سوادِ ریختہ
کاں و ثم برگے ز نخلستانِ فرہنگِ منست

فارسی بیں، تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بیرنگِ منست

فارسی بیں تابدانی کاندر اقلیمِ خیال
مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارتنگِ منست

کہ درخشد جوہر آیینہ تا باقیست زنگ

صیقلِ آیینہ ام ایں جوہر، آں زنگِ منست

مقطعِ ایں قطعہ زیں مصرع باد و بس

"ہرچہ در گفتار فخر تست، آں ننگِ منست"

غالب اور ذوق میں براہ راست ادبی معرکہ جواں بخت کے سہرے پر ہوا تھا۔ لیکن کبھی کبھی غزل کی رمزیت کا سہارا لے کر دونوں ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے تھے۔ ذوق کی پوری شاعری میر کی داخلیت کی نفی کرتی ہے۔ اس پس منظر میں غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہیں جو معتقدِ میر نہیں

ظاہر ہے غالب نے ناسخ کے مصرعے کو بے وجہ تضمین نہیں کیا۔ ذوق جواب دیتے ہیں۔

نہ ہوا پر نہ ہوا، میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالب ۴/جولائی ۱۸۵۰ء کو خاندانِ مغلیہ کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے۔ اس سے تھوڑی مدت بعد انھوں نے ایک غزل کہی جس کے چند شعر ہیں

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے؟" تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟
مزہ تو جب ہے کہ اے آہِ نار سا ہم سے وہ خود کہے کہ "بتا تیری آرزو کیا ہے"؟
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے؟
رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے؟
ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

یہ غزل دیوانِ غالب کے پہلے (اڈیشن مطبوعہ ۱۸۴۵ء) اور دوسرے اڈیشن مطبوعہ ۱۸۴۷ء) میں شامل نہیں ہے۔ اور پھر غالب کے لیے اس مفہوم کا مقطع اس وقت تک کہنا ممکن نہیں تھا جب تک کہ وہ خود ظفر کے ملازم نہ ہوئے ہوتے۔ کیوں کہ بادشاہ کے استاد پر اتنی کھلی چوٹ کرنا غالب کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ یہ غزل ۱۸۵۰ء کے بعد اس زمانے میں کہی گئی، جب غالب بہادر شاہ ظفر کی ملازم ہو چکے تھے۔ مطلع اور

دوسرے شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ ظفرؔ کے بے اعتنائی کی شکایت کر رہے ہیں۔ تیسرے شعر میں بڑی چابک دستی سے ذوقؔ پر چوٹ کی گئی ہے۔ چوتھے شعر میں روئے سخن ذوقؔ ہی کی طرف معلوم دیتا ہے۔ اور مقطعے میں تو ظاہر ہے کہ ذوقؔ سے ہی خطاب کیا گیا ہے۔

غالبؔ اور ذوقؔ کے درمیان سہرے پر ایک معرکے کے سوااور کوئی معرکہ براہِ راست نہیں ہوا۔

بہادر شاہ ظفرؔ کے فرزند جواں بخت کی شادی اپریل ۱۸۵۲ء میں ہوئی۔ جواں بخت کی والدہ زینت محل نے فرمائش کر کے غالب سے سہرا لکھوایا۔ محمد حسین آزاد نے "دیوان ذوقؔ" کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

> "نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جواں بخت ان کے بیٹے تھے اور باوجود یہ کہ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے مگر بیگم کی خاطر سے ان کی ولی عہدی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ ان کی شادی کا موقع آیا بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے۔ بیگم کی ایما سے غالب مرحوم نے یہ سہرا کہہ کر زرنگار کاغذ پر لکھ کر' ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں گزارنا۔" (دیوان ذوق' ص ۲۵۷)

چوں کہ قلعے میں بیگم زینت محل اور جواں بخت کی خاص مخالفت تھی اس لیے دربار کے کچھ لوگوں نے بہادر شاہ ظفر کے کان بھرے ہوں گے اور جب بہادر شاہ ظفر نے غالب کا مقطع سنا

ہم سخن فہم ہیں ' غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں ' اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

ظفرؔ کو یہ شاعرانہ تعلّی ناگوار گزری۔ مولانا محمد حسین آزاد نے بہادر شاہ ظفرؔ کی ناراضگی کا حال اپنے مخصوص انداز میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے

> "جب سہرا ملاحظہ فرمایا تو مقطعے کو دیکھ کر حضور کو بھی خیال' بلکہ ملال ہوا۔ استاد مرحوم جو حسب معمول حضور میں گئے' تو وہ سہرا دیا کہ استاد' اسے تو دیکھو! انھوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی۔ پیرو

مرشد اور ست۔ بادشاہ نے کہا تم بھی ایک سہرا کہہ دو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا ابھی لکھ دو اور کہا مقطع کو بھی دیکھا؟ عرض کی، حضور دیکھا۔"

ذوق نے غالب کے مقطعے کا جواب دیا

جن کو دعویٰ ہو سخن کا، یہ سنادو ان کو
دیکھو، اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

(دیوان ذوق، ص ۲۵۸)

بڑی کوششوں کے بعد تو غالب کی مغل دربار تک رسائی ہوئی تھی۔ اب معاملات بگڑتے نظر آئے۔ غالب نے فوراً ہی ایک قطعہ معذرت بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں، اور مرا مسلک ہے صلحِ کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں؟ — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استادِ شہ سے ہو، مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے، شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ؟ ہاں اس سے مدعا — جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو، تو روسیاہ — سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں، غالب خدا گواہ! — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اس قطعے کا یہ شعر خاص طور سے قابلِ غور ہے

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری، ذریعہ، عزت نہیں مجھے

شعر کا پس منظر یہ ہے کہ ذوق کے حسب و نسب کے بارے میں ان کے معاصر تذکرے خاموش ہیں۔ لالہ سری رام نے اپنے تذکرے خمخانہ جاوید میں لکھا ہے کہ ذوق کے خاندان

کے لوگ اب بھی دہلی میں جراحی کا پیشہ کرتے ہیں۔ ذوقؔ کے خاندان کے لوگوں کا پیشہ جراحی ہو یا نہ ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ذوقؔ کسی بڑے خاندان سے نہیں تھے۔ اس لحاظ سے اس شعر میں ذوقؔ کے حسب و نسب پر گہرا طنز ہے۔ غالبؔ نے یہ واقعہ نواب انور الدولہ بہادر شفق کو بڑے درد انگیز الفاظ میں لکھا ہے۔ یہ خط فارسی میں ہے۔ میں اس کا ترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی کتاب "اوراق معانی" سے پیش کر رہا ہوں۔

"ایک زمانہ ہو گیا کہ میں دستاں سرائی سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ یہ شہریارِ سلیماں پیش کار (شاہِ دہلی) کی رضا جوئی کے باعث ہے کہ میں گاہ گاہ ریختہ گوئی کی طرف مائل ہوتا ہوں خاص طور پر یہ ملکہ عالیہ '(کہ ملکہ سبا بلقیس' جس کی کنیزوں میں ہے) کی فرمائش کی تعمیل کے سبب (صورت پذیر) ہوتا ہے۔ اس ردیف ناروا کے ساتھ ورنہ مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

مگر مقطعہ غزل میں میں نے ایک نعرہ مستانہ کے طور پر "ہو" کی ہوگی کہ اس شخص نے اپنے اس کمال کے زعم میں جو دراصل اسے حاصل ہی نہ تھا' یہ خیال کیا کہ میرا روئے سخن اس کی طرف ہے ایک غزل کے مقطعے میں ستیزہ کاری و تقاضہ سنجی کے انداز میں گام فرسائی کی اور اس لہجے میں بات کی 'گویا وہ مجھے اس کا جواب دے رہا ہے' تو میں نے یہ مستی کے عالم میں جو جرعے کہ میرے خامہ بے پروا خرام کے رشحات ہیں محفل سخن میں پیش کیے۔

یہ مصرعہ "آنچہ در گفتار' فخر تست آں ننگ من ست" اسی سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا اور اس طرح قطعِ سخن کو دلیل قطعِ اغیار سمجھا"۔[1]

اس معذرت کے باوجود غالبؔ سے بہادر شاہ ظفرؔ کا دل صاف نہیں ہوا۔ غالبؔ نے جواں بخت کی شادی کے سلسلے میں بیس اشعار کا ایک اور فارسی قصیدہ بہادر شاہ ظفرؔ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس قصیدے کا مقطع و مطلع حسبِ ذیل ہیں

بہار در چمن اندازِ گلفشانی کرد
بشاخِ نخلِ تمنا ثمر مبارک باد
ترا بقا و بقارا سعادت ارزانی
مرا دعا و دعا را اثر مبارک باد

معلوم ہوتا ہے کہ قطعہ اور اس قطعے کا بہادر شاہ ظفرؔ پر خاطر خواہ اثر نہیں ہوا اور وہ "غالبؔ سے بدستور کبیدہ خاطر رہے۔ تقریباً چھ مہینے بعد یعنی اکتوبر ۱۸۵۲ء میں بہادر شاہ ظفرؔ کی سال

گرہ پر غالبؔ نے فارسی میں چالیس اشعار کا ایک قصیدہ کہہ کر پیش کیا۔ جس میں یہ اشعار بھی شامل تھے

ردیف شعر از آں کروم اختیار گرہ
کہ از من است برابر وی شہر یار گرہ
ایا شہنشہِ کشور کشای دشمن بند
زبندہ ، درِ خم ابرو روا مدار گرہ
کنم بیزمِ تو سازِ غزل بلند آواز
فگندہ است بدل طرحِ خار خار گرہ
بدلکشایی گفتارِ من کہ غالبؔ را
مزن برشتۂ امید زینہار گرہ

۱۵/نومبر ۱۸۵۴ء کی رات کو ذوقؔ کا انتقال ہو گیا۔ اگر چہ ذوقؔ اور غالبؔ کا دل صاف نہیں تھا، لیکن انہوں نے ذوقؔ کی وفات پر دو قطعے کہے۔ پہلا قطعہ دہلی اردو اخبار کے ۱۹/نومبر ۱۸۵۴ء کے شمارے میں شائع ہوا

تاریخِ وفات ذوقؔ، غالبؔ
باخاطر درد مند و مایوس
خوں شد دلِ زار تا نوشتم
خاقانیِ ہند مرد افسوس

دوسرا قطعہ یہ تھا

گویند رفت ذوق ز دنیا ستم بود
کاں گوہر گراں، بہ تہِ خشت و گل نہند
تاریخ فوت شیخ بود "ذوقِ جنتی"
بر قولِ من رواست کہ احباب دل نہند

کچھ ہی دن بعد ایک اچھے انسان کی طرح غالبؔ نے ذوقؔ کی طرف سے اپنا دل صاف کر لیا۔ انھوں نے ۲۳/نومبر ۱۸۵۴ کو منشی نبی بخش حقیر کے نام خط میں لکھا

"یہاں کا حال تازہ یہ ہے کہ میاں ذوقؔ مر گئے حضورِ والا نے ذوق شعر و سخن ترک کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شخص اپنی وضع کا ایک اور اس عصر میں غنیمت تھا۔"

عابد پیشاوری

ذوق کے خطابات

دیوانِ ذوق مرتبہ مولانا محمد حسین آزاد کے سرورق پر ذوق کا نام اس طرح چھپا ہے "ملک الشعراء خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق"۔ آزاد سے پہلے دیوان کو ان کے چند شاگردوں نے مل کر مرتب اور شائع کیا تھا اس کا مقدمہ (یا خاتمہ) امراؤ مرزا انوار شاگردِ ذوق نے لکھا تھا۔ اس میں دوق کا مام بے شمار تعریفی و تعظیمی کلمات کے ساتھ درج ہوا ہے۔ آخری جز اس طرح ہے "اوستادِ حضرت بادشاہ، بادشاہ ظل اللہ فلک پایگاہ، کیواں جاہ المسمی بہ شیخ محمد ابراہیم المتخلص بہ ذوق، الملقب بہ ملک الشعراء خاقانی ہند"۔ ان دونوں تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوق ملک الشعراء خاقانی ہند الملقب تھے۔ ملک الشعرا خاقانی ہند ایک خطاب بھی ہو سکتا ہے اور دو بھی (لقب البتہ ہم نہیں سمجھتے کہ ہو سکتا ہے۔ کتبِ قواعد کے برعکس بیانات کے باوجود ہمارے خیال میں لقب انسان خود اختیار کرتا ہے اور خطاب دوسروں کی طرف سے دیا جاتا ہے) اب سوال یہ ہے کہ کیا ذوق کو یہی خطاب یا خطابات ملے تھے یا کچھ اور؟ نیز ملے بھی تھے یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر واقعی انھیں کوئی خطاب ملا، تو کس نے دیا تھا؟ کبھی کبھی شہرت و ناموری تحقیق کے رستے کا روڑا بن جاتی ہے۔ ذوق اس کی واقعی مثال ہیں۔

یہ معلوم ہے کہ ذوق ساری زندگی بہادر شاہ ظفر سے متعلق رہے۔ وہ یک درگیر و محکم گیر پر عامل معلوم ہوتے ہیں۔ خطاب عموماً اسی کو مانا جاتا رہا ہے جو کسی دربار کی طرف سے عطا ہوا ہو۔ اس لحاظ سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ذوق کو بھی بہادر شاہ نے کوئی خطابات عطا کیے ہوں گے، لیکن اس سلسلے میں جو کچھ مواد اب تک دستیاب ہوا ہے، اس سے اس قیاس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ ذوق کا انتقال ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء میں ہوا۔ ان کے انتقال کے فوراً بعد مولوی محمد

باقر، والدِ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے اخبار کا ایک تتمہ نکالا تھا، اس کا بیان ہے:

> "علاوہ قصائد سابقہ کے ایک قصیدہ مدحِ اعلیٰ حضرت میں کہہ کر پڑھا جس میں صنائع بدائع متکاثرہ استعمال کی گئی تھی (کذا) علاوہ بریں ایک عجیب و غریب صنعت اس میں یہ تھی کہ شعر اٹھارہ زبانوں میں تھے۔ ہر ایک شعر ہر ایک بولی میں علاحدہ تھا (کذا) مثلاً فارسی، عربی، ترکی، حبشی، پشتو، پنجابی، بھاشا، شاستری، مارواڑی، بنگالی، میسور، جھنگ، سیالہ، انگریزی، جرمنی، لاطینی، فرانسیسی وغیرہ کہ ان شاء اللہ واسطے ملاحظہ ناظرین کے درج اخبار کیا جائے گا جس پر خطاب خاقانی ہند ملا"۔

اس بیان میں کئی باتیں توجہ طلب ہیں (I) ذوق نے ایک قصیدہ بہادر شاہ کی مدح میں کہہ کر پڑھا (بادشاہ کے نام کی صراحت نہیں کی گئی تاہم قرائن مشعر ہیں کہ نامہ نگار صریحاً بہادر شاہ ظفر کا ذکر کر رہا ہے) جس میں مختلف صنائع بدائع کے علاوہ ایک صفت یہ بھی تھی کہ اس میں ۱۸ شعر مختلف زبانوں میں کہے گئے تھے اور ہر زبان کا شعر علاحدہ تھا۔ (II) اس پر خطاب خاقانی ہند ملا تھا۔ (III) قصیدہ 'مذکور' تب تک شائع نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ باتیں سب درست نہیں معلوم ہوتیں۔ مثلاً قصیدہ ۱۸ زبانوں میں تھا اور اخبار میں ان کے نام بھی دیے گئے ہیں۔ جن میں ایک بھاشا ہے، ایک شاستری، ایک میسور، ایک جھنگ اور ایک سیالہ۔ یہ کون سی زبانیں ہیں؟ بھاشا اور شاستری سے تو چلیے ایک سے ہندی ایک سے سنسکرت مراد لے لیجیے مگر میسور، جھنگ اور سیالہ زبانوں کے نام نہیں۔ میسور ایک مقام ہے اور جھنگ سیال یا سیالہ بھی پنجاب میں ایک جگہ ہے۔ ہیر یہیں کی رہنے والی تھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد پنجابی ہے، لیکن فہرست مذکور میں پنجابی کا نام پہلے سے موجود ہے۔ یہاں ایک علاقے اور ایک مقام کو دو میں بانٹ کر مختلف زبانیں قرار دے دیا گیا ہے اور اس طرح زبانوں کی تعداد میں ایک اضافہ کر لیا گیا ہے لیکن اس سب کے باوجود تعداد ۱۷ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس طرح یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ قصیدہ ۱۷ زبانوں میں تھا یا ۱۸ زبانوں میں علاوہ ازیں عقیدت مندی نے منطق کی آنکھوں کو یکسر بند کر دیا ہے اور 'مبالغہ غلو' سے بھی کچھ آگے نکل گیا ہے۔ مثلاً ذوق کا جرمنی، لاطینی اور فرانسیسی میں شعر کہنا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کی تصدیق نہ داخلی شواہد سے ہوتی ہے نہ خارجی ذرائع سے۔ ۱۷ اور ۱۸ کی گتھی کچھ اور الجھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ آزاد نے اپنے مرتبہ دیوانِ ذوق میں جہاں خاقانی ہند کا خطاب ملنے کی بات کہی ہے وہاں لکھا ہے: "چند سال کے بعد (مرزا سلیم کی شادی کے)

ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ کر سنایا کہ جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع و بدائع صرف کیے تھے۔ اس کے علاوہ ایک زبان میں جو ایک ایک شعر تھا (کذا) ان کی تعداد ۱۸ تھی۔ مطلع اس کا یہ ہے " مولانا آزاد کا بیان اگرچہ اخبار ہی سے ماخوذ ہے (عجب نہیں کہ اخبار کا بیان بھی اصلاً خود انھیں کا ہو) لیکن انھوں نے اس میں جو خامیاں نظر آئیں، اپنی دانست میں، انھیں سدھارا بھی ہے اور اس پر اضافہ بھی کیا ہے۔ مثلاً اخبار کے بیان سے صریحاً بہادر شاہ کی مدح میں قصیدہ کہہ کر پڑھنے کا قرینہ نکلتا تھا، لیکن آزاد کو معلوم تھا کہ خاقانی ہند کا خطاب ظفر نے نہیں دیا۔ لہٰذا انھوں نے اسے اکبر شاہ سے منسوب کر دیا اور یہ خیال نہیں کیا کہ اکبر شاہ ثانی کے دربار سے وابستگی کو لوگ شبہے کی نظر سے دیکھیں گے، خصوصاً خود ان کے اپنے بیانات کی روشنی میں۔ آزاد ہی کا قول ہے کہ اکبر شاہ ثانی کو شعر سے مطلق شوق نہ تھا۔ (یہ بیان بھی عجیب ہے۔ آزاد کو اس کا علم تو ہو گا کہ اکبر شاہ ثانی خود شاعر تھے اور باپ کے تخلص آفتاب کی رعایت سے شعاع تخلص کرتے تھے۔ غالباً آزاد کی مراد شعر اسے تھی) اس کے علاوہ اخبار میں قصیدے کا صرف ذکر تھا لیکن اس کا کوئی شعر درج نہیں تھا۔ آزاد نے نسخۂ ویران پر نظر ڈالی تو دو تین شعر ایسے نظر آئے جن پر قصیدۂ مذکور کا اطلاق ہو سکتا تھا۔ چناں چہ انھوں نے مطلع نقل کر دیا

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن آب وایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

یہ مطلع بہ اعتبارِ زبان کچھ غلط معلوم ہوتا ہے اس لیے اسے ذوق سے منسوب کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ ذوق ہی کا کہا ہوا ہے۔ اب اس کی تاویل سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ ذوق بھی آخر آدمی تھے اور غلطی سے کوئی آدمی مبرا نہیں۔ انھوں نے اس کی قباحت پر غور نہیں کیا ہو گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مطلع مذکور اردو میں ہے ترکی میں نہیں جیسا کہ "آب وایلولہ" کی ترکیب کے پیش نظر آزاد تاثر دینا چاہتے ہیں۔ تیسری بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ آزاد نے اخبار کی پیروی میں یہ تو لکھ دیا کہ قصیدے میں ۱۸ زبانیں استعمال کی گئی تھیں لیکن دیوان مرتب کرتے وقت نسخۂ ویران سے مندرجہ مطلع اور اس کے ساتھ دوسرے دو شعر لیے تو قصیدے کا عنوان بھی من و عن لے لیا۔ نسخۂ ویران کے آخر میں کچھ ایسا کلام درج ہے جس کے بعض اجزا متن مرتب ہونے کے بعد ہاتھ آئے یا جو غزلیں اور قصیدے نامکمل تھے، ان کے اشعار بھی اسی حصے میں درج کیے گئے ہیں۔ چناں چہ وہاں مذکورہ تین شعروں پر عنوان ہے "اشعارِ قصیدۂ ہفتدہ زبان، اور یہی عنوان آزاد نے اپنے مرتبہ دیوان میں لکھا ہے۔ اب مقدمے کا بیان درست مانا جائے یا قصیدے کا

عنوان؟ یہاں ایک الجھن اور پیدا ہوتی ہے۔ کیا ذوق نے قصیدۂ ہفدہ زبان مکمل کیا تھایا ۱۷ زبانوں میں قصیدہ کہنے کا محض ارادہ تھا؟ نسخۂ دیران میں ان قصیدوں یا غزلوں پر "ناتمام" لکھا ملتا ہے جو مکمل تو ہوئے لیکن حافظ ویرآن کو پورے شعر یاد نہیں تھے، خواہ ایسے اشعار کی تعداد صرف ایک ہی ہو۔ لیکن اس قصیدے پر "ناتمام" کا عنوان نہیں ہے۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ نسخۂ دیران تمام تر حافظ ویران کے حافظے پر مبنی نہیں ہے۔ مرتبین نے دوسرے ذرائع سے بھی کلام بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے جیسا کہ مقدمے میں تصریح کے علاوہ دیوان کے خاتمے پر تمت کے بعد اس التماس سے ظاہر ہے

> "التماس جو کہ اکثر جا دو تین شعر یا زائد پر ناتمام اور ایک پر شعر (کذا) یا فرد یا مطلع لکھا ہے اور بعض جا سلسلہ تحریر ردیف وار کا بھی نہیں رہا اور کہیں ایک دو شعر پہلے اور پھر اوسمیں کے آگے لکھے ہیں سبب اوسکا یہ ہے کہ جس وقت جو شعر بعد تحریر کاپی ہاتھ آیا لکھ دیا اور یہی حال غزلیا(ت کا) ہے"۔

اب اگر ہم یہ نتیجہ نکال بھی لیں کہ ذوق نے کوئی ایسا قصیدہ کہا تھا جس میں سترہ زبانیں تھیں تو بھی یہ ماننا ہو گا کہ ایک تو یہ قصیدہ اب موجود نہیں (بلکہ ماضی میں بھی نہیں تھا) دوسرے یہ کہ قصیدۂ مذکور کسی دربار میں پڑھا نہیں گیا۔ یہ بھی طے ہے کہ اس قصیدے پر خطاب خاقانی ہند نہیں ملا۔ اس قیاس کے کئی سبب ہیں لیکن پہلے یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ فی الوقت ایسا کوئی ذریعہ نہیں جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ قصیدۂ ہفدہ زبان (اگر مکمل ہو گیا تھا تو) کس کی مدح میں تھا۔ دیوانِ ذوق کا بالاستیعاب مطالعہ بتاتا ہے کہ ذوق وقتاً فوقتاً غزل کہتے ہوئے بھی، اگر کچھ قصیدے کے شعر ہو جاتے تھے، تو انھیں غزل ہی میں یا الگ سے درج کر کے رکھ لیتے تھے۔ تاکہ حسبِ موقع وضرورت قصیدہ مکمل کیا جا سکے۔ لہٰذا اگر انھوں نے سترہ زبانوں میں کوئی قصیدہ کہنا شروع کیا تھا تو کسی خاص تقریب، جشن یا عید کے موقعے پر کہا نہ کسی کی مدح میں۔ اب رہا یہ معاملہ کہ اس قصیدے پر خاقانی ہند کا خطاب نہیں ملا تو اس کے وجوہ حسبِ ذیل ہیں

(۱) اگر اس قصیدے پر خطاب ملتا تو حافظ ویرآن اس کا ذکر ضرور کرتے اور یہ قصیدہ ان کے ذہن سے حرفِ غلط کی طرح محو نہ ہو جاتا۔ مثلاً

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے گر اس میں زلفِ سرکش ہو

والی غزل کے ساتھ آزاد نے ایک افسانہ بھی منتھی کر دیا ہے جس کا ماخذ نسخۂ ویران کے حاشیے کا یہ نوٹ ہے "یہ غزلِ زمانۂ آغازِ سخن گوئی لکھی ہے"۔ اب ایسا اہم قصیدہ جس پر ایسا نادر خطاب ملا ہو، حافظ ویران کو اس کا علم نہ ہونا تعجب انگیز ہے، اور بھول جانا بھی۔ یعنی اس کا ایک شعر بھی حافظ صاحب کے حافظے میں نہ رہا اور تسوید دیوان کی تکمیل کے بعد کسی ماخذ سے اس کے تین شعر بہم پہنچا کر درج دیوان کیے گئے۔ (۱۱) انور نے اتنا طویل مقدمہ لکھا اور اس امر پر افسوس کا اظہار بھی نہ کیا کہ فلاں قصیدے پر خطاب ملا اور وہ نہ صرف یہ کہ ان کے، ظہیر و ویران کے حافظے سے محو ہو گیا بلکہ کسی دوسرے ذریعے سے بھی پورا قصیدہ بہم نہ پہنچا خصوصاً جب کہ حافظ ویران کے پاس ذوق کے بعض مسودات بھی تھے۔ (۱۱۱) ظہیر نے اسی زمانے میں نگارستانِ سخن شائع کیا جس میں غالب، مومن اور ذوق کے کلام کا انتخاب تھا۔ انھوں نے ۱۶ غزلیں خود کہہ کر ذوق کے کلام میں شامل کر دیں لیکن اس قصیدے کے باب میں خموشی اختیار کی۔ (۱۷) اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ بہادر شاہ کی مدح میں کہے گئے قصائد، خصوصاً شاہی کے بعد، ذوق کے قصیدے دلی اردو اخبار میں شائع ہوتے رہے اور مرتبین دیوان ذوق بشمولِ آزاد کو ان کا مکمل متن وہیں سے ہاتھ آیا یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اخبار بہادر شاہ کی مدح کے قصیدے پڑھے جانے کے معا بعد شائع کرے، وہ بھی جس پر جاگیر عطا ہوئی یا دیگر انعام واکرام ملے لیکن قصیدۂ مذکور کبھی شائع نہ ہو۔ اور ذوق کے انتقال کے بعد قصیدے کا ذکر اور اشاعت کا وعدہ کر کے رہ جائے۔ ذوق کے انتقال کے کم و بیش تین سال بعد تک اخبار جاری رہا لیکن اشاعت کا وعدہ کر کے رہ جائے۔ ذوق کے انتقال کے کم و بیش تین سال بعد تک اخبار جاری رہا لیکن اشاعت کا وعدہ کبھی وفا نہیں کیا گیا۔ (۷) کہا جا سکتا ہے کہ قصیدۂ مذکور اکبر شاہ ثانی کی مدح میں تھا اور انھیں کے دربار میں پڑھا گیا۔ چوں کہ اس کو اتنی مدت ہو گئی تھی اس لیے حافظ ویران وغیرہم کے حافظے سے نکل گیا یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت تک حافظ ویران وغیرہ ذوق کی شاگردی میں آئے ہی نہ ہوں۔ انور نے نسخۂ ویران کے آخر میں لکھا ہے کہ حافظ ویران "تابست سال ہمہ وقت و ہمہ ساعت باستحصالِ ہر نوع فیض خدمتِ اوستادِ مغفور سرمایہ اندوزِ سعادت گشتہ، تمامی کلامِ آں یگانۂ کشورِ سخن از زبانِ الہام ترجمان شنیدہ اکثر ازاں یاد کردند و اکثر رازیرِ خیال واشتند و بایں فیضان پایہ نغز گوئی و خوش فہمی بہم رسایند (جو باتیں انور نے حافظ ویران کے لیے کہی ہیں آزاد نے کم و بیش وہی اپنے لیے لکھی ہیں) ذوق کا انتقال ۱۲۷۱ھ میں ہوا۔ اس لیے حافظ ویران کی شاگردی کا زمانہ ۱۲۵۱ یا ۱۸۳۴ء قرار پاتا ہے۔ اس دور میں ظفر ولی عہد ہی تھے۔ ان کی شاہی میں ابھی دو تین سال کی دیر تھی۔ اب اگر قصیدۂ مذکور اس کے بعد کہا گیا تو حافظ ویران کو

اس کا قطعی علم نہ ہونا تعجب انگیز ضرور ہے۔ قصیدۂ مذکور کا اس سے پہلے کہا جانا بھی بوجوہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اول اس لیے کہ ظفرؔ کے عہدِ ولی عہدی میں اس پر خطاب ملنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دوم اس لیے کہ اگر ظفرؔ پہلے خاقانی ہند کا خطاب دے چکے ہوتے تو بادشاہ ہونے کے بعد اس سے کم پایہ خطاب کبھی نہ دیتے۔ (VI) قصیدے کا اکبر شاہ کی مدح میں کہا جانا اور انھیں کے دربار سے خطاب ملنا بھی بوجوہ ممکن نہیں۔ اول اس لیے کہ اکبر شاہ ثانی کے دربار تک ذوقؔ کی رسائی کا ذکر کسی معاصر یا مابعد تذکرے میں نہیں ملتا۔ ایسی کوئی روایت بھی نہیں بلکہ اس دور کے کسی شاعر کا تعلق اکبر شاہ ثانی کے دربار سے ثابت نہیں، کم از کم ہمارے علم میں نہیں۔ دوم اس لیے بھی کہ اگر آپ ذوقؔ کے مستند قصائد کا بالاستیعاب مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ابتدا میں ذوقؔ قصیدہ بھی بہت سیدھی سادی زبان میں (جس میں وہ غزل کہتے تھے) کہتے تھے۔ ان کی تحصیلِ علمی ۱۲۳۰ھ یا ۱۵۔۱۸۱۲ء کے بعد کا واقعہ ہے۔ مفتی صدر الدین آزردہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں

"امروز در قوتِ سخن گوئی در اقران و امثالِ خود ممتاز ہست و بہ جہتِ تکمیلِ فن شعر و اسانیدِ اغلاط قدم در واری تحصیل علومِ رسمیہ گزاشتہ از صرف و نحو فارغ شدہ قواعد منطق را یاد می کرد (کذا)"۔

یہ بیان اندازاً ۱۲۴۳ھ کا ہے جب ذوقؔ کی عمر ۲۷ برس کے لگ بھگ تھی۔ اس سے پہلے وہ امی محض نہ سہی، عالم بھی نہیں تھے۔ چناں چہ ان کے سارے کلام میں، ماسوا آخری دو تین برس کے، کہیں بھی علمیت کا نہ کوئی دعوا ملتا ہے نہ ثبوت۔ ۱۲۳۰ تک تو وہ ظفرؔ سے بھی وابستہ نہیں تھے۔ ظفرؔ کی ولی عہدی ۱۸۲۱ء یا ۱۲۳۷ھ کا واقعہ ہے۔ لہٰذا ۱۲۳۷ تک ذوقؔ ولی عہد سے بھی وابستہ نہیں ہوئے۔ بہر حال ۳۴۔۳۵ برس کی عمر میں ذوقؔ ظفرؔ سے وابستہ ہوئے اور چوں کہ اکبر شاہ کے دربار میں شعرا کا مجمع بھی نہیں تھا، انھوں نے دربارِ شاہی تک رسائی کی کوشش بھی نہیں کی ہوگی۔ یوں بھی ذوقؔ بہت معمولی خاندان کے فرد تھے اور اس دور کے آداب کے پیشِ نظر کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایازِ قدرِ خود بشناس کے قائل رہے ہوں گے۔ اس کی توثیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ظفرؔ کے علاوہ انھوں نے کسی اور دربار سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش بھی نہیں کی، کسی امیر سے بھی نہیں۔ وہ کچھ زیادہ پرآرزو بھی نہیں معلوم ہوتے اگرچہ کبھی کبھی اپنے حالات سے بے اطمینانی کا اظہار ضرور کر بیٹھتے تھے

کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

اسی بے اطمینانی کا مظہر ہے۔ آیئے اب دیکھیں کہ خطاب کے سلسلے میں آزاد کیا کہتے ہیں

> "چند سال کے بعد ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ کر سنایا کہ جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع و بدائع صَرف کیے تھے اس کے علاوہ ایک زبان میں جو ایک ایک شعر تھا (کذا) ان کی تعداد ۱۸ تھی۔ مطلع اس کا یہ ہے
>
> جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن
> آب وایلوالہ ہوئے نشوو نمائے گلشن
>
> اس پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا۔ اس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی"۔

اس بیان پر یقین کرنے کے لیے بڑی سادہ لوحی کی ضرورت ہے۔ چند سال بعد سے آزاد کی مراد مرزا سلیم کی شادی کے بعد ہے جو اغلباً ۱۲۲۵ھ کا واقعہ ہے۔ اگر چند سال کی مدت زیادہ نہیں صرف پانچ سال بھی ہو تو یہ واقعہ ۱۲۳۰ھ کا ہوگا۔ لیکن آزاد کا کہنا ہے کہ اس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔ ۱۹ برس کی عمر ۱۲۲۲ھ اور آماد کے مطابق ۱۲۲۳ھ میں ہونی چاہیے۔ اس صریح تضاد سے قطع کیجیے اور یہ دیکھیے کہ ۱۹ برس کی عمر میں ذوق نے یہ مشکل شعر کہنا شروع کیا ہوگا۔ قاسم نے مجموعۂ نغز ۱۲۲۱ھ کے تتمے میں ذوق کو نو مشق لکھا ہے، کبھی کبھی مشاعرے میں آنے اور طرحی غزل سرانجام کرنے کا ذکر بھی کیا ہے۔ نو مشقی کا ثبوت منتخبہ دو شعروں سے ظاہر ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ ذوق دربارِ ولی عہدی میں ۱۲۲۳ھ کے بعد داخل ہوئے۔ اب آزاد کے بیان کو کون مانے گا۔ (آزاد بظاہر یہ بھی بھول گئے کہ وہ پہلے مرزا سلیم کی شادی کے موقع پر استاد کی زبانی ایک مثنوی کہنے کی بات لکھ چکے ہیں بلکہ ساچق سے متعلق دو شعر گھڑ کر استاد کو بخش بھی چکے ہیں۔) بات یہیں ختم ہو جانی چاہیے تھی لیکن آزاد نے چوں کہ اس افسانے کو کچھ اور طول دیا ہے، اس لیے اس کا پرکھ لینا بھی دلچسپی اور افادے سے خالی نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں

> "خاقانی ہند کے خطاب پر لوگوں نے بڑے چرچے کیے کہ بادشاہ نے یہ کیا کیا۔ کہن سال اور نامی شاعروں کے ہوتے ایک نوجوان کو ملک الشعرا بنایا اور ایسا عالی درجے کا خطاب دیا۔ (گویا خاقانی ہند کا مطلب ملک الشعرا ہونا بھی ہے اور اس لحاظ سے یہ ایک ہی خطاب تھا) ایک

جلسہ میں یہی گفتگو ہو رہی تھی۔ کسی نے کہا کہ جس قصیدہ پر یہ خطاب ہوا ہے اسے بھی تو دیکھنا چاہیے۔ چناں چہ قصیدہ مذکور لاکر پڑھا گیا (گویا قصیدے کی ایک سے زیادہ نقلیں موجود تھیں) میر کلو حقیر کو شاعر سن رسیدہ اور شعرائے قدیم کے صحبت یافتہ تھے سن کر بولے کہ بھئی انصاف شرط ہے۔ کلام کو بھی تو دیکھو ایسے شخص کو بادشاہ نے خاقانی ہند کے خطاب سے ملک الشعرا بنایا تو کیا برا کیا۔ مجھے یاد ہے جب استاد مرحوم نے یہ حال بیان کیا تھا اس وقت بھی کہا تھا اور جب میں اربابِ زمانہ کی بے انصافی یا ان کے بے خبری اور بے بصری سے دق ہو کر کچھ کہتا تو فرماتے کہ بے انصافوں ہی میں سے کوئی با انصاف بھی بول اٹھتا ہے۔ بے خبروں میں باخبر بھی نکل آتا ہے۔ اپنا کام کیے جاؤ''۔

اس اقتباس کی دل کشی اور عقل فریبی میں کلام نہیں، مگر ہم اس پر کسی قسم کے تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ آزاد اسے ذوقؔ کی ۱۹ برس کی عمر کا واقعہ بتاتے ہیں۔ اس طرح وہ خود اس کے ۲۳ برس بعد پیدا ہوئے (ولادت ۱۲۴۵ھ / ۱۸۳۰ء)۔ کیا انھیں اپنی ولادت سے پہلے کی باتیں یاد تھیں؟

خیر اب یہ طے ہوا کہ یہ خطاب اکبر شاہ ثانی نے نہیں دیا۔ ظفرؔ ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء میں بادشاہ ہوئے اور انھوں نے بھی یہ خطاب نہیں دیا۔ معاصرین نے کہیں ذکر نہیں کیا۔ بہ طورِ جملۂ معترضہ، اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں، کہ ذوقؔ کی جس استادی یا اپنی شاگردی کا آزاد اتناڈھنڈورا پیٹتے ہیں، وہ خود مشکوک ہے۔ نہ آزاد ذوقؔ کے شاگرد تھے اور نہ انھوں نے ذوقؔ کی زندگی میں شعر کہنا ہی شروع کیا تھا۔ اس کی تفصیل راقم کی زیرِ طبع تالیف ''ذوقؔ اور محمد حسین آزاد'' میں ملے گی۔

اس ساری بحث کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہی کہ ذوقؔ کو نہ ملک الشعرائی کا خطاب تھا نہ خاقانی ہند کا۔ یہ نہ اکبر شاہ ثانی کے دربار سے ملا نہ بہادر شاہ ظفرؔ کی سرکار سے۔ ظفرؔ نے ذوقؔ کو ایک ہی خطاب دیا تھا اور وہ تھا سلطان الشعرا لیکن پہلے ان تذکروں پر نظر ڈال لینا بہتر ہوگا جن میں خاقانی ہند کا ذکر ملتا ہے۔

سب سے پہلے گلشنِ بے خار (۱۲۵۰ھ) میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے ''ذوقؔ تخلص شیخ محمد

ابراہیم دہلوی المخاطب بہ خاقانی ہندی " گلشنِ بے خار طبعِ اول فی الوقت پیش نظر نہیں۔ اگر حافظہ خطا نہیں کرتا تو اس میں المخاطب کی جگہ المعروف تھا۔ بہر حال ۱۲۵۰ھ تک، جب ذوقؔ کی عمر سینتالیس برس کی تھی وہ خاقانی ہندی (نہ کہ خاقانی ہند) مشہور ہو چکے تھے۔ مرزا قادر بخش صابر نے گلستانِ سخن اسی سال مرتب کیا جس سال ذوقؔ کا انتقال ہوا بلکہ جس دن ذوقؔ کا انتقال ہوا یہ تذکرہ زیرِ تالیف تھا۔ صابر نے ذوقؔ کو "شیخ ابراہیم مخاطب بخاقانی ہند" لکھا ہے۔ ان تذکروں میں مخاطب کے معنی لازماً خطاب دیا گیا کے نہیں بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے ان لوگوں نے اسے المعروف کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مذکورہ دونوں تذکرہ نگاروں کے بعد امراؤ مرزا انورؔ کا بیان ہے جو ان دونوں سے زیادہ اہم اور زیادہ معتبر ہے کہ انورؔ کا تعلق قلعے سے بھی تھا اور تلمیذ ہونے کے ناتے ذوقؔ سے بھی۔ انورؔ نے دیباچہ دیوانِ ذوقؔ میں لکھا "شیخ محمد ابراہیم المتخلص بہ ذوقؔ الملقب بہ ملک الشعرا خاقانی ہند " یہاں دو باتیں توجہ طلب ہیں۔ اول یہ کہ ۱۲۷۹ھ میں ذوقؔ کے آٹھ سال بعد، خاقانی ہندی خاقانی ہند ہو چکا تھا۔ دوسرے یہ کہ انورؔ نے المخاطب نہیں الملقب کہا ہے گویا یہ خطاب نہیں تھا۔ علاوہ ازیں خاقانی ہند پر ملک الشعرا کا اضافہ بھی ہو چکا تھا یا کر لیا گیا تھا۔ اسے شاگردوں یا دیگر عزیزوں اور عقیدت مندوں کا فیض کہیے۔ اس سلسلے میں ایک اور معاصر تذکرے کا اقتباس دل چسپی سے خالی نہ ہو گا

شیخ محمد ابراہیم تخلص ذوقؔ، شاگردِ غلام رسول شوقؔ، مخاطب بہ سلطان الشعرا ملقب بہ خاقانی ہندی۔ (خوش معرکہ) یہاں خطاب سلطان الشعرا، اور لقب خاقانی ہندی بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دہلی اردو اخبار کی کسی اشاعت میں سلطان الشعرا کا ذکر راقم کی نظر سے گزر چکا ہے (لیکن یہ فی الوقت دستیاب نہیں) اس تمام تفصیل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خاقانی ہندی، جو بعد کو خاقانی ہند ہو گیا یہاں تک کہ غالبؔ نے بھی "خاقانی ہند مرد افسوس" سے ذوقؔ کی تاریخ وفات نکالی ہے، محض شہرت ہے، خطاب نہیں۔ چناں چہ قیاس یہ ہے کہ خاقانی ہند یا ہندی عوامی خطاب ہے۔ اس قسم کے خطابات عوام کی طرف سے دے دیے جاتے ہیں یا خواص کی کسی محفل میں اس طرح کی بات کسی کے منہ سے نکل کر مشہور ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ مان لینے میں کوئی حرج نہیں کہ اس قسم کی شہرت میں کسی خاص صفت یا مناسبت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اس قسم کے کئی القاب یا خطابات بہت سے شعرا کے نام کے ساتھ نتھی ملتے ہیں جن کے بخشندوں کا پتا نہیں۔ تفصیل کی نہ گنجایش ہے نہ ضرورت البتہ شائد چند نام لیے جا سکتے علامہ اقبال، ظاہر ہے علامہ کا خطاب ان کے علم و فضل کے پیش نظر عوام ہی کی دین

ہے۔ آبرا حسنی کو نری کو سحاب سخن کہا اور لکھا جاتا رہا ہے۔ میر کو خدائے سخن اور نوح کو نا خدائے سخن کے خطابات بھی عوام ہی کے عطا کردہ ہیں۔ چناں چہ ذوق کو خاقانی ہند ی بھی عوام ہی کی بخشش ہے۔ اصل خطاب جو ظفر نے بادشاہ ہونے کے بعد دیا سلطان الشعرا ہے۔ اس پر صاحب "ذوق، سوانح اور انتقاد" لکھتے ہیں:

> "اس عہد کی بعض تحریروں (جن کی وضاحت نہیں کی گئی) میں ملک الشعرا کی بجائے سلطان الشعرا بھی لکھا گیا ہے جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کا اصل خطاب سلطان الشعرا ہوگا۔ لیکن ایک تو معاصر تحریروں میں زیادہ تر ملک الشعرا لکھا ہے دوسرے مغل دربار میں سلطان الشعرا خطاب کے لیے کوئی روایت نہیں ملتی"۔

اس بیان پر صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اگر مغل دربار میں سلطان الشعرا کی کوئی روایت نہیں ملتی تو خاقانی ہند کی بھی کوئی روایت نہیں ملتی۔ دوسرے یہ کہ اگر معاصر تحریروں میں زیادہ تر ملک الشعرا لکھا ملتا ہے تو اس سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ اصل خطاب ہی کو ترجیح دی جانی چاہیے۔ شہرت اصلیت کا بدل نہیں ہو سکتی۔

اس مقالے کی تیاری میں مدرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے

۱۔ کلیاتِ ذوق مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ہندوستانی اور پاکستانی ایڈیشن۔
۲۔ دیوانِ ذوق مرتبہ حافظ ویران، ظہیر وانور۔
۳۔ دیوانِ ذوق مرتبہ محمد حسین آزاد۔
۴۔ محمد حسین آزاد از ڈاکٹر اسلم فرخی۔
۵۔ ذوق، سوانح اور انتقاد از ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔
۶۔ ہندوستانی اخبار نویسی از محمد عتیق صدیقی۔
۷۔ دہلی اردو اخبار شائع کردہ دہلی یونی ورسٹی۔
۸۔ آب حیات طبع ثانی ۱۸۸۳ء محمد حسین آزاد۔
۹۔ گلشن بے خار از شیفتہ۔
۱۰۔ گلستانِ سخن از قادر بخش صابر۔
۱۱۔ خوش معرکہ زیبا از ناصر (سعادت خان) مرتبہ مشفق خواجہ۔

ممتاز حسین

غالبؔ اور ذوقؔ کا موازنہ

اردو شاعری کی زبان کی نسبت سے

مغلیہ سلطنت کا زوال، فارسی زبان کی حاکیت کا بھی زوال تھا اورنگ زیب کی وفات کے بعد، دلی کے تخت پر جو شہزادے بیٹھتے رہے ان کے زمانے میں جہاں مختلف صوبے اپنی اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے لگے وہاں ان علاقوں کی دیسی زبانوں نے بھی فارسی کا جوا اتارتے ہوئے، اپنی ترقی اور آزادی کا عمل شروع کیا۔

ایسا کیوں ہے کہ امیر خسرو دہلوی کے بعد، شمالی ہند میں اٹھارویں صدی سے پہلے، اردو کا کوئی قابل ذکر شاعر نہیں ملتا ہے۔ اس سوال کو مثبت طور سے یوں بھی پیش کیا جاسکتا ہے کہ اٹھارویں صدی میں دلی میں اردو کے اتنے بہت سے شعرا ایکا یک کیوں کر پیدا ہو گئے جنھیں خانِ آرزو یہ مشورہ دینے لگے کہ میاں فارسی میں شعر کہنا چھوڑو۔ یہ تمھاری مادری زبان نہیں ہے۔ اردو میں شعر کہو کہ یہ اردوے معلّٰی، قلعۂ معلّٰی کی زبان اور تمھاری اپنی زبان ہے۔ یہ جو خلا چار سو سال کا، شمالی ہند کی اردو شاعری کی تاریخ میں ملتا ہے اس کے اسباب پر ابھی تک خاطر خواہ طور سے روشنی نہیں ڈالی گئی ہے اور اس خلا کو ہم دکن کی ہندوی، ہندی، دکنی شاعری سے پر کرتے رہے ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ میں دکن کی ہندوی یا دکنی شاعری کو اردو شاعری کی تاریخ کا جزو تسلیم نہیں کرتا ہوں۔

میں نے یہ سوال اس بات پر زور دینے کے لیے اٹھایا ہے کہ شمالی ہند میں فارسی کی حاکیت نے شمالی ہند کی دیسی زبانوں کو ابھرنے اور ترقی کرنے سے روکے رکھا۔ سکندر لودھی کے زمانے

میں فارسی زبان کی تحصیل کا شغف ملکی لوگوں میں اس قدر زیادہ بڑھا، اور پھر مغل بادشاہوں کے زمانے میں، باوجود اس بات کے مغل بادشاہ اور شہزادے اکبر آباد کی برج بھاشا بھی بول لیا کرتے، فارسی زبان میں استعداد پیدا کرنے کا شوق اس قدر زیادہ مروج ہوا کہ برصغیر ہندوپاک کے لوگ اس بات کو بھول گئے کہ جس زبان میں وہ لکھ پڑھ رہے تھے، شعر و شاعری کر رہے تھے وہ ان کی اپنی مادری زبان نہ تھی اور اس کی بہار چند روزہ تھی۔

اس کے برعکس چوں کہ دکن کی ریاستیں یا تو مرکز سے نسبتاً آزاد اور دور تھیں یا پھر مرکز کے خلاف اپنی آزادی کے لیے مسلسل جنگ کرتی رہیں انھیں مرکز کے تسلط سے بچنے کے لیے، ملکی لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کی سخت ضرورت تھی۔ انھوں نے یہ کام ہندوی زبان کے استعمال اور ترویج سے لیا۔ اس لیے وہاں اردو کے اس قدیم اسلوب نے بڑی ترقی کی جسے ہندوی یا ہندی، دکنی کہا جا سکتا ہے جس کے ذریعے وہاں کے طبقۂ خواص کا عوام سے رابطہ قایم کرنا، بمقابلۂ فارسی نسبتاً آسان تھا۔ اس سلسلے میں وہاں کے صوفیہ نے بھی اس ہندوی اسلوب کی ترقی اور ترویج میں، فلسفۂ محبت کو عوام تک لے جانے کے عمل میں بہت بڑا حصہ لیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ دکن کا بیشتر ادب صوفیانہ ہے۔ خواہ اس کا لکھنے والا کوئی صوفی ہو یا نہ ہو۔ اس ہندوی میں جہاں ایک طرف ہندی کے الفاظ غالب ہیں وہاں دوسری طرف اس میں فارسی کے الفاظ بشمول عربی، اور فارسی ترکیبیں کچھ کم نہیں ہیں، لیکن فارسی کے اس اثر کے باعث اس کا ہندوی کردار مجروح نہیں ہوا اس کی ہندویت برقرار رہی۔

اس کے برعکس شمالی ہند، ان صدیوں میں، یعنی پندرھویں، سولھویں، سترھویں صدیوں میں، اس ہندوی زبان میں ادبی تخلیقات کے عمل سے محروم رہا جس کی ترقی یافتہ صورت اردو ہے ہر چند کہ وہاں کے لوگ ہندوی ہی بولتے رہے ہاں شمالی ہند میں مغلوں کے دورِ حکومت میں، برج بھاشا، اودھی اور پوربی ان تین زبانوں میں، تین بڑے شعرا سور داس، تلسی اور کبیر علی الترتیب پیدا ہوئے لیکن اردو کے لوگ ان کے ادب کو اپنانے سے قاصر رہے۔ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس قدر زیادہ قربت دکنی زبان اور اس کے ادب کو اردو سے ہے، اتنی قربت سور داس، تلسی داس اور کبیر کی شاعری اور اس کی زبان کو اردو سے حاصل نہیں ہے۔ کیوں کہ اردو اصلاً اپنے افعال کی ہیئت کے اعتبار سے کھڑی بولی 'ہندی' کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ اور دکنی کو ہمیشہ کھڑی بولی سے زیادہ قربت حاصل رہی ہے۔ کیوں کہ وہ کھڑی ہی کی ایک صورت ہے۔ چناں چہ یہی سبب ہے کہ اردو کا، نہ کہ دکنی ہندی یا ہندوی کا، پہلا صاحبِ دیوان شاعر سرزمینِ دکن سے اٹھا۔

مولانا محمد حسین آزاد نے ولی کو اسی اعتبار سے اردو شاعری کا باوا آدم قرار دیا۔ نہ کہ اس لیے کہ انھیں اس بات کا علم نہ تھا کہ اس دکنی ہندوی کا جس کی ترقی یافتہ صورت اردو ہے، قلی قطب شاہ پہلا صاحب دیوان شاعر تھا نہ کہ ولی۔

ولی کا تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس ہندوی شاعری کا رخ فارسی زبان اور فارسی شاعری کی طرف موڑ دیا جو اس سے قبل کے زمانے میں اس کا فیصلہ کرنے سے قاصر رہی تھی کہ اسے اپنی ترقی اور فیضان کے لیے کس زبان کو اپنا قبلہ بنانا ہے۔ فارسی کو؟ یا سنسکرت آمیز پراکرت کو؟ ولی نے ایسا خواہ شاہ سعد اللہ گلشن کے مشورے سے کیا ہو یا ان خارجی وجوہ کی بنا پر کہ دکھنی ریاستوں کے شیرازوں کے بکھرنے کے بعد، دکنی ہندوی کا مستقبل مایوس کن ہو چلا تھا، اور اسے اپنی ترقی اور مستقبل کے لیے شمالی ہند کی طرف دیکھنا لازمی تھا۔ یہاں کی اردو یا ہندوی کا محاورہ، دکنی ہندوی کے محاوروں سے بہت قریب تھا، دلی میں دیوان ولی کی مقبولیت کا یہی باعث تھا کہ ولی نے شاہ سعد اللہ گلشن کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے جہاں ایک طرف قلعۂ معلیٰ کی زبان یا شمالی ہند کے محاورۂ ہندوی میں شاعری کی وہاں انھوں نے شعراء فارسی کے کلام سے اس قدر استفادہ کیا کہ ان کی پوری پوری غزلیں تخلیقی انداز لیے ہوئے اردو میں منتقل ہو گئیں۔ ولی کا ایک شعر ہے

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوری ہے

اس شعر میں کئی الفاظ فارسی اور عربی کے ایسے ہیں جو اردو کے دخیل الفاظ ہیں، پھر بھی وہ فارسی اور عربی کے ہیں لیکن افعال اور حروفِ جار سارے ہندی کے ہیں۔ اردو کا صحیح مزاج یہی ہے۔ فصحائے اردو نے فارسی کی ایک اضافت کی اجازت اردو میں دے رکھی ہے اور بعض تو ان میں سے اس ایک اضافت کو بھی اضافتِ ترکیبی تک محدود رکھنے کے حق میں ہیں۔

بہر حال شمالی ہند میں دیوانِ ولی کی مقبولیت، ان کے طرز شاعری اور ان کی زبان کے اتباع کا باعث یہی تھا کہ وہ شمالی ہند کے محاورۂ ہندی اور قلعۂ معلیٰ کے محاورے میں تھا۔ دلی کے لوگوں نے ولی کی زبان کو اپنی زبان سمجھا ولی کے خلاف ایک حرف سننے کو تیار نہ ہوتے۔ ولی پر جو حرف لائے وہ شیطان ہے اور اس قدر ان کے کلام کو پسند کیا کہ محبت میں اس معشوق دکن کے سیں، سوں اور کوں بھی نظم کرنے لگے۔ ورنہ اس وقت کی دلی کے سارے شعرا کے قدم آہستہ آہستہ اس ٹکسالی اردو کی طرف بڑھ رہے تھے جس کا استشراق فارسی کی طرف

تھا، یعنی جو کسبِ نور فارسی زبان سے کر رہی تھی۔ چناں چہ میر تقی میر جو اپنے فرمائے ہوئے کو مستند قرار دیتے اتباعِ فارسی ہی سے میر بنے ہیں۔

جمعیت سے جو فارسی کے میں نے ہندی شعر کہے
سارے ترک بچے ظالم، اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ

اتباعِ فارسی کا مفہوم اس زمانے میں یہ تھا کہ فارسی شعراء کے کلام کو بلا خوفِ محاسبہ اردو میں منتقل کرنا، فارسی محاروں کا اردو میں ترجمہ کرنا، فارسی ترکیبیں استعمال کرنا اور فارسی کی اضافتوں کو بلا تقید استعمال کرنا یہ خصوصیات اس دور کی شاعری میں اگر عام نہیں تو اتنی کم بھی نہیں کہ وہ ہمیں متوجہ نہ کرتی ہوں۔

یہاں ایک سوال میرے ذہن میں یہ اٹھتا ہے کہ جب کہ صورتِ حال یہ تھی پھر سودؔا کو کیا ضرورت پیش آئی جو انھوں نے مظہر جان جاناں کے ریختہ پر یہ پھبتی کسی

آگاہِ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ — واقف جو ریختہ کے ذرا ہووے ٹھاٹ کا
سن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ — اور ریختہ بھی ہے تو فیروز شہ کی لاٹ کا

مصحفی مرزا جان جاناں کو زبان ریختہ کا نقاشِ اول قرار دیتے ہیں جو کسی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ ہاں قدرت اللہ شوق کے اس خیال سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ مظہر نے قلعۂ دہلی کی اردوے معلی میں ریختہ گوئی کو مروج کیا۔ لیکن چوں کہ مظہر کے ریختہ میں فارسی عنصر اس سے زیادہ تھا جتنا کہ سودؔا مستحسن تصور کرتے اس لیے سودا کو ان کے ریختہ کے بارے میں یہ کہنا پڑا کہ ان کا کلام اردو، فارسی اور ریختہ کے بیچ کا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ تتبع فارسی کی جو عام چھوٹ تھی اس پر کچھ قیود عاید کرنے کی ضرورت کا احساس پیدا ہو چلا تھا۔ اس سلسلے میں جو کچھ حاتمؔ نے اپنے "دیوان زادہ" کے دیباچے میں لکھا ہے اسے بھی نظر کے سامنے رکھنا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے زبان بھاکا کو موقوف کیا۔ اور اس میں سے صرف ایسے روزمرہ اختیار کیے جو خاص پسند اور عام فہم ہیں۔ اس کے آگے وہ لکھتے ہیں کہ میں نے عربی اور فارسی کے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو کثیر الاستعمال اور قریب الفہم ہیں اور جنھیں مرزایانِ ہند اور فصیحانِ رند اپنی بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔

اب سودؔا کی طرف آیئے۔ سودؔا کے کلام کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ریختہ کے ٹھاٹھ میں زبان بھاکا کے عنصر کو اس سے زیادہ رکھنا چاہتے تھے جتنا کہ حاتمؔ کے دیوان زادہ اور

مظہر کے ریختہ میں ہے۔ سوداؔ نے فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کے ساتھ ساتھ کثرت سے ہندوی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ انھوں نے ہندی اساطیر ادب کی بعض شخصیتوں کو بھی بطور علامت استعمال کیا ہے۔ جار اور حروف ربط وغیرہ ہندی کے ہوں۔ اس ٹھاٹھ کے بغیر، سوداؔ کے نزدیک ریختہ کا کوئی تصور نہ تھا، اردو کی نسبت سے یہ کہنا کہ وہ فارسی کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے یا یہ کہ فارسی کی ایک بیٹی ہے ایک غلط تصور ہے۔ اور فارسی کی بگڑی ہوئی صورت میں، ریختہ کہنا ان کے نزدیک ایک عیب کو انھوں نے ہنر میں بدل دیا، یعنی ریختہ کے ٹھاٹھ کو برقرار رکھتے ہوئے شاعری کی۔

سوداؔ نے جو یہ کارنامہ انجام دیا، اس میں میر تقی میرؔ ان کے شریک غالب تھے سوداؔ میر تقی میر، خواجہ میر درد، تاباں اور یقین یہ وہ نمایندہ شخصیتیں تھیں جن کے کلام کے اجتماعی اثر نے اردو زبان کے کردار کو ان کے زمانے میں متعین کیا۔ اگر سودا اور میر کی زبان کا موازنہ کیا جائے تو سودا کی زبان کے مقابلے میں میر کی زبان بہ حیثیت مجموعی زیادہ مستند تصور کی جائے گی۔ کیوں کہ سودا کے یہاں کہیں کہیں آپ فرماؤ بھی ملتا ہے۔ لیکن بعض امور میں سودا کی زبان ان معنوں میں زیادہ وسیع اور پرمایہ نظر آئے گی کہ سودا نے میر سے زیادہ ہندوی الفاظ استعمال کیے ہیں اور ان کی شاعری میں ہندی اساطیر کا بھی استعمال ہوا ہے۔ میر کے یہاں آخر الذکر عنصر شاید ہی ملے۔

موضوع سے قدرے ہٹتے ہوئے ایک بات درمیان میں یہ لانا چاہتا ہوں کہ ہر چند کہ میرؔ کے اشعار سہل ممتنع کا درجہ رکھتے ہیں، لیکن ایسا سوچنا کہ وہ عام فہم ہیں، درست نہ ہوگا۔ ان کا کلام "تہ دار اور پر پیچ" بھی ہے، اور ان کا ہر شعر ایک مقام سے بھی ہے، بہر حال ان کا ایک سادہ اور عرف عام کا عام فہم شعر ملاحظہ ہو:

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اس شعر کا مفہوم جو بتایا جاتا ہے کہ شاعری میں ان کا تخاطب عوام سے ہوتا وہ درست نہیں ہے۔ کم از کم اس شعر کی شعر فہمی کی حد تک میر شاعری کو ایک فن شریف بہ این معنی تصور کرتے کہ وہ اسے طبقۂ اشراف کا مشغلہ بتاتے۔ چناں چہ یہ بات ان کے لیے سخت ناگوار خاطر تھی کہ ان کے زمانے میں حجام اور نجار بھی شاعری کریں جو طبقۂ عوام سے تعلق رکھتے، اور شاعری کے باب میں ان کے منہ آئیں ان کے خلاف ہجویں لکھیں۔ میر نے اپنے خیالات کا

برملا اظہار اپنی ہجویات میں کیا ہے۔ ان خیالات کی روشنی میں مذکورہ بالا شعر کا مفہوم یہ نہ ہوگا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاعری میں میر کا تخاطب عوام سے تھا بلکہ یہ ہے کہ شعر و شاعری کے باب میں ایسے لوگ بھی میرے منہ آتے ہیں جو طبقۂ عوام سے تعلق رکھتے ہیں، مجھے اس کی کیا پروا ہے جب کہ میرے سارے اشعار خواص پسند ہیں۔ دوسرے مصرعے میں ''گفتگو'' کا لفظ بحث و تکرار کے لیے آیا ہے نہ کہ گفتگو کرنے کے معنوں میں۔

میر اپنی درویشی میں امیری کا مزاج رکھتے تھے۔ ان کے والد نے ترک دنیا کر رکھا تھا لیکن ان کا شمار شرفائے اکبر آباد میں کیا جاتا۔ میر اپنی اس خاندانی وجاہت کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔ آزاد نے میر کی جو تصویر کھینچی ہے، اس میں ان کی نازک مزاجی اور کم دماغی کی رعایت تو رکھی ہے لیکن ان کے مزاج کی اس امرائیت کا لحاظ نہیں رکھا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ میر کب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے، جو ان کے محاورے نظم کرتے۔ ہندی بحروں میں خیال کو بروزن خال ہی نظم کیا جاتا ہے۔ اور میر نے متعدد غزلیں، بالخصوص لمبی بحر کی غزلیں ہندی بحروں میں کہی ہیں، جن کی تقطیع صرف چھندوں اور ماتراؤں سے کی جاسکتی ہے۔ ان غزلوں میں جہاں کہیں بھی خیال کا لفظ نظم ہوا ہے۔ وہ بروزن خال ہی ہے۔ اس کا تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ صاحبو یہ جامع مسجد کی سیڑھیوں کی زبان ہے۔ میر کے یہاں ایک آدھ جگہ میں بازاری محاورہ بیشک استعمال ہوا ہے۔ جیسے ابے او کوچہ جاناں والے یا پلیتھن نکل گیا ورنہ انھوں نے بازاری محاوروں سے پرہیز کیا ہے۔ اس کے برعکس انھوں نے اپنے کو صرف ایسے محاوروں اور روزمرہ کا پابند رکھا جو خواص اور عوام دونوں میں مستعمل تھے۔

یہ جملہ معترضہ درمیان میں اس لیے لایا تاکہ اس بات کو ابھار سکوں کہ اس زمانے میں جب کہ طبقاتی امتیازات کو معاشرے کی ثقافت میں بڑا دخل تھا، ہرچند کہ زبان ایک ہی تھی وہی ہندوی، دہلوی یا اردو، لیکن شہر میں اس زبان کے دو محاورے رائج تھے اور شرفا عوام کے محاوروں کو، بازاری محاوروں کو استعمال کرنا، اپنے لیے خلاف آدابِ زندگی، خلاف تہذیب تصور کرتے، اور ادب اور انشا میں ان کے محاوروں کو استعمال کرنا خلاف ادب گردانتے۔ ان دو محاوروں میں، سب سے فصیح محاورہ قلعۂ معلیٰ کا تسلیم کیا جاتا جن کی زبان میں ہندوی کا عنصر غالب ہوتا۔ اس کے بعد شرفائے شہر کا۔ انشا نے دریائے لطافت میں ایسے محلوں کے نام گنوائے ہیں، جن کے محاورے فصیح تھے، بقیہ محلوں کے محاوروں کو غیر فصیح قرار دیا ہے۔ ایسی صورت میں یہ بتانا لازم ہے کہ غالب اور ذوق کے زمانے میں بھی، اہالیان دہلی کے

نزدیک زبان میں یہ امتیاز باقی تھا۔ ایک محاورہ ڈفالیوں، بھٹیاروں اور کرخنداروں کا تھا اور دوسرا محاورہ قلعۂ معلّٰی کی اردو کا تھا اس کی پیروی اشراف اور فصحائے شہر کرتے۔ چناں چہ مولوی ذکاء اللہ اس بات کے ناقل ہیں کہ غالبؔ نے کسی موقعے پر یہ جملہ ادا کیا کہ ذوقؔ بھٹیاروں کا محاورہ استعمال کرتے۔ بہرحال اسے تو آزاد نے بھی تسلیم کیا کہ قلعۂ معلّٰی سے تعلق پیدا ہونے سے پہلے ذوقؔ کے اشعار میں ایسے محاورے بھی ہوتے جو بازاری تھے۔ یارو۔ دلبر جانی وغیرہ۔ مولوی نذیر احمد کی زبان خاصی ٹکسالی ہے، لیکن وہ کبھی کبھی عوامی محاورے بھی استعمال کر جاتے۔ اسے مولوی حضرات بہتر جانتے ہوں گے کہ انھوں نے کیوں گھار کر کے ان کی تصنیف امہات الامتہ کو نذرِ آتش کیا لیکن میں نے ان کے خاندان کے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ بھائی میں ایک محاورہ اس قسم کا بھی تھا کہ ''جوتیوں میں دال بٹنے لگی''۔

ان ساری باتوں سے جو میں نتیجہ اخذ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ غالبؔ اور ذوقؔ کی شاعری کے درمیان ایک بڑا فرق اس بات میں نظر آتا ہے کہ شاعری کے ڈکشن (یعنی زبان و بیان) سے متعلق دونوں کا رویہ مختلف تھا۔ ذوقؔ شاعری میں عام بول چال کی زبان، بلا اس امتیاز کے کون سا محاورہ طبقۂ خواص کا ہے اور کون سا طبقۂ عوام کا، استعمال کرنے کے قایل تھے اور وہ اپنے شعری خیال کو اس زبان کے تابع رکھتے۔ جہاں تک کہ ان کے شعری خیالات کی دنیا کا تعلق ہے ان کے تخیل کی جولانگاہ، ان خیالات کی دنیا تک محدود تھی جو انھیں فارسی اور ریختہ کے شعراء سے تہذیبی ورثے میں ملے تھے۔

خیالات سے یہ روایتی رشتہ تو تقریباً سبھی شعراء کا ہوا کرتا ہے لیکن ان کا انفرادی تصرف ماضی سے ورثے میں ملے ہوئے خیالات کی صحت درستی اور توانائی اور سچائی پر یا تو شک و شبہے کی نظر ڈالنے میں پایا جاتا ہے یا پھر اس بات میں کہ وہ کوئی تاویل اور تفسیر پیش کرتے ہیں اور جو بڑے شاعر ہوتے ہیں، وہ ایک نیا تناظر کاروانِ حیات کے سفر کو دیکھنے کا بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں زمان و مکاں، وجود اور عدم کے بھی نئے تصورات ملتے ہیں۔

ذوقؔ کے خیالات کی دنیا، اپنے دامن میں کوئی ایسی دولتِ نظر اور خبر نہیں رکھتی ہے۔ ان کی فکر مروجہ خیالات اور مسلمات کو قالب شعر میں اس طرح ڈھالنے کی ہوتی ہے کہ اس کے بدن پر کسی محاورے اور کسی کہاوت کا لباس ہو، ذوقؔ کی شاعری کے بارے میں یہ بات سبھی کہتے آئے ہیں کہ جب کبھی وہ مضمون آفرینی یا معنی آفرینی کی کوشش کرتے ہیں، تو تعقید کے عیب سے اپنے اشعار کو بوجھل کر دیا کرتے ہیں، مگر جب یہ کوشش نہ ہو، اور خیال بھی زیادہ

باریک نہ ہو تو وہ ایسے اشعار بھی بنالیتے ہیں جو تمام تر نثر کی زبان میں ہوتے ہیں

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

شعر کا سہل ممتنع ہونا ایک حسن ہے۔ بشرطیکہ اس میں کوئی خیال شاعرانہ انداز سے کسی امیج کے ذریعے پیش کیا گیا ہو۔ ایسے اشعار کی کثرت میر کے کلام میں ہے

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہے گویا چراغ مفلس کا وغیرہ وغیرہ

اس قسم کے اشعار، ذوقؔ کے یہاں شاید ہی ملیں۔ صاف اور رواں شعر بغیر کسی امیج کے کہنا کسی بیان یا گفتگو کو نظم کر دینے کے مترادف ہوتا ہے ذوقؔ کے اشعار میں نثریت کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ لیکن جہاں تک کہ ان کے ڈکشن کی اردویت کا تعلق ہے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی زبان ٹکسالی اردو سے بہت قریب ہے خواہ بیان غیر شاعرانہ ہی کیوں نہ ہو۔

اس کے برعکس غالبؔ اپنی شاعری کے دور اولین میں اس ریختہ کے شاعر تھے جس کے بارے میں سودا نے مظہر کے ریختہ کی نسبت سے یہ کہا تھا کہ وہ فارسی اور ریختہ کے بیچ کی شے ہے۔ چناں چہ غالبؔ کے دور اولین کے ریختہ سے متعلق ان کے معترضین کا یہ خیال بالکل درست تھا کہ وہ ریختہ فارسی کے محاورے میں کہتے۔ یہ عیب مرزا کے ریختہ میں اس لیے پیدا ہوا کہ اس زمانے میں جب کہ اردو کے بیشتر شعراء صایب، کلیم، نظیری، عرفی، وحشی اور فغانیؔ کے طرز میں ریختہ کہنے کی کوشش کرتے، غالبؔ نے اپنے لیے طرز بیدلؔ میں ریختہ منتخب کیا، جو فلسفیانہ اشعار کہنے کا ایک طرز تھا۔ نہ کہ معلومات عامہ، یا مروج خیال کو کسی محاورے یا کہاوت میں ڈھالنے کا طرز جو ذوقؔ نے اختیار کیا۔

غالبؔ کو جب طرزِ بیدلؔ میں ریختہ کہنے میں دشواری کا احساس ہوا تو انھوں نے ریختہ چھوڑ فارسی میں شعر کہنا شروع کیا۔ اور پھر اس میں وہ مشق بہم پہنچائی کہ سارے عالم کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ مگر بالآخر غالبؔ کو بھی یہ احساس ہو چلا تھا کہ ان کا جو یہ دعوئ ریختہ گویوں کے سامنے ہے

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

نہ توذوقؔ کو مطمئن کرسکتا تھا جن کی طرف اشارۂ خصوصی ہے اور نہ اردو کے لوگوں کو۔ چناں چہ پندرہ سولہ برس تک فارسی میں مشق بہم پہنچانے کے بعد وہ ریختہ کی طرف پھر لوٹے، گواس عرصے میں بھی گاہے گاہے وہ ریختہ بھی کہہ لیا کرتے۔ مگر اس بار بانداز دیگر، فارسی میں مختلف شعراء کے اسلوب کی پیروی کرنے کے بعد، بالآخر ان کی رہنمائی نظیریؔ اور عرفیؔ نے کی تھی۔ پھر بھی فارسی میں وہ اپنے اسلوب کو طرز خداداد بتاتے۔ اس طرز خداداد میں سلاست اور روانی کو بڑا دخل تھا۔ چناں چہ اس دور کے ریختہ میں بھی ان کا طرز انھیں خوبیوں کا حامل رہا۔ اسی زمانے میں انھوں نے فارسی میں خطوط نویسی موقوف کرکے، اردو میں خطوط نگاری کا جو اسلوب، مراسلے کو مکالمے میں تبدیل کرنے کا وضع کیا وہ اس قدر مقبول ہوا کہ لوگ ان کے فارسی خطوط کی لذت کو بھول گئے۔ وہی انداز ان کی اس دور کی ریختہ گوئی میں ملتا ہے۔

اور جب ۱۸۵۰ء میں ان کا تعلق قلعۂ معلّی سے پیدا ہوا تو پھر ان کا ریختہ، میر تقی میرؔ کے ریختہ سے پہلو مارنے لگا۔ اور ذوقؔ کا یہ طنزیہ بیان

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالبؔ کے ریختہ پر پورا نہ اترا

ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

اس طرز میں غالبؔ نے جو غزلیں کہیں ہیں وہ میرؔ کی غزلوں کے پہلو میں رکھی جاسکتی ہیں، میرؔ کی غزلوں میں وِٹ یا ذکاوت کی جو کمی محسوس ہوتی ہے، وہ غالب کی غزلوں میں بدرجہ اتم ہے، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ غالبؔ کی غزلوں میں لذت زبان کی چاشنی میرؔ کی غزلوں سے کچھ سوا ملتی ہے۔

کیا ذوقؔ کی کسی ایک غزل میں بھی وہ نفاست اور تازگی ملتی ہے جو غالبؔ کی مذکورہ بالا غزلوں میں ہے۔ مگر یہ مقابلہ ہی کیوں؟ میں یہ بات پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ شاعری کے میدان میں غالبؔ اور ذوقؔ کی کٹیگری یا تقسیم ہی مختلف ہے۔ غالب ایک اوریجنل شاعر تھے۔ وہ ان

شاعروں میں سے تھے جو پیغمبری نہ کرتے ہوئے پیغمبری کر جاتے ہیں۔

غالبؔ کو شاعری میں پند و موعظت سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ ایک اور بجنل تخلیقی شاعر پند و موعظت کا راستہ اختیار نہیں کرتا ہے۔ بلکہ افکار کہنہ کو نذرِ آتش کرتے ہوئے، سنگینی حیات پر ایک ایسی ضرب کلیمی لگاتا ہے کہ اس سے نئے خیالات کے چشمے پھوٹتے ہیں ایسے خیالات جو کسی قوم کے حق میں چشمۂ آبِ حیواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالبؔ نے قوم اور اپنے ملک کے لیے اپنی شاعری سے ایک ایسا ہی کارنامہ انجام دیا ہے۔ چناں چہ ان کا یہ دعویٰ شاعری حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوتا ہوا نظر آتا ہے

چشمۂ آبِ حیاتم – تاتا بلیا ہو

بہر حال یہ کوئی موقع نہیں کہ میں غالبؔ کی شاعری پر کوئی مقالہ لکھوں۔ میں تو غالبؔ اور ذوقؔ کے ذکش، یعنی شاعری کی زبان سے متعلق کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس بحث میں ہم نے یہ محسوس کیا کہ ذوقؔ کا کلام تب جا کر دھلا ہے جب وہ قلعۂ معلّٰی کے محاورے سے قریب ہوا ہے۔ بالفاظِ دیگر جب انھیں بہادر شاہ کی صحبت حاصل ہوئی ہے۔ محمد حسین آزاد تو یہ کہتے ہیں کہ ظفر کے تین دواوین اصلاً استاد ذوقؔ ہی کے سمجھنے چاہئیں۔ لیکن یہ تمام تر ایک افسانہ ہے۔ ظفر کا کلام ذوقؔ کے کلام سے بہت مختلف اور بہتر بھی ہے۔ ظفر کی شاعری میں جو موسیقیت اور سوز و گداز ہے وہ ذوقؔ کو نصیب نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ذوقؔ کی زبان تو قلعۂ معلّٰی سے تعلق پیدا ہونے کے بعد فصاحت کے درجے سے گزری ہے ایسی صورت میں ظفر کی شاعری کا اثر ان کے استاد ذوقؔ کی شاعری پر محسوس ہوتا ہے نہ کہ استاد کا اثر شاگرد کی شاعری پر۔ استادی اور شاگردی کا یہ رشتہ ان دونوں کے درمیان کم و بیش ویسا ہی تھا جیسا حاتم اور سودا کے درمیان تھا، فرق یہ ہے کہ حاتم نے اسے تسلیم کیا کہ میرا شاگرد سودا مجھ سے بہتر کہتا ہے۔ لیکن ذوقؔ نے اسے تسلیم نہیں کیا کہ میرا شاگرد ظفر مجھ سے بہتر کہتا ہے۔ دونوں کے مرنے کے بعد آزاد کی یہ بات کون سنے گا اور مانے گا کہ ظفر کے تین دواوین ذوقؔ کے کہے ہوئے تسلیم کیے جائیں۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ اگر آزاد نے اپنے استاد ذوقؔ کا کلام اپنی اصلاح کے ساتھ نہ چھپوایا ہوتا، تو ذوقؔ کی شاعری آج اس گہن میں نہ ہوتی جس میں کہ وہ نظر آ رہی ہے۔

آخر میں جب میں اس بات پر غور کرتا ہوں کہ کیا شاعری اسی کا نام ہے کہ کچھ محاورے اور روز مرہ اشعار میں کھپا دیے، کچھ کہاوتیں موزوں کر دیں، یا یہ کہ جو خیالات سوسائٹی میں

مروج ہیں اور جنھیں اگلے وقت کے شعراء بار بار نظم کر چکے ہیں، انھیں ایک بار مزید کسی نئے پہلو سے پیش کر دینا ہی شاعری ہے تو مجھے اس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ یہ کوئی شاعری نہیں بلکہ مشقِ شاعری ہے لیکن مشق، شاعری کی روایت کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے اور شاعری کی روایت کو زندہ رکھنے میں چھوٹے اور درمیانی شعراء کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ لیکن اس خدمت کے باوجود جس کا اعتراف نہ کرنا ایک ادبی جرم ہے، تاریخ ادب میں کوئی بڑا مقام حاصل نہیں کر پاتی ہے۔ وہ کچھ تفریحِ طبع وہ بھی معمولی سطح کی تفریح کی شئے بن کر رہ جاتی ہے ان کے یہاں سے کچھ مزید اراشعار چنے جاسکتے ہیں، جو متفرق صورت میں ملتے ہیں۔ وہ کوئی بڑا کینوس سالم خیال کا اپنی شاعری میں پیش نہیں کر پاتے۔ بسا اوقات ان کا کارنامہ اس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ وہ ماضی کے کسی بڑے شاعر کا پرچم اپنی شاعری میں اڑاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

رہ گیا یہ مسئلہ کہ ایک بڑا شاعر کیا ہوتا ہے تو اس کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ اس کی بڑائی منفی صورت میں تو اس بات میں ملتی ہے کہ وہ معلومات عامہ کا ناظم نہیں ہوتا ہے اور بصورت مثبت اس بات میں کہ وہ حقیقت کی تاویل ایک نئے نقطۂ نظر سے کرتا ہے۔ وہ فرسودہ اور از کار رفتہ خیالات کو رد کرتے ہوئے حیاتِ نو کے ضامن خیالات سے ہمیں آشنا کرتا ہے۔ وہ کائناتی زندگی، بیکرانگی وقت کے تناظر میں دیکھتے ہوئے ہمیں نامعلوم کی بھی خبر دیتا ہے۔ اس تاریک غار میں بھی جھانکتا ہے جو زندہ ستاروں کو نگل لیتا ہے اور جس کے کناروں تک پہنچتے پہنچتے وقت بھی اپنا دم توڑ دیتا ہے۔ وہ انسانی فطرت کے ان گوشوں کو بھی بے نقاب کرتا ہے جو نظر سے اوجھل رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کی ذات میں جو امکانات اس کی عظمتوں کے، اس کے جلال و جمال کے پوشیدہ ہوتے ہیں، خفیہ یا کنمناتے ہوئے ہوتے ہیں انھیں حقیقت سے ہمکنار ہوتے ہوئے دکھاتا ہے، وہ گزرے ہوئے کل، حال ہی کی نہیں بلکہ روزِ فردا کی تصویر بھی آئینہ ایام میں دکھاتا ہے۔

کیا ذوقؔ نے کوئی ایسی شاعری کی ہے جو اس کا موازنہ غالبؔ کی شاعری سے کیا جائے۔ اس کے برعکس بڑی شاعری کے تعلق سے جتنی باتیں میں نے اوپر کہی ہیں وہ ساری باتیں غالبؔ کی شاعری میں ملتی ہیں۔

مانا کہ ذوقؔ نے چند قصاید، اس اعتبار سے اچھے لکھی ہیں کہ ان میں اچھوتی تشبیہات پیش کی ہیں، اور کچھ علمی فضا بھی قایم کی ہے۔ لیکن ان میں وہ بات کہاں، کیا بلحاظِ تشبیب، اور کیا بلحاظِ

مضامین جو غالبؔ کے ان قصاید میں ہے، جو انھوں نے بہ زبانِ اردو منقبت میں کہے ہیں

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

اس فلسفیانہ عظمت کا، جو وجودیت کے سارے فلسفوں کو گرد راہ کیے ہوئے نظر آتا ہے کیا کوئی قصیدہ ذوقؔ کے یہاں ہے؟ علمی اصطلاحات کے استعمال سے، کوئی فلسفہ نہیں ابھرتا ہے۔ ذوقؔ میں فلسفیانہ سطح پر سوچنے اور شعر کے قالب میں اس فکر کو اتارنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ رہ گئی، سادگی اور سلاست کی بات تو اس کے ساتھ ایک لفظ حلاوت کا بھی اضافہ کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس کے بغیر فصاحت کا کوئی تصویر پیدا نہیں ہوتا ہے۔

حلاوت کا مفہوم، شعر و شاعری کی دنیا میں لذت کام و دہن سے نہیں بلکہ لذت گوش و ہوش سے ہے۔ جو سادگی، سلاست اور حلاوت غالبؔ کے ان قصاید میں ہے جو انھوں نے قلعے کے تعلق سے کہے ہیں

(۱) ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

(۲) صبحدم دروازۂ خاور کھلا مہر عالمتاب کا منظر کھلا

کیا یہ سادگی، سلاست اور حلاوت ذوقؔ کے کسی قصیدے میں ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر یہ شکایت ہی کیوں

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوقؔ وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

زمانے نے ذوقؔ کی خاصی قدر کی۔ غالبؔ نے اپنے اہم معاصر شعراء میں سے ذوقؔ کا نام مومنؔ کے ساتھ لیا ہے اور نجم الدولہ دبیر الملک ہوتے ہوئے استادِ شہ سے اپنے دعویِ سخنوری کی معذرت بھی چاہی ہے۔ اور کیا چاہیے تھا میاں ذوقؔ اور ان کے پرستاروں کے لیے۔ ویسے ایک چھوٹا سا انتخاب ان کے اشعار کا کیا جا سکتا ہے۔ اور کرنا چاہیے اور ان کی یادگار بھی قایم کرنی چاہیے۔

نریش کمار شاؔد

ذوقؔ دہلوی سے انٹرویو

(عالمِ خیال میں)

شاؔد قبلہ! سب سے پہلے تو اپنی کسی ابتدائی غزل کا کوئی شعر ارشاد فرمانے کا کرم فرمائیے۔

ذوقؔ
دُرِ مضموں ہیں ترے ذوقؔ زبس بیش بہا
کم کوئی اُن کا خریدار نظر آتا ہے

شاد سبحان اللہ! لیکن بعد میں تو آپ کی قدردانی خوب ہوئی قبلہ و کعبہ! ہاں تو اسی زمانے میں جب آپ کے ایک دوست نے آپ سے کہا تھا کہ آپ چشمِ بددور ہمہ صفت موصوف ہیں کیوں نہیں کوشش کرکے ولی عہد کی صحبتوں میں شامل ہوتے؟ آپ نے اس کے جواب میں کیا قطعہ پڑھا تھا؟

ذوقؔ
درِ میر و وزیر و سلطاں را
بے وسیلت مگرد پیرا من
سگ و درباں چوں یافتند غریب
ایں گریباں گرفت و آں دامن

شاد اسی زمانے میں آپ نے میر تقی میرؔ کی تقلید کرنے کی

کوشش بھی تو کی تھی۔

ذوقؔ نہ ہوا، پر نہ ہو میر کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

شاد بہت خوب! اور اپنی شاعری کے اسی ابتدائی دور میں آپ نے میرزا محمد رفیع سوداؔ کی زمین میں وہ کون سی غزل کہی تھی جسے سن کر آپ کے استاد شاہ نصیرؔ نے طنزاً کہا تھا! کہ ارے! تو تو سودا سے بھی اونچا اڑنے لگا اور اصلاح سے انکار کر دیا تھا۔

ذوقؔ رکھتا بہر قدم ہے وہ یہ ہوش نقشِ پا
ہو خاکِ عاشقاں نہ ہم آغوشِ نقشِ پا

شاد بعد میں چند غلط فہمیوں کی بنا پر آپ میں اور شاہ نصیرؔ میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ اور آپ کو اپنے استاد سے معرکہ آرائی تک بھی کرنا پڑی۔ کئی مخالفوں کے اعتراضات کے جوابات بھی دینے پڑے، اس وقت تھوڑے حاں ایسے آپ کے حاسدوں نے آپ کی ہجو کہی۔ کیا آپ نے بھی کسی کی ہجو لکھی؟

ذوقؔ نہ ہو بے وقر ترکِ سجدۂ ابلیس سے آدم
عدو کی سرکشی سے رتبہ کب ہوتا ہے کم میرا

شاد تو کیا اپنے ہم عصروں میں آپ کسی سے بھی حسد نہیں کرتے تھے؟

ذوقؔ ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں!
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں!

شاد خوب، بہت خوب! لفظ حسد کے عدد بھی بہتر ہیں اور

مسلمانوں میں حسد کی وجہ سے بہتر فرقے بھی پیدا ہو گئے تھے۔ اپنے آپ کو آپ حسد سے ماورا یعنی تہتر ویں فرقے میں شمار کرتے ہیں۔ ویسے حسد کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟

ذوق جو حسد کسی کو تجھ پر ہو تو ہے یہ تیری خوبی
که جو تو نہ خوب ہوتا تو وہ کیوں حسود ہوتا

شاد جب آپ کا مسلک یہ تھا پھر تو اپنی زندگی میں آپ کسی کو حقارت کی نظر سے بھی نہ دیکھتے ہوں گے؟

ذوق اے ذوق! کس کو چشم حقارت سے دیکھیے
سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں

شاد کیا بات ہے اس خاکساری کی! کیا اپنی خاکساری کے بارے میں بھی آپ نے کوئی شعر کہا؟

ذوق زباں کھولیں گے مجھ پر بد زباں کیا بدشعاری سے
کہ میں نے ان کے منہ میں خاک بھر دی خاکساری سے

شاد ایسا معلوم ہوتا ہے آپ سرنجاں مرنج زندگی کے دلدادہ تھے اور آپ کو فطرتاً جنگ و جدل سے نفرت تھی۔ اور کسی کی دل شکنی آپ کو گوارا نہ تھی۔

ذوق ملے اکسیر گر اک قطرہ خوں سے میں نہ لوں ہرگز
مرے مذہب میں خوں کرنا ہے کشتہ کرنا پارے کا

شاد آپ کی زبانِ مبارک سے مذہب کا لفظ سن کر مجھے خیال آیا کہ آپ باخدا لوگوں سے تو بہت عقیدت رکھتے تھے اور آپ کے دل میں ان کا بہت احترام تھا۔ سید عاشق حسین نہال چشتی کی تعریف میں تو آپ نے ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔ کیا مطلع تھا اس قصیدے کا؟

ذوقؔ	ہے ابر درفشاں وہ چمن میں کمال کے
عاشق نہال کیوں نہ ہوں عاشق نہالؔ کے

شاد	اور اورنگ آباد کے سائیں نثار شاہ کے بھی تو آپ بہت معتقد تھے۔ کوئی شعر ان کے بارے میں بھی کہا ہو تو فرمائیے۔

ذوقؔ	بجز نثار علی شاہ کون جانے ذوقؔ
تری زباں کا مزا تیری شعر خوانی میں

شاد	جسمانی نقاہت کی وجہ سے آپ روزہ تو رکھ نہیں سکتے تھے لیکن اتنی احتیاط ضرور کرلیتے تھے کہ کسی کے سامنے کھاتے پیتے نہ تھے۔ ایک بار جب رمضان کے مہینے میں شدت کی گرمی پڑ رہی تھی اور آپ کے ملازم نے کوٹھے پر کٹورے میں گھول کرنیلو فر کا شربت تیار کیا اور آپ کو اوپر تشریف لے جانے کے لیے کہا۔ آپ اس وقت غالباً لکھنے پڑھنے میں مشغول تھے۔ اور آپ کے شاگردِ رشید مولانا محمد حسین آزادؔ بھی آپ کے پاس ہی بیٹھے تھے، اس وقت آپ نے اپنے ملازم سے یہ کہتے ہوئے کہ شربت کا کٹورا یہیں لے آؤ۔ فی البدیہہ کیا شعر فرمایا تھا؟

ذوقؔ	پلائے آشکارا ہم کو کس سے ساقیا چوری
خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

شاد	سبحان اللہ! اس شعر کے علاوہ آپ نے بعض اور بھی بہت پر لطف رندانہ شعر کہے ہیں جیسے

پیرِ مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوقؔ
نامرد، مرد، مردِ جواں مرد ہو گیا

آخر گل اپنی خاکِ درِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

زاہد شراب پینے سے کافر میں کیوں ہوا
کیا ڈیڑھ چلو پانی سے ایمان بہ گیا

لیکن مجھے بخوبی علم ہے کہ عملی زندگی میں آپ انتہائی صوفی منش اور پرہیز گار تھے۔ چھتیس برس کی عمر میں آپ نے بقولِ آزاد تمام منہیات سے توبہ کرلی تھی اور اس کی تاریخ بھی لکھی تھی

اے ذوقؔ! بگو سہ بار توبہ

تاہم یہ فرمائیے کہ شراب سے متعلق آپ کی واقعی رائے کیا ہے؟

ذوقؔ اے ذوقؔ! دیکھ دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

شاد کیا یہ درست ہے کہ آپ خدا کا نام لینے سے پہلے ایک لوٹے پانی سے کلیاں کیا کرتے تھے؟

ذوقؔ پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

شاد قبلہ! میرے خیال میں طبعاً آپ کو غزل کی بہ نسبت قصیدے سے زیادہ مناسبت تھی اور آپ کے قصائد ہی آپ کی شاعرانہ صناعی اور قدرتِ کلام کی بہتر نمائندگی کرتے ہیں، اس ضمن میں یہ بتانے کی زحمت فرمائیے کہ ۱۲۲۵ ہجری میں

جب آپ کو دربارِ شاہی میں باریابی نصیب ہو گئی تو آپ نے شاہزادہ جہانگیر کے جشنِ کتخدائی کے موقعے پر جو قصد تہنیت پیش کیا تھا وہ کیا تھا؟

ذوقؔ. شہا ہے آج اسی شاہزادے کی شادی
جہاں میں جو ہے جہاں گیر شاہِ نیک اطوار
وہ شاہزادہ ہے پر ہے ابھی سے شاہ نشاں
وہ شاہزادہ جواں ہے دلے کہن کردار

شاد اور سراج الدین بہادر شاہ ظفرؔ کی ولی عہدی کے زمانے میں آپ نے جو قصیدہ لکھا تھا اس میں وہ کون سا شعر تھا جسے سن کر شاہ نصیرؔ کے شاگردوں میں ایک کھلبلی مچ گئی تھی اور یہ سمجھا گیا تھا کہ شاید آپ نے استاد پر پھبتی کسی ہے۔

ذوقؔ چق ترے دالان کی نازک بہت ہے نازنیں
کیا لگائیں اس میں ہیں پارِ نگس کی تیلیاں

شاد اور جب بہادر شاہ ظفرؔ تخت نشیں ہوئے تو آپ نے کون سا قصیدہ کہا تھا؟

ذوقؔ ہے آج جو یوں خوشنما نورِ سحر رنگ شفق
پرتو ہے کس خورشید کا نورِ سحر رنگ شفق

شاد اور ۱۹ سال کی عمر میں جس قصیدے پر آپ کو خاقانی ہند کا خطاب ملا تھا اس کا مطلع کیا تھا؟

ذوقؔ. جب کہ سرطان واسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب دایلولہ ہوئے نشوونمائے گلشن

شاد: اور آپ کا وہ آخری قصیدہ کون سا تھا جو آپ نے ۱۹۵۴ء میں جشن عید الاضحیٰ کے موقعے پر پیش کیا تھا اور جسے سن کر بہادر شاہ ظفرؔ نے آپ کو ایک گاؤں جاگیر میں عطا کیا تھا۔

ذوقؔ:
شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ غفلت
نشۂ علم میں سرمستِ غرور و نخوت

شادؔ: ۱۲۷۲ ہجری میں جب بہادر شاہ ظفرؔ کی چہیتی بیگم نواب زینت محل نے شہر میں ایک مکان تعمیر کرایا تھا اور بادشاہ کے توسط سے یہ فرمائش کی تھی کہ آپ اس کی تاریخ کہیں تو آپ نے دربارِ خلوت میں بیٹھے کیا شعر کہا تھا؟

ذوق:
کرواے ظفرؔ زینت محل تعمیر قصرِ بے بدل
تاریخ گفتم بر محل "این خانۂ زینت محل"

شاد: جب بہادر شاہ ظفرؔ کے صاحبزادے میرزا محمد سلطان عرف میرزا فخرو ولی عہد مقرر ہوئے اس موقعے پر آپ نے فی البدیہہ کیا قطعہ موزوں کیا تھا؟

ذوق:
دعا ہے ذوقؔ کی ہو خلعتِ ولی عہدی
مبارک آپ کو با آفتابی و کرسی
یہ آفتابی و کرسی خدا کرے فرخ
بحق سورۂ والشمس و آیت الکرسی

شاد: میرزا فخر و خود بھی تو موزوں طبع تھے، ایک دفعہ جب آپ اور وہ تالاب کے کنارے، چاندنی رات میں چاندنی کی بہار دیکھ رہے تھے تو انھوں نے کیا مصرعہ پڑھا تھا؟

ذوقؔ: چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر

شاد — اور آپ نے اس پر دوسرا مصرعہ کیا لگایا تھا؟

ذوق — تابِ عکسِ رخ سے پانی پھیر دے مہتاب پر

شاد — اور اسی طرح ایک دن جب بہادر شاہ ظفر کی نماز پڑھنے کے بعد چھپر کھٹ کی طرف سے گزرے تھے اور وہاں اپنی بیگم کو منہ پر آبی دوپٹہ لیے ہوئے خوابیدہ دیکھ کر انھوں نے یہ مصرعہ کہا تھا

دیکھا آبی دوپٹہ منہ پر اس کے خواب میں

اور دربار میں پہنچ کر آپ کو یہ مصرعہ سنایا تھا تو آپ نے دوسرے ہی لمحہ مصرعۂ ثانی کیا کہا تھا؟

ذوق — برجِ آبی میں ہے مہ یا ماہِ روشن آب میں

شاد — ایک دن جب دربار میں آپ بھی حاضر تھے ایک مرشد زادے تشریف لائے۔ وہ شاید کسی مرشد زادی یا بیگمات میں سے کسی بیگم کی طرف سے کچھ عرض کرنے آئے تھے۔ انھوں نے آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ کہا اور رخصت ہونے لگے حکیم احسن اللہ خاں وہیں دربار میں موجود تھے انھوں نے عرض صاحبِ عالم! اس قدر جلدی یہ آنا کیا تھا یہ تشریف لے جانا کیا؟ تو بہادر شاہ ظفر کی زباں سے اس وقت نکلا

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اور آپ کی طرف دیکھ کر انھوں نے فرمایا کہ استاد دیکھا کیا صاف مصرعہ ہوا ہے تو آپ نے کچھ توقف کے بعد پورا شعر کیا کہہ دیا تھا؟

ذوق — لائی حیات آئے قضا لے چلی لے چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

شاد	اور بہادر شاہ ظفرؔ کی سرکار میں میاں محبوب علی خواجہ مختار کل تھے۔ لیکن تھے پرلے درجے کے قمار باز۔ ایک دن جب ظفرؔ ان سے باخوش ہو گئے تو میاں صاحب نے حج کا ارادہ کر لیا۔ آپ کو جب ان کے ارادے کا علم ہوا تو آپ نے برجستہ کیا مطلع کہا تھا؟

ذوقؔ	جو دل قمار خانے میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے

شاد	اور بہادر شاہ ظفرؔ کے بیٹے میرزا جواں بخت کی شادی کے موقعے پر جب میرزا غالبؔ نے سہرا کہہ کر حضور میں پیش کیا تو سہرے کا یہ مقطع پڑھ کر

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

ظفرؔ کو خیال ہوا کہ اس میں ہم پر چوٹ کی گئی ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے والا نہیں ہے اور ہم نے جو ذوقؔ کو استاد اور ملک الشعراء بنا دیا ہے، یہ سخن سے بعید ہے اور محض طرف داری ہے۔ چناں چہ اسی دن جب آپ بادشاہ کے حضور میں گئے تو ظفر نے وہ سہرا آپ کو دیتے ہوئے کہا کہ استاد تم بھی اس زمیں میں ایک سہرا ابھی کہہ دو۔ اور ذرا غالبؔ کے سہرے کے مقطعے پر نظر رکھنا، تو آپ نے وہیں بیٹھ کر جو سہرا لکھا تھا اس میں وہ شعر کون سا تھا جو آپ نے ظفرؔ کے ارشاد کی تکمیل کرتے ہوئے غالبؔ کے مقطعے کے جواب میں کہا تھا

ذوقؔ	جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

شاد	اور جب دیوان چند دلال شاداںؔ مدار المہام حیدر آباد دکن نے آپ کو ایک طرح کا مصرعہ اور نقد روپیہ بھیج کر مستقل طور پر حیدر آباد میں سکونت اختیار کرنے کی دعوت دی تھی تو آپ نے مصرعۂ طرح میں دو غزلہ بھیج دیا تھا۔ لیکن روپیہ نہ لیا تھا۔ یہ فرمائیے کہ دو غزلے کے ساتھ آپ نے چند لال کی دعوت کے سلسلے میں اظہارِ معذرت کرتے ہوئے کیا شعر کہہ کر بھیج دیا تھا؟

ذوقؔ	آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن!
کون جائے ذوقؔ! پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

شاد	سنا ہے سنگلاخ زمینوں کو پانی کرنا آپ کا محبوب ترین مشغلہ تھا، اور شاید یہ مشغلہ آپ نے شاہ نصیرؔ کی میراث اور مقابلہ میں پایا تھا۔ بہر حال چند سنگلاخ زمینوں کے مطلعے ارشاد فرمائیے!

ذوقؔ	پی بھی جا ذوقؔ! نہ کر پیش و پسِ جامِ شراب
لب پہ توبہ ترے دل میں ہوسِ جامِ شراب

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

جو کہو گے تم کہیں گے ہم بھی ہاں یوں ہی سہی
آپ کی یوں ہی خوشی ہے مہرباں یوں ہی سہی

شاد یہ بھی سنا ہے کہ جس مصرعۂ طرح میں مشکل ردیف و قوافی نہ ہوتے تھے، اس میں آپ کا شعر کہنے کو جی نہیں چاہتا تھا، کسی مشاعرے کے لیے جب کوئی آسان مصرعۂ طرح دے دیا گیا تھا، تو آپ نے اس کی شکایت کرتے ہوئے کون سا شعر کہا تھا؟

ذوق ذوقؔ! بازیٔ گہہ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں
ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو!

شاد اور آرٹ سے متعلق آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

ذوق لبیک و اذاں، ناقوس و جرس، یا خندۂ قلقل، نالۂ نے
دل کھینچنے میں ہاں کوئی ہو، پر ایک نوائے دلکش ہو

شاد آپ کے زیادہ تر اشعار ایسے ملتے ہیں جن پر خارجیت کی چھاپ ہوتی ہے جیسے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑ کنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی
کہے ہے خنجر قاتل سے یہ گلو میرا
کمی جو مجھ سے کرے تو پئے لہو میرا

اپنے کچھ ایسے شعر سنائیے جو فکری داخلیت کے آئینہ دار ہوں۔

ذوق آشیاں باغ میں ڈھونڈا جو قفس سے جاکر
ایک تنکا بھی نہ تھا بادِ صبا نے رکھا

برنگِ آئینہ چشم پر آب سے میری
گرانہ اشک گیا پانی آبرو میرا

بس کہ ہے نو روزنہ اپنا آفتاب بادہ سے

دورِ ساغر ہم کو ساقی! گردشِ یک سال ہے

شاہد اور آپ کا وہ مطلع کون سا ہے جس کے بارے میں صغیر بلگرامی کا کہنا ہے کہ اس کا جواب نہ ان سے ہوسکتا تھا، نہ کسی سے ہوا، نہ آئندہ ہوگا۔

ذوقؔ تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ

ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

شاہد قبلہ آپ کے شاگرد محمد حسین آزادؔ نے تو آپ کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اب ایسی امید ہی نہیں کہ آپ ایسا قادر الکلام شاعر پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ آزادؔ کے علاوہ بعض دوسرے اہلِ نظر نے بھی آپ کو میرزا غالبؔ پر فوقیت دی ہے اور انھوں نے آپ کو اردو کا بزرگ ترین اور اعلیٰ ترین شاعر قرار دیا ہے۔ کچھ معتبر اصحاب کے نزدیک آپ کو زبانِ اردو پر اور غالبؔ کو شعر گوئی پر زیادہ قدرت حاصل ہے۔ لیکن آج کل کے بیشتر نقاد آپ کی شاعری کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے، ان کے خیال میں محمد حسین آزادؔ آپ کو چاہے کچھ سمجھتے ہوں لیکن غزل میں آپ کا رتبہ بلند نہیں ہے اور غالبؔ کی تو آپ گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ آپ کی شاعری محض لفظی بازی گری ہے۔ اور آپ شعر کہنا نہیں صرف شعر بنانا جانتے ہیں اور اس میں آپ ایسے طاق ہیں کہ آسانی سے دھوکے میں ڈال دیتے ہیں۔ جیسے آپ اصلی شاعر ہوں۔ حالاں کہ اصلی شاعری آپ کے یہاں سرے سے مفقود ہے۔ اگرچہ فن شاعری سے ایک مصرعہ بھی خالی نہیں۔ اس سلسلے میں فراق گورکھپوری کی یہ رائے بھی

بہت اہم اور فکر انگریز ہے "جنہیں اردو تاریخ سے دل چسپی ہے اگر آج ان سے پوچھا جائے کہ دلی کے سب سے بڑے اردو شاعر کون سے ہیں تو وہ کہیں گے۔ غالب، مومن، ذوق۔ آج سے سو سال پہلے بھی یہی جواب ملتا اور یہی نام لیے جاتے۔ لیکن اس زمانے کے لوگ ناموں کی ترتیب بدل دیتے اور کہتے ذوق، مومن، غالب، پھر کیف اس ضمن میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟

ذوق	گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن،
اے ذوق اس جہان کو زیب اختلاف ہے

شاد	پھر بھی یہ تو فرمائیے کہ آپ اپنی نظر میں کیسے شاعر ہیں؟

ذوق	راست کہتا ہوں میں یہ بزمِ سخن میں دوستو!
ذوق کے آگے تو ہے لافِ غزل خوانی دروغ

شاد	اپنے ہم عصر شاعروں میں آپ کس بنا پر اپنے آپ کو مختلف سمجھتے ہیں؟

ذوق	شمع ساں بزمِ سخن یوں تو ہے اوروں سے بھی گرم
ذوق پر سب سے نرالا ہے یہ انداز اپنا

شاد	ایک اور بات بتائیے۔ آپ ایسے پر گو شاعر کا دیوان اتنا مختصر کیوں ہے؟

ذوق	ذوق کیوں کر ہو اپنا دیواں جمع
کہ نہیں خاطر پریشاں جمع

شاد	اور اس پریشاں خاطری کی وجہ آپ کے خیال میں کیا تھی؟

ذوق	ذوق امر تب کیوں کہ ہو دیواں، شکوۂ فرصت کس سے کریں ہم
باندھے گلے میں ہم نے اپنے آپ ظفر کے جھگڑے ہیں

شاد اپنی غزلوں کے بعض شعروں میں آپ نے لفظ عشق کا استعمال بھی کیا ہے۔ یہ عشق مادی اور مجازی تو معلوم نہیں ہوتا، خود ہی فرمائیے یہ کیسا عشق ہے؟

ذوقؔ فروغِ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لیے
یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لیے

شاد اس عشق کی آپ کے نزدیک تعریف کیا ہے؟

ذوقؔ جسے کہتے ہیں بحرِ عشق اس کے دو کنارے ہیں
ازل نام اس کنارے کا ابد نام اس کنارے کا

شاد ایسا عشق کرنے والے کی پہچان کیا ہے؟

ذوقؔ ازل سے یوں دلِ عاشق ہے نور کی قندیل
کہ جیسے عرشِ خدائے غفور کی قندیل

شاد کیا خیال ہے آپ کا، کیا دردِ محبت کا بیان ہوسکتا ہے؟

ذوقؔ بیان دردِ محبت جو ہو تو کیوں کر ہو
زبان دل کے لیے ہے نہ دل زباں کے لیے

شاد آزادؔ نے آپ کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ تصوف میں آپ کا ایک عالم خاص تھا۔ براہ کرم تصوف کے سلسلے میں بھی اپنے چند اشعار ارشاد فرمائیے۔

ذوقؔ مجھ میں اس میں ربط ہے گویا برنگِ بوئے گل
وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

غافل جو دم کی آمد و شد سے نہ ہووے تو
ہر دم ہے تجھ کو سیر وجود و عدم نصیب

ساغر دل کی تو واقف نہیں کیفیت سے
دیکھ عکس رخ ساقی ہے اسی جام میں خاص

وہ ہوں میں گیسوئے موجِ محیطِ اعظم وحشت
کہ ہے گھیرے ہوئے روئے زمیں کو پیچ و خم میرا

آپ آئینۂ ہستی میں ہے تو اپنا حریف
ورنہ یاں کون ہے جو تیرا مقابل ہوتا

شاد   بچپن کی یاد میں کوئی شعر کہا ہو تو وہ بھی سنائیے۔

ذوق   کہاں وہ موسم طفلی کہ ہم دامن سواروں میں
لیا کرتے تھے کارِ توسنِ رہوار دامن سے

شاد   اور عالمِ شباب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ذوق   عالم ہے زندگی میں زمانہ شباب کا
گلشن میں برگ برگ ہے پھول آفتاب کا

شاد   اور بڑھاپے میں آپ کیا محسوس کرتے رہے۔

ذوق   اب تو جانِ ناتواں کا ضعف سے یہ حال ہے
لب تلک بھی اس کا آجانا رہِ صد سال ہے

شاد   آپ متوسط اندام تھے نا! اپنے قدد قامت سے متعلق بھی آپ نے کوئی نہ کوئی شعر تو ضرور کہا ہو گا۔

ذوقؔ آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہوئے پست قامت ہو تو ہو

شاد آپ بادشاہ کے استاد تھے۔ پھر بھی شان و شکوہ اور مقبع سے اتنے دور کیوں تھے؟

ذوقؔ اے ذوقؔ تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

شاد محاورے استعمال کرنے کا شوق تو آپ کو زندگی بھر، بلکہ مرتے دم تلک رہا۔ جب ۱۸۵۹ء میں آپ قریب مرگ تھے تو حافظ غلام رسول ویرانؔ کی استدعا پر آپ نے پاؤں تلے سے زمیں نکل جانے کا محاورہ نظم کرتے ہوئے کیا شعر کہا تھا۔

ذوقؔ جو دل سے اپنے دم آتشیں نکل جائے
فلک کے پاؤں تلے سے زمین نکل جائے

شاد اور مرنے سے تین گھنٹے پہلے آپ نے کیا شعر فرمایا تھا؟

ذوقؔ کہتے ہیں ذوقؔ آج جہاں سے گذر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

شاد جیتے جی آپ کیا محسوس کرتے رہے کہ اس دنیائے فانی میں زندگی کیوں کر گزرتی ہے؟

ذوقؔ گزرتی عمر ہے یوں دورِ آسمانی میں
کہ جیسے جائے کوئی کشتی دُخانی میں

شاد اس دنیا کے انسان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ذوقؔ موت نے کردیا ناچار و گرنہ انساں
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا!

شاد آپ انسان کو خودبیں کیوں سمجھتے ہیں قبلہ، وہ بے چارہ تو مجبورِ محض ہے۔

ذوق اس جبر پر تو ذوقؔ! بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

شاد آپ کے تجربے کا حاصل کیا ہے؟ دنیا میں انسان کو کیوں کر زندگی بسر کرنی چاہیے؟

ذوق ہے باغِ جہاں میں تجھے گر ہمت عالی
کر گردنِ تسلیم کو خم اور زیادہ!

شاد آپ کی نظر میں انسان کا منصب کیا ہے؟

ذوق حق نے تجھ کو اک زباں دی اور دیے ہیں کان دو
اس کے یہ معنی کہے اک اور سنے انسان دو

شاد دنیا میں انسانی اقامت کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟

ذوق یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

شاد کیا رائے ہے آپ کی کیا آدمیت کا رشتہ علم سے ہے؟

ذوق آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

شاد آپ کے خیال میں دنیا میں ناموری کیوں کر حاصل کی جاسکتی ہے؟

ذوق نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

شاد	بات تو بہت اچھی کہی آپ نے! لیکن کاش ذرا شاعرانہ ڈھنگ سے کہی ہوتی۔ خیر یہ فرمائیے کہ فرشتے اور انسان میں آپ کسے افضل سمجھتے ہیں؟

ذوقؔ	جس انساں کو سگ دنیا نہ پایا
فرشتہ اس کا ہم پایا نہ پایا

شاد	لیکن فرشتے تو ہر کام کر سکتے ہیں قبلہ!

ذوقؔ	جو فرشتے کرتے ہیں۔ کر سکتا ہے انسان بھی
پر فرشتوں سے نہ ہو جو کام ہے انسان کا

شاد	کیا پھر اس دنیا میں آنے کا آپ کا جی نہیں چاہتا؟

ذوقؔ	اے ذوقؔ اگر ہے ہوش تو دنیا سے دور بھاگ!
اس مے کدے میں کام نہیں ہوشیار کا

شاد	تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس دنیا میں جینے کا کوئی مزا نہیں؟

ذوقؔ	نہیں جز بے مزگی کوئی مزہ دنیا میں
پر مزے دار بنا دیتے ہیں غفلت کے مزے

شاد	جنت میں آپ دل شاد تو ہیں نا؟

ذوقؔ	نہ پوچھو کہ دل شاد ہے یا حزیں ہے
خبر بھی نہیں یاں کہ ہے یا نہیں ہے

شاد	آخر میں یہ اور بتا دیجیے کہ ہستی میں زیادہ آرام ہے، یا عدم میں؟

ذوقؔ	ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں
جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا

☆☆☆

اسلم فرخی

دیوانِ ذوقؔ

دیوانِ ذوقؔ کی ترتیب آزادؔ کی ایک دیرینہ خواہش کا مظہر اور عقیدت و شیفتگی کی وہ مثال ہے جس نے آزادؔ و ذوقؔ دونوں کی ادبی شخصیتوں پر اثر ڈالا ہے۔ دیوانِ ذوقؔ مرتب کرنے کا خیال آزاد کو بڑی مدت سے تھا۔ چناں چہ انھوں نے اس خواہش کا اظہار آبِ حیات میں بھی کیا ہے، لکھتے ہیں۔ "استاد مرحوم کے صدہا شعروں کا حال راقم جانتا ہے کہ خود یاد ہیں یا ایک دو زبانوں پر ہیں۔ یہ نہ رہیں تو فراموشی کا مال ہے۔ کار ساز کریم ان کے مجموعے کو بھی تکمیل کو پہنچائے[1]۔ اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو گا کہ دیوانِ ذوقؔ کی ترتیب آزادؔ کی دیرینہ خواہش تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں سے پہلے وہ محمد اسمٰعیل ابنِ ذوقؔ کے ساتھ دیوان کی ترتیب میں کچھ عرصے مشغول بھی رہے تھے لیکن "آں دفتر[1] گاؤ خورد"۔ اس سلسلے میں آزادؔ لکھتے ہیں "ان (ذوقؔ) کی وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے کہ وہ بھی باپ کی طرح اکلوتے بیٹے تھے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں۔ متفرق غزلوں کے بستے اور بڑی بڑی پوٹیں تھیں۔ بہت سی تھیلیاں اور مٹکے تھے کہ جو کچھ کہتے تھے گویا بڑی احتیاط سے ان میں بھرتے جاتے تھے۔ ترتیب اس کی پسینے کی جگہ خون بہاتی تھی کیوں کہ بچپن سے لے کر دمِ واپسیں تک کا کلام انہیں میں تھا۔ اب بہت سی متفرق غزلیں بادشاہ کی، بہترین غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں۔ چناں چہ اول ان کی اپنی غزل اور قصاید انتخاب کر لیے۔ غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع ہوئیں۔ اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام کو میں نے جاری کیا مگر بااطمینان کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانے کا ورق الٹ جائے گا۔ عالم تہ و بالا ہو جائے گا۔ حسرتوں کے خون بہہ جائیں گے۔ دل کے ارمان دل ہی میں رہ جائیں گے۔ دفعتاً ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا چناں چہ افسوس ہے کہ خلیفہ

---

[1] آبِ حیات، ص، ۴۳۹۔

محمد اسمٰعیل ان کے فرزند جسمانی کے ساتھ ان کے فرزندِ روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے[1]۔ اس کے بعد کی داستان یہ ہے کہ انگریزی فوج آزاد کے گھر میں گھس آئی اور انھیں سب کچھ چھوڑ کر گھر سے نکلنا پڑا لیکن اس عالم میں بھی وہ استاد کے کلام کو نہیں بھولے اور چلتے وقت ان کی غزلوں کا جنگ بغل میں دبالیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد آزاد مختلف کاموں میں مشغول رہے اور دیوانِ ذوق کی ترتیب مکمل نہ ہو سکی۔ اس دوران میں ذوق کے ایک شاگرد اور حاضر باش حافظ ویران نے امراؤ مرزا انور اور ظہیر دہلوی کی اعانت سے ذوق کا دیوان مرتب کیا اور ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں اسے شائع کر دیا اس دیوان میں غزلیات کے اشعار کی تعداد ۱۸۳۳ تھی۔ مالک رام صاحب نے دیوانِ ذوق کے ایک اور نسخے کا ذکر کیا ہے جو ۱۸۵۹ء میں مطبع محمدی دہلی سے شائع ہوا تھا لیکن موصوف نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ۱۸۵۹ء کی تاریخ جعلی ہے وجہ یہ ہے کہ اس نسخے اور ویران کے ایڈیشن میں اشعار کی تعداد بالکل ایک ہے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ ترتیب اس میں بالعکس ہے۔ یعنی ویران کے نسخے میں پہلے قصاید ہیں اور پھر غزلیات اور اس نسخے میں پہلے غزلیات ہیں اور قصاید آخر میں۔ ویران نے اپنا دیوان رجسٹری کرا لیا تھا اس لیے مطبع محمدی کے نسخے کے ناشر نے قانونی گرفت سے بچنے کے لیے ترتیب بدل دی اور تاریخ پہلے کی ڈال دی[2]"۔

آزاد نے دیوانِ ذوق کی ترتیب کا کام ۱۸۸۷ء میں شروع کیا تھا لیکن وہ اپنے ایک خط مورخہ یکم ستمبر ۱۸۸۸ء میں لکھتے ہیں "میں نے 'سخن دان فارس' کو نظر ثانی کر کے رکھ دیا ہے چاہا کہ اب دربارِ اکبری کو سنبھالوں مگر مروت اور محبت نے اجازت نہ دی کیوں کہ استاد مرحوم شیخ ابراہیم ذوق کی بہت سی غزلیں قصیدے بے ترتیب پڑے ہیں۔ اور میں خوب جانتا ہوں کہ ان کا ترتیب دینے والا میرے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔ اگر میں ان کے باب میں بے پروائی کروں گا تو یہ ان کی محنت کا نتیجہ جو دریا میں سے قطرہ رہ گیا ہے بے موت مر جائے گا اور اس سے زیادہ افسوس کا مقام اور کیا ہوگا۔ ان کے حال پر افسوس نہیں یہ میری غیرت اور حمیت پر افسوس ہے چناں چہ اب اسے اس لیے سنبھالا ہے اور اس میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جس جس قصیدے یا غزل یا شعر کے موقعے پر کوئی تقریب یا کوئی معاملہ یا معرکہ خاص پیش آیا تھا وہ بھی نقل کر دوں کیوں کہ میں ہر وقت کا حاضر باش تھا۔ اور والد مرحوم اور وہ عالمِ طفولیت میں

۱۔ آبِ حیات، ص ص ۵۷-۴۵۶، (محمد اسمٰعیل فوق ۱۸۵۷ء میں مارے گئے تھے۔

۲۔ تلامذہ غالب، ص ۴۱

ساتھ رہے۔ آپ اس کے لطف کو تصور فرمایئے آج تک کسی شاعر کا دیوان ایسا مرتب نہ ہوا ہوگا خدا انجام کو پہنچائے[1]"۔ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترتیب کا کام ۱۸۸۸ء میں شروع ہوا تھا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس خط کی تاریخ غلط ہے۔ آزاد نے اگست ۱۸۸۷ء میں 'سخن دان فارس' پر نظر ثانی کر لی تھی۔ تیرہ مہینے تک کیا وہ صرف منصوبے ہی بناتے رہے تھے ہمارے خیال کی تصدیق آزاد کے ایک اور خط سے بھی ہوتی ہے جس کی تاریخ تحریر یکم فروری۔ ۱۸۸۸ء ہے اس خط میں جس کا مکمل متن ہم آگے چل کر پیش کریں گے آزاد لکھتے ہیں "خدا کا شکر ہے کہ اس فرض کے ادا کا وقت آ پہنچا اور اب صرف دس پندرہ دن کا کام رہ گیا ہے[2]"۔ اس خط کی روشنی میں آزاد کے پہلے خط کی تاریخ یکم ستمبر ۱۸۸۷ء ہونا چاہیے۔ ممکن ہے کسی بے احتیاط کاتب نے ۸۷ کو ۸۸ بنادیا ہو۔

ستمبر ۱۸۸۷ء میں آزاد نے دیوانِ ذوق کی ترتیب کا کام شروع کیا اور پورے دس مہینے تک شب و روز محنت کی۔ دیوانِ ذوق کے اختتامیے میں "نثر موزوں" کے عنواں سے وہ لکھتے ہیں "قلم کا مسافر زمین سے آسمان اور مکان سے لامکان تک بارہا چڑھتا اور اترتا رہا ہے۔ دس مہینے کے بعد آکر قلمدان میں دم لیا ہے"۔ اس اختتامیے میں دوسری جگہ لکھ رہے ہیں "لیکن عمروں کا ساتھ ہے اور دس مہینے دس رات آنکھوں کا تیل ٹپکایا ہے"۔ اس حساب سے دیوان کی ترتیب جون ۱۸۸۸ء میں مکمل ہوئی ہوگی لیکن آزاد کی دیوانگی سے اس کی اشاعت میں تعویق ہوئی۔ آغا محمد باقر کے بقول "اپنے شفیق استاد کا کلام انھوں نے نہایت جانفشانی سے مرتب کیا لیکن افسوس کہ وہ ان کے ہوش و حواس کے زمانے میں چھپ نہ سکا۔ والد مرحوم نے احباب کے تقاضوں سے اس کو چھپوادیا۔ داخلی اور خارجی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ دیوان کی اشاعت ۱۸۹۱ء میں ہوئی تھی۔ داخلی شہادت دیوانِ ذوق کا اختتامیہ ہے جس میں آزاد لکھتے ہیں "استاد کے کلام شاگرد کے لیے حقیقی اور تحقیقی بھائی ہوتے ہیں۔ اب ان سے رخصت کا وقت ہے۔ ہاں برادرانِ عزیز ایک حساب سے دو پشت اور دلی سے نکل کر چونتیس برس ہم ساتھ رہے۔ خارجی شہادت یہ ہے کہ ۱۸۹۱ء میں محمد سعید مدرس دہلی نے دیوان ذوق کا ایک انتخاب 'کارنامہ شوق' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ دیباچے میں انھوں نے صراحت کی ہے کہ انتخاب دیوان کے نسخے سے کیا گیا ہے۔ لیکن حال ہی میں آزاد کا مرتب کردہ دیوان بھی شائع ہو گیا ہے اس لیے اس کا انتخاب اصل انتخاب کے بعد صفحہ ۲۷ سے ۸۴

---

[1] مکتوبات آزاد، ص، ۳۷-۳۶۔

[2] آئینہ دلدار، محمد ابراہیم علی صدیقی، ص، ۱۴۔

تک پیش کیا گیا ہے۔ یہ دونوں شہادتیں ۱۸۹۱ء ہی نشان دہی کرتی ہیں اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیوان کی تکمیل ۱۸۸۸ء میں اور اشاعت ۱۸۹۱ء میں ہوئی۔

دیوانِ ذوقؔ کی ترتیب کے سلسلے میں آزادؔ نے اپنی بیاضوں، ذوقؔ کے مسودوں اور حافظ ویران کے نسخے سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ ذوقؔ کے دوسرے شاگردوں سے بھی فیض اٹھایا ہے۔ انھوں نے ہر جگہ سے استاد کا کلام حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چناں چہ ذوقؔ کے ایک شاگرد شاہ مذاقؔ میاں کو لکھتے ہیں:

"بندہ پرور ادام اللہ برکاتہم

تسلیم۔ آپ کو معلوم ہے کہ استاد مرحوم کا کلام اگر ان کے پاس سے باہر نکلتا تو ہمارے پاس آتا تھا اور کسی کو نہ دیتے تھے۔ دلی سے نکلتے پروردگار نے توفیق اور تائید الٰہی نے یاوری کی کہ ایک کتاب اور اکثر مسودے متفرق ان کے ہاتھوں کے میں لے کر نکلا۔ یہ کتاب وہی ہے جس میں کہ آپ بھی اپنے ہاتھ سے کچھ کچھ اشعار اپنے لکھ آئے ہیں۔ آپ کے بعد اس میں بہت کچھ اور لکھا گیا خدا کا شکر ہے کہ اس فرض کے ادا کا وقت آ پہنچا اور اب صرف دس پندرہ دن کا کام رہ گیا ہے۔

اس ہفتے پٹنے سے کسی خداترس بندے کی تحریر پہنچی اس نے آپ کا نامِ مبارک لکھا ہے کہ بدایوں میں ان کے پاس دو قصیدے استاد مرحوم کے ایسے ہیں کہ دیوانِ مطبوعہ میں نہیں ہیں۔ میں نے غور کیا تو سمجھ میں آیا عجیب نہیں جن دنوں آپ دلی میں تشریف رکھتے تھے والد مرحوم کی چھوٹی بیاض یا استاد مرحوم کے مسوداتِ خاص میں سے آپ نے دو قصیدے نقل کیے آپ وہ دونوں قصیدے عنایت فرمائیں تو اس مجموعے میں داخل کیے جائیں تا کہ اگر دیوانِ مطبوعہ میں نہیں مشتہر ہوئے تو اب مشتہر ہو جائیں۔ انھیں اللہ مغفرت کرے وہ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم لوگوں کو ابھی اللہ نے دسترس دے رکھی ہے واجب ہے کہ ان کی آرزوؤں کو پورا کرنے میں سعادت حاصل کریں۔ وہ آج کچھ نہیں کر سکتے قریب ہے وہ دن کہ ہم بھی نہ کر سکیں گے آج اگر ہم ان کی آرزوئیں پوری کریں گے تو خدا ہماری آرزوئیں پوری کرے ان کا فرزند نہ رہا۔ اللہ اسے مغفرت کرے۔ یہ فرزندانِ معنوی ہیں انھیں اللہ آپ کے اور میرے ہاتھوں عمر دیتا ہے۔

آپ کا تعلق تلمذ قدیمانہ کا ان کے ساتھ اور شفقت و محبت جو بندہ آزادؔ کے ساتھ ہے اس کا لحاظ کر کے امید قوی ہے کہ آپ دونوں قصیدے وہ اور جو اشعار اور آپ کے خیال میں ہوں

کہ دیوانِ مطبوعہ میں نہیں جلد مرحمت فرمائیں گے اور بندہ آزاد کو اوقاتِ مختلفہ میں دعائے خیر سے یاد فرمائیں گے[1]۔"

آزاد کے اس خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دیوان کی ترتیب کے لیے انھوں نے یہ ممکن ذریعہ استعمال کیا۔ جس شخص نے انھیں پٹنے سے یہ اطلاع دی تھی کہ بدایوں میں ذوق کے دو غیر مطبوعہ قصیدے موجود ہیں، اسے دیوان کی ترتیب کا حال یقیناً معلوم ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذوق کا غیر مطبوعہ کلام جمع کرنے کے سلسلے میں آزاد نے پٹنے بھی خط لکھا تھا۔ لیکن تعجب ہے کہ ہر جگہ کاغذی گھوڑے دوڑانے کے باوصف آزاد نے بعض ایسے ماخذ سے استفادہ نہ کیا جو ان کے سامنے یقیناً موجود ہوں گے ۱۲۷۹ھ میں دلی سے نگارستانِ سخن کے عنوان سے غزلیات کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ جس میں ذوق۔ مومن اور غالب کی غزلوں کا انتخاب تھا۔ اس مجموعے میں ذوق کا ایسا کلام بھی شامل ہے جو دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد میں موجود نہیں۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ کلام ویران والے نسخے میں بھی نہیں ہے۔ شاہ عطاالرحمٰن عطا کاکوی نے معاصر بابت اگست ۱۹۵۷ء اور دسمبر ۱۹۵۷ء میں ذوق کے ایسے کلام کی نشان دہی کی ہے جو نگارستان میں موجود ہے لیکن آزاد کے نسخے میں شامل نہیں ہے۔ یہ کلام سولہ غزلوں اور چھ متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ کہنا تو ممکن نہیں کہ نگارستان آزاد کی نظر سے نہ گزری ہو۔ اس کے باوجود ان کا اس کلام کو اپنے مرتبہ دیوان میں شامل نہ کرنا تعجب خیز نہیں تو اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ اس عدمِ ادخال کا جواز صرف یہ ہو سکتا ہے کہ نگارستانِ سخن میں شائع ہونے والے کلام کو آزاد ذوق کا کلام تسلیم نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس سلسلے میں دو باتیں ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہیں۔ پہلی تو یہ کہ یہ مجموعہ ذوق کے انتقال کے آٹھ برس بعد شائع ہوا تھا۔ اس زمانے میں ذوق کے بیشتر اچھے تلامذہ زندہ تھے۔ اگر یہ کلام الحاقی ہوتا تو وہ لوگ ضرور احتجاج کرتے لیکن ہم اس قسم کے کسی احتجاج سے واقف نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کلام کا اسلوبِ انداز۔ طرزِ ادا اور بندش صد فی صدی ذوق کی ہیں۔ نگارستان کی ان غزلوں میں ذوق کا رنگ پوری طرح نمایاں ہے اس بنا پر انہیں ذوق کی ملکیت کرنے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ آزاد کی ایک اور فروگذاشت سامنے آتی ہے مجموعہ نغز کا قلمی نسخہ آزاد کے پاس موجود تھا۔ آبِ حیات کے سلسلے میں آزاد نے اس سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا ہے لیکن ترجمہ ذوق میں ذوق کے جو دو شعر قدرت اللہ قاسم نے منتخب کیے ہیں انھیں بھی آزاد اپنے مرتبہ دیوان میں شامل نہیں

---

[1] آمینہ، الہ دار، ص، ۱۵۰۔ ۱۴۔

کیا۔ گلشنِ بے خار میں ذوق کا جو انتخاب شامل ہے اس سے بھی آزاد نے فائدہ نہیں اٹھایا اور بعض اشعار کو شامل نہیں کیا۔ گلستانِ سخن مولفہ صابر دہلوی۔ طبقات الشعراء مولفہ کریم الدین اور آثار الصنادید مولفہ سر سید میں بھی ذوق کے کلام کا انتخاب موجود ہے۔ آزاد نے اسے بھی توجہ سے نہیں دیکھا اور نہ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، مروّجہ تذکروں سے ذوق کا کلام جمع نہ کرنا آزاد کی ایسی فروگذاشت ہے جس کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف تو وہ ہر ممکن ذریعے سے ذوق کا کلام جمع کرنے کے خواہش مند ہیں اور دوسری طرف وہ ان تذکروں سے اغماض برتتے ہیں جو ان کے سامنے موجود ہیں۔ یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے۔ ان تذکروں کے علاوہ بہادر شاہ ظفر نے ذوق کی بعض غزلوں پر مخمس کہے ہیں جو کلیاتِ ظفر میں شامل ہیں۔ آزاد نے اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھایا ان فروگذاشتوں کی روشنی میں حافظ محمود شیرانی کی یہ رائے غلط نہیں کہ حضرت آزاد نے اپنا دیوانِ ذوق شائع کرتے وقت مزید تلاش سے غالباً کام نہیں لیا۔ ان کا بڑا ماخذ نور الصدر جنگ اور حافظ ویران والا دیوان ہیں[1]"۔

آزاد نے دیوانِ ذوق مرتب کرنے میں غیر معمولی کاوش سے کام لیا تھا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ ویران والے نسخے میں غزلیات کے اشعار کی تعداد ۱۸۳۳ تھی۔ آزاد کے نسخے میں یہ تعداد ۳۴۱۲ ہو گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آزاد کے نسخے میں اشعار کی تعداد تقریباً دگنی ہو گئی ہے۔ اگر اشعار کے سلسلے میں آزاد اپنی اپج سے جس کی تفصیل آگے آئے گی کام نہ لیتے تو ان کی کاوش یقیناً مبارک باد کی مستحق ہوتی لیکن ان کی جدتِ طبع اور حد سے بڑھی ہوئی استاد پرستی نے ان کے اس کارنامے پر پانی پھیر دیا۔

دیوان کی ابتدا میں آزاد نے ذوق کی سوانح عمری۔ خاص حالاتِ طبعی، عادات اور ان کے اندازِ کلام پر رائے لکھی ہے۔ آبِ حیات کے ضمن میں ہم ان کا جائزہ لے چکے ہیں۔ اس بیان کو یہاں دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے ہم اصل دیوان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

آزاد کے مرتبہ دیوان کی ردیف الف میں باسٹھ غزلیں، چار چار شعر کی دو غزلیں اور پچیس متفرق شعر ہیں۔ نسخہ ویران میں ردیف الف کی غزلوں کی تعداد صرف پینتالیس تھی۔ اسی طرح باقی ردیفوں کا بھی حال ہے۔ لیکن صرف اضافہ ہی نسخہ آزاد کی خصوصیت نہیں بلکہ اس کی اصل خصوصیت متن کا حد سے بڑھا ہوا اختلاف ہے۔ ویران کے نسخے میں کلام ذوق کا

---

[1] شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد اور دیوانِ ذوق، رسالہ ہندوستانی، اکتوبر، ۱۹۴۴ء

جو متن ملتا ہے تذکروں میں بھی وہی متن موجود ہے لیکن آزاد کے نسخے میں اکثر اشعار کا متن مختلف ہے۔ اس سلسلے میں ردیف الف سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

متنِ آزاد	متنِ ویران
تفتہ دل وہ ہوں کہ آکر داغِ سوزاں پر مرے	تفتہ دل وہ ہوں کہ میرے داغِ سوزاں کے لیے
اڑ گیا مرہم کے پھاہے سے اثر کافور کا	گرمیِ مرہم سے اڑ جائے اثر کافور کا

متنِ آزاد	متنِ ویران
خالِ عارض ہے جو ہندوئے خدا ترس تو کیا	خالِ عارض ترا ہندو ہے بلا سے کافر
ہم سیہ بختوں کے حق میں تو ہے قصاب بنا	تیرہ بختوں کے بچے ذبح تو قصاب بنا

متنِ آزاد	متنِ ویران
سراغِ عمرِ رفتہ ہاتھ کیا آئے	سراغِ عمرِ رفتہ ہو تو کیوں کر
کہیں جس کا نشانِ پانہ پایا	کہیں جس کا نشانِ پانہ پایا

متنِ آزاد	متنِ ویران
فلک کے گنبدِ بے در سے ہم تو	فلک کے گنبدِ بے در سے کب کے
نکل جاتے مگر رستہ نہ پایا	نکل جاتے مگر رستہ نہ پایا

متنِ آزاد	متنِ ویران
یہی ہر دم ہے زخمِ دل کو رونا	کہے کیا ہائے زخمِ دل ہمارا
دہن پایا لبِ گویا نہ پایا	دہن پایا لبِ گویا نہ پایا

متنِ آزاد	متنِ ویران
یوں تہِ خاکی میں دل روشن ہمارا ہو گیا	نام یوں پستی میں بالا تر ہمارا ہو گیا
جس طرح پانی کنوئیں کی تہہ میں تارا ہو گیا	جس طرح پانی کنوئیں کی تہہ میں تارا ہو گیا

متنِ آزاد

چشمِ مست یار میں آخر ہوئی سرخی عیاں
لو ہمارا خونِ پنہاں آشکارا ہو گیا

متنِ دیوان

دی شہادت نشے کی سرخی سے چشمِ یار نے
خوں رہا اپنا نہ پنہاں آشکارا ہو گیا

متنِ آزاد

جو رقیب زر بکف ہیں کبھی ہوتے سر بکف بھی
ترے جاں نثار کا گر انہیں دست جود ہوتا

متنِ دیوان

وہ ہیں کیا جو زر بکف ہیں یہ ہمیشہ سر بکف ہے
ترے جاں نثار کا سا نہیں دستِ جود ہوتا

متنِ آزاد

کون سنتا ہے تری زلف میں دل کی فریاد
کہ مسلماں کو ہے کافر کے عمل میں مارا

متنِ دیوان

کون فریاد سنے زلف میں دل کی تو نے
اس مسلمان کو کافر کے عمل میں مارا

متنِ آزاد

جس گھر میں ہو لڑائی وہاں آدمی نہیں
کانٹا سمجھے سینے کا یا گل کیسر کا

متنِ دیوان

جس کے سبب لڑائی ہو وہ آدمی نہیں
کانٹا سمجھے سینے کا یا گل کیسر کا

متنِ آزاد

اے ستم گر جو تیرے تیر نہیں کشتہ خوں
تو کھلا رہتا ہے منہ کس لیے سوفاروں کا

متنِ دیوان

ہیں کماندار تیرے تیر جو آتشنہ خوں
منہ کھلا رہتا ہے اس واسطے سوفاروں کا

متنِ آزاد

پنجہ مہر کو بھی خونِ شفق میں ہر صبح
غوطے کیا کیا ہے ترا دستِ حنائی دیتا

متنِ دیوان

پنجہ مہر کو خونِ شفقی میں ہر روز
غوطے کیا کیا ہے ترا دستِ حنائی دیتا

متنِ آزاد

ساغرے بھی ترے کشتہ انداز کو یار

متنِ دیوان

خوگر ناز ہوں کس کا کہ مجھے ساغرے

بوسۂ لب نہیں بے چشم نمائی دیتا — بوسۂ لب نہیں بے چشم نمائی دیتا

متنِ آزاد

نکتہ اس بت سے کبھی لیویں گے ہم ایمان کا
ایسی کیا جلدی ہے جلدی کام ہے شیطان کا

متنِ ویراں

ہو تو عاشق سوچ کر اس دشمنِ ایمان کا
دل نہ کر جلدی کہ جلدی کام ہے شیطان کا

متنِ آزاد

جگر زخمی ہے اور دل لوٹتا ہے تم نے کیا جانے
ادھر ملا تو کیا ملا ادھر ملا تو کیا ملا

متنِ ویراں

جگر دل دونوں پہلو میں ہیں زخمی اس نے کیا جانے
اِدھر ملا تو کیا ملا اُدھر ملا تو کیا ملا

متنِ آزاد

تو بر میں ہے مگر ہے مری آنکھ سوئے در
لپکا جو پڑ گیا ہے مجھے انتظار کا

متنِ ویراں

ہے عین وصل میں بھی مری آنکھ سوئے در
لپکا جو پڑ گیا ہے مجھے انتظار کا

متنِ آزاد

خطر ہے خون سے دل پائمال کے کیسا
بچا ہے دیکھنا دامن سنبھال کے کیسے

متنِ ویراں

ہمارے خون سے دل پائمال کے کیسے
چلا ہے دیکھو وہ دامن سنبھال کے

متنِ آزاد

دل سے کہتا ہوں کہ تو ساتھ نہ لیجا مجھ کو
جا کے میں واں ترے قابو سے نکل جاوں گا

متنِ ویراں

دل سے کہتا ہوں کہ تو ساتھ نہ لیجا مجھ کو
ورنہ میں جا کے وہاں دیکھ مچل جاؤں گا

متنِ آزاد

دیکھ کر کوئے صنم کہتا ہے یہ پاس ادب
ہوں جو خورشید تو یاں سر ہی کے بل جاوں گا

متنِ ویراں

کوچۂ یار میں جاؤں گا تو مثل خورشید
پاس آداب سے میں سر ہی کے بل جاؤں گا

یہ مثالیں کسی کاوش کے بغیر اور ایسے اشعار کی پیش کی گئی ہیں جن کے پورے پورے

مصرعوں میں تبدیلی پائی ہے۔ لفظی تبدیلی کی تمام و کمال نشان دہی کی جائے تو اچھی خاصی کتاب مرتب ہو جائے تاہم حافظ محمود شیرانی نے اپنے عالمانہ مضمون آزاد اور دیوانِ ذوق میں اس قسم کی بیشتر تبدیلیوں کو واضح کیا ہے۔ ویران اور آزاد دونوں کے متن اشعار سے جو بات فوراً واضح ہو جاتی ہے کہ آزاد کے یہاں جو تبدیلی ہے اس کی وجہ سے ذوق کے اکثر اشعار سست ہو گئے ہیں۔ وہ روانی اور برجستگی جو ذوق کے کلام کی خصوصیت ہے ان اشعار میں نہیں ملتی۔ اس کے ساتھ ایک اور اہم سوال بھی سامنے آتا ہے۔ آبِ حیات دیوانِ ذوق سے پہلے شائع ہو چکی تھی۔ اس کی طبع اول میں ذوق کی کل آٹھ غزلیں انتخاب میں شامل تھیں طبع ثانی میں ان کی تعداد سات رہ گئی۔ آبِ حیات اور دیوانِ ذوق کی غزلوں کے متن میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔

آبِ حیات	دیوانِ ذوق
مے عشرت طلب کرتے تھے ناحق آسماں سے ہم	مئے عشرت کا تھا خم خانہ افلاک پر دھوکا
کہ آخر جب اسے دیکھا فقط خالی سبو دیکھا	کہ تھا لبریزِ غم اس غم کدے سے جو سبو نکلا

آبِ حیات	دیوانِ ذوق
پنجاب میں بھی وہ نہ رہی آب و تابِ حسن	تھا ذوق پہلے دلی میں پنجاب کا سا حسن
اے ذوق پانی اب تو وہ ملتان بہہ گیا	پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہہ گیا

آبِ حیات	دیوانِ ذوق
کس دم نہیں ہوتا قلقِ ہجر ہے مجھ کو	کس دم نہیں گھٹتا مرا دم سینے میں غم سے
کس وقت مرا منہ کو کلیجہ نہیں آتا	کس وقت مرا منھ کو کلیجہ نہیں آتا

آبِ حیات	دیوانِ ذوق
مزے یہ دل کے لیے تھے نہ تھے زبان کے لیے	مزے تو دل کو ملے تھے ہوئے زباں کے لیے
سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لیے	پہ ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لیے

آبِ حیات

فروغِ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لیے
یہی چراغ ہے اس تیرہ خاک داں کے لیے

دیوانِ ذوق

فروغِ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لیے
کہ یہ چراغ ہے اس تیرہ خاک داں کے لیے

آبِ حیات

حجر کے چومنے ہی پر ہے حج کعبہ اگر
تو بوسے ہم نے بھی اس سنگِ آستاں کے لیے

دیوانِ ذوق

جو سنگِ کعبہ کے بوسے میں حج کعبہ ہے شیخ
تو بوسے ہم نے بھی اس سنگِ آستاں کے لیے

آبِ حیات

نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کو یہ شے
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لیے

دیوانِ ذوق

نہ دینا ہاتھ سے تم راستی کہ عالم میں
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لیے

آبِ حیات

جو پاس مہر و محبت کہیں یہاں بکتا
تو ہم بھی لیتے کسی اپنے مہرباں کے لیے

دیوانِ ذوق

دکانِ حسن میں رکھتے نہیں متاعِ وفا
وگرنہ لیتے ہم اک اپنے مہرباں کے لیے

آبِ حیات

خلش سے عشق کے ہے خارِ پیرہن تن زار
ہمیشہ اس ترے مجنونِ ناتواں کے لیے

دیوانِ ذوق

خلش سے عشق کے ہے خارِ پیرہن اے یار
یہ جان اس ترے مجنونِ ناتواں کے لیے

آبِ حیات

تپش سے عشق کی یہ حال ہے مرا گویا
بجائے مغز ہے سیمابِ استخواں کے لیے

دیوانِ ذوق

الٰہی سوز محبت سے اڑتا ہے تنِ زار
کہ لایا عشق ہے سیمابِ استخواں کے لیے

آبِ حیات

نہ لوحِ گور پہ مستوں کے ہو نہ تعویذ

دیوانِ ذوق

مری تو گور پہ جام و سبو کی ہو تصویر

جو ہو تو خشتِ خم ے کوئی نشاں کے لیے　　　کہ یادگار زمانہ رہے نشاں کے لیے

آبِ حیات　　　دیوانِ غالب

اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس　　　امید ہوگئی ہمسایہ ورنہ خانۂ یاس
بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لیے　　　بہشت تھا ہمیں آرام جاوداں کے لیے

آبِ حیات　　　دیوانِ ذوق

وہ مول لیتے ہیں جس دم کوئی نئی تلوار　　　نگاہ ناز نے دیکھے ہیں جو ہر آج اپنے
لگاتے پہلے مجھی پر ہیں امتحاں کے لیے　　　دل اپنا ہم کو بھی یاد آیا امتحاں کے لیے

آبِ حیات　　　دیوانِ ذوق

صریح چشم سخن گو تری کہے نہ کہے　　　تمھاری نرگس بیمار نے جو کی تھی نگاہ
جواب صاف ہے پر طاقت و تواں کے لیے　　　وہی جواب ہوا طاقت و تواں کے لیے

آبِ حیات　　　دیوانِ ذوق

رہے ہے ہول کہ برہم نہ ہو مزاج کہیں　　　مزاج ان کا نہ بجلی ہے اور نہ ہے سیماب
بجا ہے ہول دل اس کے مزاج داں کے لیے　　　خطر جو ہے تو یہی ہے مزاج داں کے لیے

آبِ حیات　　　دیوانِ ذوق

مثال نے ہے مرا جب تلک کہ دم میں دم　　　نہیں ہوں نے مگر اتنا مجھے بھی ہے معلوم
فغاں ہے میرے لیے اور میں فغاں کے لیے　　　فغاں ہے میرے لیے اور میں فغاں کے لیے

آبِ حیات　　　دیوانِ غالب

بلند ہووے اگر کوئی میرا شعلہ آہ　　　اڑا کے آہ کا شعلہ کبھی بنائیں گے ہم
تو ایک اور ہو خورشید آسماں کے لیے　　　شب فراق میں خورشید آسماں کے لیے

دیوانِ ذوقؔ	آبِ حیات
بنایا' ذوقؔ جو انساں کو اس نے جزوِ ضعیف	بنایا آدمی کو ذوقؔ ایک جزوِ ضعیف
تو اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لیے	ور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لیے

بات آبِ حیات تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ اور آگے بڑھتی ہے۔ بیاضِ آزادؔ کے عنوان سے آغا محمد طاہر نے ۲۳ عیسوی میں آزادؔ کی ایک بیاض شائع کی جس میں آزادؔ نے اپنے پسندیدہ اشعار لکھے ہیں۔ اس میں انتخاب ذوقؔ کے اشعار بھی شامل ہیں۔ بیاضِ آزاد اور دیوانِ ذوقؔ کے بعض اشعار میں بھی متن کا اختلاف پایا جاتا ہے جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

دیوانِ ذوقؔ	بیاضِ آزادؔ
مئے عشرت کا تھا خم خانہ افلاک پر دھوکا	مئے عشرت طلب کرتے تھے ناحق آسماں سے ہم
کہ تھا لبریزِ غم اس غم کدے سے جو سبو نکلا	کہ آخر جب اسے دیکھا فقط خالی سبو نکلا
دیوانِ ذوقؔ	بیاضِ آزادؔ
کس دم نہیں گھٹتا مرا دم سینے میں غم سے	کس دم نہیں ہوتا قلق ہجر ہے مجھ کو
کس وقت مرا منھ کو کلیجہ نہیں آتا	کس وقت مرا منھ کو کلیجہ نہیں آتا
دیوانِ ذوقؔ	بیاضِ آزادؔ
دل مانگتا مفت اور پھر اس پہ تقاضہ	دل مانگتا ہے مفت پھر اس پر یہ تقاضہ
کچھ قرض تو بندے پہ تمھارا نہیں آتا	کچھ قرض تو بندے پہ تمھارا نہیں آتا
دیوانِ ذوقؔ	بیاضِ آزادؔ
ہر گام پہ رکھے ہے وہ یہ ہوش نقشِ پا	رکھتا بہ ہر قدم ہے وہ یہ ہوش نقشِ پا
ہو خاک عاشقاں نہ ہم آغوش نقشِ پا	ہو خاک عاشقاں نہ ہم آغوش نقشِ پا

بیاضِ آزاد

ترا سنگھار بھی ہے ایک غضب کہ جائے گھر
پروئے زلف مسلسل کے تار تار میں دل

دیوانِ ذوق

ترا سنگھار بھی ہے وہ بلا کہ جائے گھر
پروئے زلفِ مسلسل کے تار تار میں دل

بیاضِ آزاد

خواہ پھرتا ہے فلک اور خواہ پھرتی ہے زمیں
پر ہمارے واسطے یاں منزلِ راحت نہیں

دیوانِ ذوق

خواہ گردش ہے زمیں کو خواہ پھرتا ہے فلک
پر ہمیں زیرِ فلک سر منزلِ راحت نہیں

بیاضِ آزاد

اس کے گھر لے چلا مجھے دیکھو
دلِ خانہ خراب کی باتیں

دیوانِ ذوق

پھر مجھے لے چلا ادھر دیکھو
دلِ خانہ خراب کی باتیں

بیاضِ آزاد

ناخن نہ دے خدا تجھے اے پنجۂ جنوں
ٹکڑے اڑاوے جسم کے تو پیرہن کے ساتھ

دیوانِ ذوق

دست جنوں نہ دے تجھے ناخن خدا کہ تو
ٹکڑے اڑاوے تن کے مرے پیرہن کے ساتھ

بیاضِ آزاد

اللہ رے تابِ حسن کہ اس کا دُرِ بلاق
چشمک زنی کرے ہے سہیل یمن کے ساتھ

دیوانِ ذوق

لب پر ترے پسینے کی بوند اے عقیقِ لب
چشمک زنی کرے ہے سہیل یمن کے ساتھ

بیاضِ آزاد

ہوائے زلف کو چھیڑا اور اپنا دل لرزتا ہے
کہیں ایسا نہ ہووے ہم سے وہ کافر برا سمجھے

دیوانِ ذوق

ہوا نے زلف کو چھیڑا اور اپنا دم الجھتا ہے
کہیں ایسا نہ ہووے کہ ہم سے وہ کافر برا سمجھے

بیاضِ آزاد

ملمد، طاقت کہاں ہے ضعف سے سینے میں دم

دیوانِ ذوق

دم رکی ہے سینے میں آکر ضعف سے یہ گفتگو

دیکھیے لب تک مجھے کیوں کر خدا پہنچائے ہے   دیکھیے لب تک مجھے کیوں کر خدا پہنچائے ہے

رفعِ شر کے خیال سے یہ تسلیم کرنا ممکن تھا کہ آزاد کے پاس کلام ذوق کا جو جنگ تھا اس میں زیادہ تر غزلیں اصلاح شدہ تھیں اور نظر ثانی خود ذوق کی تھی لیکن آبِ حیات، بیاضِ آزاد اور دیوان ذوق کی غزلوں میں جو فرق ہے اس کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی۔ آزاد نے پہلے ایک متن شائع کیا پھر دوسرا اور انھوں نے اس تبدیلی کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ اس بناء پر حافظ محمود شیرانی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ تمام تبدیلیاں یا اصلاحیں آزاد کے قلم کی رہینِ منت ہیں۔ حافظ صاحب نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کئی دلیلیں پیش کی ہیں۔ ان کی دلیلیں یہ ہیں کہ آزاد نے ذوق کی زبان کی قدامت دور کرنے اور اسے اپنے زمانے کے مطابق بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ مثلاً ذوق کے عہد میں گوالیری، برج بھاشا طرز کا حال جو مضارع پر "ہے" کے اضافے سے بنتا ہے رائج تھا اور ٹکسالی مانا جاتا تھا۔ آزاد کے عہد میں یہ حال متروک تھا۔ چناں چہ انھوں نے اس کو ذوق کے کلام سے نکالنے کی کوشش کی ہے ذوق نے "پر" کا لفظ اپنے عہد کے مطابق استعمال کیا تھا۔ نسخہ آزاد میں اس کے بجائے "پہ" ملتا ہے۔ ذوق کے یہاں مضارع ہمزہ کے ساتھ "جائے" "لائے" آتا ہے۔ آزاد 'واؤ' کے ساتھ جاوے لاوے وغیرہ پسند کرتے ہیں۔ قدیم متروک الفاظ مثلاً باؤ۔ چلون۔ کانسہ۔ جائے۔ تلک۔ جو ذوق کے عہد اور کلام میں عام تھے آزاد نے انھیں بدل دیا ہے۔ فارسی طرز کی جمع جو الف نون سے بنتی ہے ذوق کے کلام میں تھی۔ آزاد نے اسے ترک کر دیا ہے۔ آزاد نے فارسی کے ظرفیہ (در اور بہ) کے ترجمے "میں" کی جگہ اردو کے محاورے کے مطابق "سے" کو استعمال کیا ہے۔ اعلان نون جو ذوق کے عہد میں عام تھا آزاد نے اسے ترک کیا ہے۔ ذوق نے جہاں 'ہی' استعمال کیا تھا۔ آزاد نے وہاں "بھی" استعمال کیا ہے۔ اور فارسی اثر کی تخفیف کی کوشش کی ہے۔ شیرانی نے اپنی ہر دلیل کے ساتھ متعدد مثالیں بھی پیش کی ہیں جنھیں ہم نے طوالت کے خوف سے ترک کر دیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ذوق اپنے عہد کی زبان چھوڑ کر آزاد کے عہد کی زبان نہیں لکھ سکتے تھے۔ زبان کی اصلاحوں سے قطع نظر یہ بات بھی قابل غور کے حافظ ویران آزاد کے مقابلے میں ذوق سے زیادہ قریب اور حاضر باش تھے۔ انھیں اپنے استاد کے کلام کا بیشتر حصہ یاد تھا لیکن وہ ان تمام اصلاحوں سے بے خبر نظر آتے ہیں۔ تذکرے اور انتخاب بھی انھیں کے حق میں ہیں اور ان کے شائع کیے ہوئے متن کی تصدیق کرتے ہیں۔ تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ آزاد کے نسخے میں جتنی اصلاحیں ملتی ہیں ان کا ذمہ دار آزاد ہی کو ٹھہرایا جائے۔ آزاد نے استاد ذوق کی قدامت زبان کو دور کرنے

اور ان کے بعض اشعار کو معنی و مطالب کے اعتبار سے بلند کرنے کی غرض سے اس بدعت کی بنا ڈالی۔ اگر چہ ان سے پہلے اسیر اپنے استاد مصحفی کے کلام پر اس قسم کی اصلاح دے چکے تھے تاہم اس سے آزاد کا بارِ گناہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ شیرانی نے معنی و مطالب کے اعتبار سے بھی متنِ دیوان اور متنِ آزاد کا بہ نظرِ غائر تجزیہ کیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آزاد نے ذوق کے کلام کو ترقی دینے کی دھن میں اسے پست تر کر دیا ہے۔ آبِ حیات اور دیوانِ ذوق کی غزلوں کا موازنہ شیرانی کی اس رائے کی پرزور تائید کرتا ہے۔ یہ استاد پرستی بھی عجیب ہے کہ شاگرد استاد کے اچھے خاصے کلام پر اصلاح دیتا ہے اور اسے پست بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔

بات اگر یہیں تک رہتی تو شاید آزاد اتنے قابلِ ملامت نہ سمجھے جاتے لیکن انھوں نے اصلاح پر بھی قناعت نہ کی بلکہ استاد کی شہرت میں چار چاند لگانے کی غرض سے خود کچھ غزلیں کہہ کر دیوان میں شامل کر دیں۔ آزاد کے عہد ہی میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ انھوں نے دیوانِ ذوق میں اپنے شعر بھی شامل کر دیے ہیں۔ چناں چہ ان کے ایک شاگرد احمد حسین خاں نے ۱۸۹۵ عیسوی میں حیاتِ ذوق شائع کی، اس کتاب میں تلامذۂ ذوق کے سلسلے میں آزاد کا ذکر بھی ہے اور یہ عبارت بھی ملحق ہے 'اب حال ہی میں مولوی آزاد نے بھی دیوانِ ذوق نیا چھپوایا ہے۔ مولوی آزاد کے ایڈیشن کی نسبت ایک صاحب کہنے لگے کہ اس میں انھوں نے بہت سی اپنی غزلیں ملا دی ہیں چناں چہ وہ کہنے لگا کہ میں ان کے کتب خانے میں جو اکبری دروازے کے باہر سوایا تھا جایا کرتا تھا اور اکثر دیکھا کرتا تھا کہ مولوی صاحب طبیعت سے اشعار گھڑ کر نا تمام غزلوں میں شامل کر دیتے تھے۔ دروغ بر گردن راوی۔ یہ بات قرین قیاس نہیں "در ہر دہن تنگ نبات دگر است مولوی محمد حسین کا انداز اور ہے اور شیخ مرحوم کا اور تھا[1]۔ اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ آزاد کے عہد ہی میں اس بدگمانی کی ابتدا ہو چکی تھی۔ خم خانہ جاوید میں بھی اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ لالہ سری رام اس سلسلے میں لکھتے ہیں "ذوق کا ایک دیوان خاص اپنے اہتمام سے مرتب کیا ہے۔ بعض لوگوں کا اس کی نسبت خیال ہے کہ آپ نے اس میں جا بجا تصرف کیا ہے[2]۔ یہ بدگمانی بدگمانی ہی رہتی لیکن خوش قسمتی سے حافظ محمود شیرانی کو آزاد کے پرانے کاغذات میں چودہ ایسی غزلوں کے مسودے دستیاب ہو گئے جو دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد میں موجود ہیں لیکن نسخہ دیوان سے غائب ہیں۔ یہ

---

۱ حیاتِ ذوق۔ احمد حسن خاں ص ۴۲

۲ خم خانۂ جاوید۔ جلد ۱۔ ص ۳۷

نسخے آزاد کی تحریر میں ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزلیں آزاد نے خود کہی ہیں۔ ان غزلوں کی فہرست یہ ہے ۔

۱۔ ہم سے ظاہر و پنہاں جو اس غارت گر کے جھگڑے ہیں۔

۲۔ خدا نے میرے دیا سینہ لالہ زار مجھے۔

۳۔ مرض عشق جسے ہو اسے کیا یادر ہے۔

۴۔ چشم قاتل ہمیں کیوں کر نہ بھلا یادر ہے۔

۵۔ تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر میں کیا ہے۔

۶۔ پریرو کیا ستم گر پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے۔

۷۔ نہ کھینچو عاشقِ تشنہ جگر کے تیر پہلو سے۔

۸۔ برق میرا آشیاں کب کا جلا کر لے گئی۔

۹۔ حدِ رقم سے وصفِ جبیں ہے صنم پرے۔

۱۰۔ ذکرِ مژگاں تیرا جس کے روبرو نکلا کرے۔

۱۱۔ خم ابرو اجب یار نظر آتا ہے۔

۱۲۔ دکھلا نہ خال تاف تو اے گل بدن مجھے۔

۱۳۔ مار کر تیر جو وہ دلبرِ جانی مانگے۔

۱۴۔ نہ دیں گواہی جو داغ کہن نہیں دیتے۔

تیرانی کے بقول ان مسودوں میں بعض کے کاغذ طالب علموں کی امتحان کی کاپیوں سے لیے گئے ہیں ۔ دو کاغذ نارتھ ویسٹرن ریلوے کے مطبوعہ فارموں میں ہیں ۔ جو جنوری ۱۸۸۸ عیسوی میں چھپے تھے ۔ ایک کاغذ ڈاکٹر تعلیمات پنجاب کے دفتر سے مارچ ۱۸۸۷ عیسوی کی تاریخ کی آزاد کے نام کی چھٹی ہے ۔ اس تفصیل سے یہ معلوم ہو جاتا ہے ۔ کہ یہ مسودے ذوق کے نہیں ہو سکتے ۔ اپنے مضمون آزاد اور دیوان ذوق میں شیرانی نے ان مسودوں کے عکس بھی شائع کیے ہیں ۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ غزلیں خود آزاد نے کہی ہیں ۔ انھوں نے مختلف قوافی تحریر کیے ہیں ۔ پھر مختلف شعر لکھے ہیں اور ان میں کانٹ چھانٹ کی ہے ۔ ذوق کی کہی ہوئی غزلوں میں نہ کانٹ چھانٹ کی ضرورت تھی نہ قوافی جمع کرنے کا کوئی محل تھا ۔

شیرانی کاان مسودوں کو شائع کرنا ادبی تحقیق کا بڑا اہم کارنامہ ہے۔ ان چودہ غزلوں کے بارے میں تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ذوق کی نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے علاوہ بھی بعض غزلیں ایسی ہوں جنھیں آزاد کا نتیجۂ فکر قرار دیا جائے لیکن کوئی مسکت شہادت موجود نہ ہونے کی وجہ سے اب ان کا پتہ چلانا تقریباً ناممکن ہے۔ آزاد تنہا ایسے شاگرد نظر آتے ہیں جو اپنے کلام کو اپنے استاد کے نام سے منسوب کرنا عین سعادت مندی سمجھتے ہیں۔ یہ ایسی منطق ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ دوسروں کے کلام پر اصلاح دینے کا رواج بہت پرانا ہے۔ حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کے صاحبزادے اور صائب نے اساتذہ کے کلام پر اصلاح دی ہے میر نے اپنے تذکرے میں آبرو اور سجاد کے اشعار کو اصلاح دے کر پیش کیا ہے۔ لیکن یہ طریقہ چنداں قابل اعتراض نہیں۔ یہ اصلاحیں نیک نیتی اور ادبی خدمت کے جذبے سے وجود میں آئی تھیں۔ اور اصلاح دینے والوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ آزاد کی اصلاحوں اور اضافوں کا مقصد استاد کی شہرت میں اضافہ کرنا تھا۔ ان کی نیک نیتی سے تو انکار ممکن نہیں لیکن ادبی خدمت کے بجائے وہ ادبی بددیانتی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ آزاد میں اختراع کا مادہ بہت تھا۔ ان کی قوتِ اختراع نے یہاں جو گل کھلایا ہے وہ ان کی پیشانی پر بدنما داغ بن گیا ہے۔ ان اصلاحوں اور اضافوں سے ذوق کی ادبی شخصیت اور شہرت کو بھی کافی نقصان پہنچا۔ آزاد نے کوشش کی تھی کہ استاد کا کلام سورج اور چاند کو شرمائے لیکن نتیجہ برعکس نکلا اور وہ تمام معائب ذوق کے سر تھپ گئے جو آزاد کی شاعری میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ آزاد کا مرتب کردہ "دیوانِ ذوق" ہی عام طور پر متداول ہے۔ عام پڑھنے والے اس کے مندرجات کو تمام و کمال ذوق کا سرمایۂ فکر سمجھتے ہیں۔ اور ساری آئی گئی ذوق کے سر جاتی ہے۔

اس کوتاہیوں سے قطع نظر آزاد نے دیوانِ ذوق کو بڑے دلچسپ انداز سے مرتب کیا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ فارسی اور اردو کے کسی شاعر کا دیوان اس نہج سے مرتب نہیں ہوا۔ ردیف وار غزلیں جمع کرنے میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ شاعر کے ذہنی ارتقا کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کے فن کی تدریجی ترقی پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ بعض غزلیں یا اشعار کسی خاص واقعے یا موقع محل کی مناسبت سے وجود میں آتے ہیں لیکن ردیف وار دیوان میں شامل ہونے کے بعد ان کی مخصوص معنویت باقی نہیں رہتی۔ چکنی ڈلی کے متعلق مرزا غالب کا ایک مشہور قطعہ ان کے دیوان میں موجود ہے۔ اگر غالب اس قطعے کے متعلق اپنے ایک خط میں صراحت نہ کرتے اور اس کے وجود میں آنے کی وجہ سے اس قطعے کی قدر و

نرلت بہت بڑھ جاتی ہے۔ آزاد اس رمز سے بخوبی واقف تھے۔

راس کے ساتھ ساتھ ذوق کے حاضر باشوں میں تھے۔ ذوق کے کلام کی تاریخی حیثیت ی ان کی نظر میں تھی۔ اسی وجہ سے انھوں نے اکثر غزلوں کا زمانہ متعین کیا ہے۔ اور اگر کسی ص واقعے سے ان کا تعلق ہے تو اسے بھی بیان کر دیا ہے لیکن بیانوں میں جا بجا ان سے سہو ی ہوا ہے۔ مثلاً ردیف الف میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "شہر کے اندر کابلی دروازے کے پاس استاد مرحوم رہتے تھے۔ باہر ایک باغ بادشاہی تیس ہزاری باغ مشہور تھا۔ عمارات قدیم یر تھیں۔ زیب النساء بیگم خواہر عالم گیر کی قبر بھی تھی (اب تیس ہزاری باغ صاف ہو گیا اں ریل چلتی ہے زیب النساء کی قبر کا نام و نشان نہیں رہا۔ میں نے خود پڑھا ہے "فاد خلی نتی" عالم گیر کی کہی ہوئی تاریخ تعویذ پر کندہ تھی[1]۔ زیب النساء عالم گیر کی بہن نہیں بیٹی تھی راس کی تاریخ وفات "وادخلی جنتی" ۱۱۱۴ ھجری ہونا چاہیے۔ "فادخلی جنتی" سے ۱۱۸۸ سوی بر آمد ہوتے ہیں جو شاہ عالم ثانی کا زمانہ تھا۔ آزاد اگر اپنی لکھی ہوئی تاریخ کے اعداد جوڑ یتے تو یہ غلطی نہ ہوتی۔

ریف الف کے آخر میں سترہ غزلیں آزاد نے ایسی لکھی ہیں جو ان کی رائے میں ذوق کے ین کا کلام ہے۔ آزاد کی یہ رائے تسلیم کر لینے میں بظاہر کوئی قباحت نہیں لیکن انھوں نے د اپنی رائے کی تردید کی ہے۔ ان غزلوں میں سے ایک غزل "تجھ کو یوسف سے کیا حسن میں رتریدا" کے بیان میں لکھتے ہیں "غزل مذکورہ بالا بھی تیس ہزاری باغ میں کہی تھی۔ مجھے یاد ہے مقطعے کا مصرع کئی طرح کہا اور پسند نہ آیا پھر فرمایا خیر صاف کریں تو سمجھ لیں گے۔ اب ئے یہ کہہ کر دوسری غزل شروع کر دی[2]۔ ذوق ۱۲۰۴ ھجری میں پیدا ہوئے تھے اگر یہ رل ان کے بچپن کی ہے تو اسے ۱۲۲۴ ھجری تک وجود میں آ جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس نت تک آزاد وجود میں نہیں آئے تھے مقطعے کے مصرع ثانی کا کئی طرح کہا جانا اور اس کے تعلق ذوق کی رائے آزاد کے سامنے کی بات نہیں ہو سکتی۔ مگر آزاد نے واقعہ جس انداز سے ین کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غزل ان کے سامنے کہی گئی تھی۔ اگر آزاد کے اس ین کو صحیح مان لیا جائے تو پھر ان کا یہ بیان کہ یہ غزل ذوق کے بچپن سے تعلق رکھتی ہے بے ئی ٹھہرے گا۔ آزاد نے ان سب باتوں پر غور نہیں کیا۔

---

[1] یوان ذوق، ص ۵۵-۵۴۔

[2] یوان ذوق، ص ۸۸۔

ردیف جائے معجمہ میں آزاد نے اڑسٹھ اشعار کے ایک قصیدے کو زمرۂ غزل میں داخل کر کے اس کی شانِ نزول بیان کی ہے۔ اس شانِ نزول سے قطع نظر قصیدے کو قصاید کے زمرے میں جگہ ملنی چاہیے تھی۔ آزاد نے ویران کی تقلید میں اس قصیدے کو غزلوں کے

ساتھ جگہ دی اور ترتیب کا کوئی خیال نہیں کیا۔ اسی طرح ردیف بنا کر پیش کیا ہے۔ تعجب خیز بات یہ ہے کہ ردیف نون کے اس قصیدے "مے "ملا کر ساقیان سامری فن آب میں" کو ویران نے بھی غزل ہی کہا ہے اور کل تیرہ اشعار غزل کے درج کیے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ویران کو صرف غزل کا علم تھا۔ قصیدے کا کوئی علم نہیں تھا۔ یہ غزل گلشنِ خار میں بھی موجود ہے اور وہی تیرہ اشعار انتخاب میں شامل ہیں جو بعد کو ویران نے اپنے نسخے میں شامل کر لیے۔ قصیدے کا کوئی شعر نہ گلشن بے خار میں ملتا ہے۔ نہ نسخۂ ویران میں۔ نہ آزاد کے سوا کوئی اسے قصیدہ کہتا ہے۔ یہ بات تعجب خیز نہیں تو اور کیا کہی جائے گی۔

ردیف ذال معجمہ کی ایک غزل کے سلسلے میں آزاد لکھتے ہیں "۱۸۵۲عیسوی میں ایک مشاعرہ ہوا اس میں بھی طرح تھی۔ شاگرد آئے اصلاحیں لے گئے۔ مشاعرے کے بعد اور بھی غزلیں آئیں۔ دیکھ کر فرمایا دیکھو قافیے کا پہلو نہیں بٹھا سکتے۔ زمین ناپتے چلے جاتے ہیں۔ پھر فرمایا ہم بھی غزل لکھ دیں بھلا یاد تو رہے کہ یوں نشست دیتے ہیں۔ زمین ٹھنڈی ہے تو ہو کلام بے اصول تو نہ ہو[1]۔ آزاد کے اس بیان کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ذوق نے تمام شاعروں کی غزلیں دیکھنے کے بعد اس زمین میں غزل کہی جو شاعرانہ دیانت داری کے منافی ہے۔ اساتذہ عام طور پر اس قسم کی حرکت نہیں کرتے۔ ردیف رائے مہملہ اور ردیف یائے تحتانی میں آزاد نے مومن کا تذکرہ کیا ہے۔ ردیف رائے مہملہ میں وہ لکھتے ہیں "سد، آزاد بھی ان دنوں حاضر خدمت ہونے لگا تھا۔ ایک دن مومن خاں صاحب استاد کے پاس آئے اثنائے گفتگو میں کہا۔ آج کل کا کوئی شعر سنائیے۔ استاد نے کہا کہ حضور کی غزلیں کہاں فرصت دیتی ہیں جو اپنی فکر کروں۔ جب کئی دفعہ کہا تو غزل مرقوم الذیل کا مطلع (بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر) انھیں دنوں کہا تھا یہی سنایا۔ وہ ہنسے اور کہا اس پر کوئی مطلع کیا کہے گا راستہ بند ہے[2]۔ اور ردیف یائے تحتانی میں رقم طراز ہیں "ملاقات مذکورہ کی باتوں میں استاد نے یہ بھی بیان کیا کہ مومن خاں نے مجھ سے کہا کچھ ان دنوں کا کہا ہوا سنایئے۔ مدتوں گزر گئیں آپ کے منہ سے کچھ سنا ہی نہیں۔ میں نے کہا حضور کی غزلیں فرصت کہاں

۱۔ دیوانِ ذوق، ص، ۱۰۵۔

۲۔ دیوانِ ذوق، ص، ۱۱۰۔

دیتے ہیں۔ پھر کہا۔ خیر میں نے دو شعر سنائے۔ انھیں دنوں میں ہوئے تھے۔

خط بڑھا کا کل بڑھی زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے دل
اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

والد نے کہا انھوں نے بھی کچھ سنایا۔ فرمایا نہیں۔ یہی کہتے رہے۔ بخوم کا مرض ایسا لگا ہے کہ ایک دم مفارقت نہیں کرتا۔ دل نہیں لگتا۔ چرچا جاتا رہا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس بیان سے بندہ آزاد کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا کہہ نہ سکتے تھے۔ بے شک ان کے دیوان میں کئی ایسے مطلع موجود ہوں گے مگر سخن سنج۔ نکتہ شناس تھے۔ ساتھ اس کے عاشق معشوق مزاج تھے۔ ایک ایسا شعر کہ مطلع ہو اور اس میں اثبات مضمون چار گواہوں سے قائم ہو اس پر غزلیت کے اوصاف سے متصف ہو وغیرہ وغیرہ اسے سن کر جو پڑھتے تو اسی رتبے کا مطلع پڑھتے۔ وہ زبان پر دھرا تھا اور وہ ان لوگوں میں نہ رہتے تھے کہ شعر سنا اور شعر خوانی شروع کر دی۔ بات کو سمجھتے تھے اور عمل و مقام پہچانتے تھے [1]۔ اس بیان میں آزاد نے انتہائی خوب صورتی کے ساتھ مومن کی تنقیص کی ہے۔ لیکن انھوں نے انداز ایسا اختیار کیا ہے جس کی وجہ سے پہلی نظر میں دھوکا کھانا ممکن نہیں ہے۔ یہ آزاد کی انشا پردازی کا کمال ہے کہ وہ عیب کو بھی حسن بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ذوق کا مطلع ادبی اسلوب اور شعریت کے اعتبار سے کوئی مرتبہ نہیں رکھتا۔ اثباتِ مضمون اور چار گواہوں کے ذکر سے بھی اس مطلع میں کوئی حسن پیدا نہیں ہوتا۔ نہ اسے غزلیت کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے اس کے ساتھ یہ امر بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مومن کو اپنی براقی طبع پر بڑا ناز تھا۔ اور وہ بقولِ آزاد سعدی جیسے شیریں کلام کے بھی چنداں قائل نہ تھے۔ ایسے نازک مزاج شخص کا ذوق سے شعر سنانے کی فرمائش کرنا بھی محلِ نظر ہے۔ اور ذوق کے اس مطلع پر مومن کا لاجواب ہو جانا اختراع آزاد کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ آزاد اگر اپنے اس بیان میں "بظاہر" مومن کی مدح نہ کرتے تو ان کے دل کا منشا ظاہر نہ ہوتا لیکن آزاد نے "تاکید الذم بما شبہ المدح" سے کام لے کر اپنے پورے بیان کو معقول بنا دیا ہے۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ ذوق اپنی کم فرصتی کا ذمہ دار ہمیشہ بہادر شاہ

---

[1] آبِ حیات، ص ۱۰۳۔ ۲۰۰۔

ظفرؔ کو ٹھہراتے ہیں۔ پہلے بھی انھوں نے مومنؔ سے یہی عذر کیا تھا اور دوسری حکایت میں بھی وہ اپنے پرانے الفاظ دہراتے ہیں۔ آزادؔ نے اپنے مختلف بیانوں کے ذریعے سے ظفرؔ کے سارے کلام کو ذوقؔ کی جھولی میں ڈال ہی دیا ہے۔ موقعہ بہ موقعہ اس قسم کی حکایتوں سے وہ اپنے بیانوں کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ آزاد کے اس دعوے کے متعلق کہ کلام ظفرؔ تمام و کمال ذوقؔ ہی کا مرہونِ منت ہے۔ "آبِ حیات" میں بحث کی جا چکی ہے۔ یہاں اس بحث کو از سرِ نو چھیڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ البتہ یہ کہنا ضروری ہے کہ دیوانِ ذوقؔ میں بہادر شاہ کو مطعون کرنے کی خاصی گنجائش موجود نہیں۔ آزادؔ نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن کہیں کہیں وہ اپنے دام میں خود اسیر ہو گئے ہیں۔ مثلاً ردیف دال مہملہ کی ایک غزل "کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد" کے سلسلے میں لکھتے ہیں "پہلے بادشاہ نے اس طرح میں غزل کہی تھی۔ ان کی غزل لکھ کر بیٹھے تھے دل لگ گیا اور چند قافیے خوشنما پہلوؤں پر بیٹھتے نظر آئے۔ فرمایا ہم بھی اس طرح میں غزل کہتے ہیں۔ دوسرے دن میں گیا تو غزل سنائی [1]۔ اس بیان کے ساتھ ایک اور بیان بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اپنے دوسرے بیان میں آزادؔ کہتے ہیں "استاد مرحوم بادشاہ کے سامنے اپنا شعر یا غزل پڑھتے نہ تھے طبیعت سے واقف تھے۔ اہلِ دربار میں سے کوئی سنا دیتا تو جو پسند آ جاتا خوشی حضور کی تھی کہ ہمارے نام سے مشہور ہو۔ چناں چہ اس پر خود غزل کہتے اور بموجب معمول کے ٹوٹا پھوٹا مسودہ۔ استاد کو واجب تھا کہ اپنے اشعار کے پہلو بچا کر ان کے شعر درست کریں۔ چناں چہ جب غزل مرتب کر کے حضور میں لے جاتے تو بادشاہ زبان سے کچھ نہ کہتے مگر کئی دن کے بعد اس طرح میں پھر ایک مسودہ بھیج دیتے ابتدا میں دو تین دفعہ ایسا ہوا۔ استاد سمجھ گئے۔ آخر یہ کیا ہو گیا کہ جب ایسا موقعہ ہو تا تو اپنی غزل میں ان کا تخلص ڈال کر بھیج دیتے۔ وہ خوش ہو جاتے تھے [2]۔ "آزادؔ کے دوسرے بیان کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو گا کہ ذوقؔ نے اپنی غزل" سینے میں سانس ہو گی اڑی دو گھڑی کے بعد" اس احتیاط سے چھپائی کہ ظفرؔ کے کان میں اس کی بھنک بھی نہ پہنچی۔ ورنہ ظفرؔ اسے ضرور ہتھیا لیتے۔ آزادؔ کے اس بیان سے ذوقؔ کی سیرت کا ایک بدنما پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ ظفر کو تو جانے دیجیے ذوقؔ بھی اس بیان کی روشنی میں کچھ عمدہ انسان نہیں ثابت ہوتے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس غزل کے سلسلے میں دیوانِ آزادؔ کو مطلع کر چکے تھے۔ کہ یہ غزل استاد کی نہیں ہے۔ وہ اپنے ایک خط میں جو آزادؔ کے نام ہے لکھتے ہیں " سانس دو جگہ مونث آیا ہے اور ایک تو ہے "ٹھنڈی ٹھنڈی سانس ہے آتی

---

[1] دیوانِ ذوقؔ، ص، ۱۰۲۔

[2] دیوانِ ذوقؔ، ص، ۱۱۲۔

حاتی"۔ یہ غزل تو بادشاہ کی ہے اور ایک یہ ہے "سینے میں سانس ہو گی اڑی دو گھڑی کے بعد"
سو یہ غزل بھی بادشاہ کی ہے۔ خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے بسبب دیوان میں داخل ہونے کے
استاد کے بیاض میں لکھ دیا ہے[1]۔ شاید اسی وجہ سے یہ غزل دیوانِ ذوق مرتبہ ویران میں بھی
شامل ہو گئی تھی لیکن ویران کے انتباہ کے بعد بھی آزاد کا اس غزل کو دیوان میں شامل کر لینا
جوشِ عقیدت کے سوا اور کچھ نہیں۔

ردیف دا و مجمعہ کے ایک شعر "اڑتے پرزے ہیں جگر کے کبھی پڑھتا ہوں جو آہ۔ ہوتا حق میں
ہے مرے مطلع آہی مقراض" کے سلسلے میں آزاد لکھتے ہیں "اس غزل میں ایک شعر اور بھی
کہا تھا۔ اڑتے پرزے الخ اسے میں نے لکھ کر تامل کیا۔ فرمایا کیا سوچتے ہو؟ میری
ابتدا تھی کچھ نہ بولا۔ فرمایا آہی سبز واری بڑا شاعر ہوا ہے۔ پھر آپ ہی کہا کاٹ دو۔ شاید اور
لوگ بھی نہ سمجھیں ہم تو سب کے لیے کہتے ہیں[2]۔ حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر محمد اقبال کی
تحقیق کے مطابق آہی کا سبز وار سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر یہ کہ گلشنِ بے خار میں بھی یہ
شعر جو ذوق نے قلم زد کر دیا تھا۔ یوں ملتا ہے۔

نامِ فریاد سے ہوتے ہیں جگر کے ٹکڑے
ہوتا حق میں ہے مرے مطلع آہی مقراض

رہ گیا ذوق کا یہ کہنا کہ شاید اور لوگ بھی نہ سمجھیں عجب طرح کی ستم ظریفی ہے۔ ہمارا خیال
یہ ہے کہ ذوق نے اپنا یہ شعر حکیم قدرت اللہ قاسم صاحبِ مجموعہ نغز کے اس شعر۔

یاد میں اس قدر موزوں کے ہر ایک نالہ و آہ
دلِ پر درد سے ہو مصرعِ آہی نکلا

کو ذہن میں رکھ کر کہا ہے۔ قاسم نے مجموعہ نغز میں اپنا یہ شعر نقل بھی کیا ہے تعجب ہے کہ
آزاد نے اس پر غور نہیں کیا۔ مجموعہ نغز ان کے سامنے موجود تھا۔ یہ شعر بھی ان کی نظر سے
گزرا ہو گا پھر بھی وہ اپنی حکایت بیان کر ہی گئے۔

1۔ دیوانِ ذوق، ص، ۱۱۲۔
2۔ دیوانِ ذوق، ص، ۱۱۷۔
3۔ آزاد اور دیوانِ ذوق۔

ردیف یائے تحتانی کی ایک غزل "موئے سر ماران سیہ کا ایک سراسر لشکر ہے"۔ کے متعلق آزاد لکھتے ہیں "فرماتے ہیں کہ جوانی کا عالم تھا اور طبیعت میں جوش۔ وہی دن تھے کہ مدرسہ غازی الدین خاں کے وسیع کوٹھے پر مشاعرے ہوئے تھے۔ نواب امیر خاں سرکار انگریز سے عہد نامے کے لیے دہلی میں آئے۔ شہر کے لوگ دیکھنے کو دوڑے کے باہر پنڈارے کا لشکر پڑا ہے۔ ہم بھی مدرسے میں گئے۔ تمھارے والد وہیں تھے کوٹھے میں جا بیٹھے دور تک خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے۔ ہم نے حسبِ حال یہ غزل کہی۔ کئی دن کے بعد مشاعرہ ہوا۔ لشکر کے لوگ مسجد مدرسے میں نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ انھیں بھی مشاعرے کی خبر ملی کہ رات کو جلسہ ہے۔ سب آئے دوسروں کی فرمایش سے ہم نے یہ غزل پڑھی۔ بے چارے برسوں سے صحرا نوردی میں تھے اور اسلام کے نام سے ہر کام کرتے تھے۔ اب خط صلح میں آکر اسے چھوڑنا تھا۔ سب دل شکستہ تھی۔ اکثر اشعار غزل کے ان کی صورتِ حال دکھاتے تھے بڑی تعریفیں اور ہر شعر پر اللہ اللہ۔ خوب غلغلے اور ولولے ہوئے۔ بات سنائی نہ دیتی تھی [1]۔ شیرانی کے بقول امیر خاں اور انگریزوں میں عہد نامہ ۱۸۱۷ عیسوی میں ہوا تھا۔ لیکن نواب اس عہد نامے کے لیے دلی میں نہیں آئے تھے۔ ان کے وکیل نرنجن لال نے ان کی جانب سے عہد نامہ پر دستخط کیے تھے۔ ۱۲۴۲ ہجری مطابق (۲۷-۱۸۲۶ء عیسوی) میں امیر خان گورنر جنرل ایمہرسٹ سے ملاقات کرنے دلی آئے تھے۔ اس وقت ذوق کی عمر اڑتیس برس کی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ امیر خان کے لشکر والوں نے اس غزل کو جو واضح طور پر ان کی ہجو تھی سنا کیوں کر گوارا کر لیا۔ پھر یہ کہ مقطعے میں ذوق نے امام برحق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ اشارہ سید احمد شہید کی امامت کا اعلان ہوا تھا۔ شیرانی کے بقول نواب کے لشکر میں سید صاحب کے ہزاروں مرید موجود تھے۔ استاد ذوق کو ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ ذوق نے یہ غزل ۱۲۴۲ ہجری کے بعد کہی ہو گی۔ ۱۲۴۲ ہجری میں انھوں نے امیر خان کا لشکر دیکھا اور اسی سال سید صاحب کی امامت کا اعلان بھی ہوا یہ واقعات اور مشاہدات ذوق کے ذہن میں محفوظ ہو گئے اور آگے چل کر انھوں نے غزل کا قالب اختیار کر لیا۔ آزاد نے اپنی قوتِ قصہ گوئی سے کام لے کر ایک پورا واقعہ تصنیف کر لیا۔ اور نواب امیر خانی لشکر سے ہمدردی جتا کر ان سب کو جاہل محض ثابت کر دیا۔

اسی طرح ردیف یائے تحتانی کے ایک شعر۔

---

[1] دیوانِ ذوق، ص ۱۷۹۔

حال مہر و وفا کہوں تو کہیں
مجھے شوق ان حکایتوں سے نہیں

کے سلسلے میں لکھا ہے "مثنوی مہر و وفا ایک عمدہ مثنوی ہے۔ پہلے یوسف زلیخا بوستاں۔ سکندر نامہ کی طرح تعلیم میں داخل تھی۔ اب اس کا رواج نہیں رہا۔ یہ اس کی طرف اشارہ ہے کون سمجھتا ہے اب ان شاعروں کو خواجہ حافظ نے بھی کہا ہے۔

ما قصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس[1]

یہاں آزاد نے سیدھی سادھی بات کو خواہ مخواہ الجھادیا ہے۔ اول تو ان کا یہ خیال غلط ہے کہ مہر و وفا درس میں داخل تھی بقول شیرانی فارسی میں اس نام کی چار مثنویاں ملتی ہیں۔ ان میں سے تین بر صغیر پاک و ہند کی پیداوار ہیں۔ یہ چاروں مثنویاں اس قدر غیر معروف ہیں کہ ان کے درسیات میں شامل ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ مہر و وفا کے عطفی مرکب کو ذوق اور حافظ دونوں نے لغوی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ مہر و وفا کو تلمیح سمجھنا دور از کار اور بعید از قیاس بات ہے۔[2]

متفرقاتِ یائے تحتانی میں آزاد نے ناسخ کا ایک مطلع۔

پھر بہار آئی کفِ ہر شاخ پر پیمانہ ہے
ہر روش پر جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے

بغیر کسی وجہ کے ذوق کے سر چپکا دیا ہے۔ حالانکہ کلیاتِ ناسخ میں یہ مطلع موجود ہے۔ اسی طرح سکندر کی رباعی۔

اے زاہد کیا تم سے کیا جھگڑ کرلوں میں
ناحق کو دل اپنا یہ کروں کیوں خوں میں

1۔ دیوانِ ذوق، ص ۱۸۷۔
2۔ نگارستانِ فارس میں آزاد نے اسے ظہیر فاریابی کی تصنیف بتایا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔

مے خوارہ و بت پرست کہتے ہو مجھے

ہوں میں ہوں جو کچھ کہ ہوں، ہوں میں

بادنیٰ تغیر ذوق کی ملکیت قرار دی گئی ہے۔ یہ مطلع اور رباعی دونوں نسخہ دیوان میں موجود نہیں۔ خدا معلوم آزاد نے انھیں ذوق کی ملک کیوں قرار دے دیا۔

قصاید میں بھی اسی قسم کے سہو نظر آتے ہیں۔ اول تو یہ کہ آزاد نے جابجا قصاید کے سلسلے میں انھوں نے جو تشریح کی ہے وہ محلِ نظر ہے۔ مثلاً اس قصیدے "قلم جو صفحہ کاغذ یہ ہو دے نکتہ نگار" کے بارے میں صرف یہ لکھ دینا کافی نہیں کہ یہ اکبر شاہ کی تعریف میں ہے یہاں اس امر کی صراحت ضروری تھی کہ یہ قصیدہ شہزادہ جہانگیر کی شادی کے موقعے پر لکھا گیا تھا اور جس قصیدے کو انھوں نے شہزادہ سلیم کی شادی کے متعلق بتایا ہے اس کے اشعار سے ان کے بیان کی تائید نہیں ہوتی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ اکبر شاہ کے کسی جشن کے موقعے پر لکھا گیا تھا۔ پورے قصیدے میں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں جس سے اس کو شہزادہ سلیم کی شادی سے متعلق کہا جاسکے۔ رہ گئیں لفظی تبدیلیاں تو ان کے متعلق صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ آزاد نے غزلوں کی طرح قصاید کو بھی باوقعت بنانے اور اپنے عہد کی زبان سے ہم آہنگ کرنے کے لیے انھیں اپنی اصلاح کی بھینٹ چڑھا دیا۔

آزاد نے دیوان ذوق کو نئے انداز سے مرتب کرنا چاہا تھا۔ ان کی جدت طرازی۔ اپج اور حسنِ ترتیب میں کوئی کلام نہیں۔ وہ ذوق کے بہت سے اشعار کی شانِ نزول سے بذاتِ خود واقف تھے اور اشعار سامنے رکھ کر موزوں و بر محل حکایتیں وضع کرنے کا فن بھی انھیں خوب آتا تھا۔ کلام ذوق کا کچھ ذخیرہ بھی ان کے پاس موجود تھا۔ چناں چہ راقم الحروف نے ذوق کا یہ قصیدہ "ہے ابر در فشاں وہ چمن میں کمال کے" جو نسخۂ دیوان میں موجود نہیں ہے۔ بخط ذوق آغا باقر صاحب کے کتب خانے میں بچشم خود دیکھا ہے۔ اگر آزاد کی کاوشیں جدت طرازی تک محدود رہتیں تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ شاید اسی صورت میں ان کا مرتبہ دیوانِ ذوق اپنی مثال آپ ہوتا لیکن انھوں نے صرف اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ استاد کے کلام پر اصلاح بھی کردی اور خود غزلیں کہہ کر استاد کے دیوان میں داخل بھی کردیں۔ اساتذہ عام طور پر مبتدیوں اور نومشقوں کو ہمت افزائی کے خیال سے غزلیں کہہ کر دے دیتے ہیں۔ مگر آزاد نے الٹی گنگا بہائی ہے اور اپنا کلام بلاغتِ نظام استاد کو عطا کرکے اپنی اور اپنے استاد دونوں کی ادبی حیثیت کو کمزور کرلیا ہے۔ ممکن ہے کہ ہم لوگ دیوانِ ذوق کے سلسلے میں آزاد کی دراز

دستیوں کو بھی معاف بھی کردیں لیکن یقین ہے کہ عالم بالا میں ذوقؔ کے کلام کو قرار واقعی نقصان پہنچا ہے۔ اور اس کی حیثیت مشتبہ ہو گئی ہے۔ کسی شاعر کے ساتھ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ بے جا اصلاحوں سے اس کی خوبیوں پر پانی پھیر دیا جائے اور بے محل اضافوں سے اس کی حیثیت مشتبہ کردی جائے۔ اگر آزادؔ دیوانِ ذوقؔ مرتب نہ کرتے تو یقیناً وہ ذوقؔ کے ساتھ بڑا احسان کرتے لیکن انھوں نے انتہائی نیک نیتی اور خلوص سے کام لے کر اپنے لیے رسوائی کا سامان فراہم کرلیا۔ دنیا کے ادب میں ایسی جدت کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ دیوانِ ذوقؔ کے آخر میں "نثر موزوں" کے عنوان سے ایک اختتامیہ بھی شامل ہے۔ اس اختتامیے کے متعلق آغا محمد باقر صاحب کا بیان ہے کہ دیوانِ ذوقؔ آزادؔ کے زمانہ ہوش میں نہ چھپ سکا تھا۔ آغا محمد ابراہیم کے احباب کے تقاضوں سے اس کو چھپوایا اور ایک جلد آزادؔ کے پاس لے گئے۔ آزادؔ نے اسے بہت شوق سے دیکھا۔ آغا محمد ابراہیم نے فرمائش کی کہ اس پر کچھ لکھ دیجیے۔ چناں چہ آزادؔ نے قلم برداشتہ یہ عبارت لکھ دی[1]۔ لیکن اس عبارت سے آزادؔ کی ذہنی پراگندگی کا احساس نہیں ہوتا۔ پوری عبارت باربط۔ موزوں اور برمحل ہے۔ آزادؔ کے اسلوب کی بوقلمونی اور لاویزی ہر سطر سے عیاں ہے۔ ایسی تحریریں ادب کا سنگھار کہی جاسکتی ہیں۔

بحیثیت مجموعی دیوانِ ذوقؔ مرقع آزادؔ کی بدترین تصویر ہے۔ آزادؔ نے اس کی تخلیق میں اپنی فن کاری کا پورا زور صرف کیا ہے۔ انتہائی خوش نما اور جاذبِ نظر رنگ استعمال کیے ہیں۔ لیکن تصویر بے جان بھی ہے اور حقیقت سے دور بھی۔ ذوقؔ آزادؔ کی فن کاری کے محتاج نہیں تھے۔ آزادؔ کی فن کاری نے ان کے خط و خال کو بری طرح مسخ کردیا ہے۔

---

[1] آبِ حیات کے لطیفے، ص، ۱۱۳۔

فراق گورکھپوری

ذوقؔ

(۱)

جنھیں اردو شاعری کی تاریخ سے دل چسپی ہے اگر ان سے آج پوچھا جائے کہ سو برس پہلے دلی کے سب سے بڑے اردو شاعر کون تھے تو کہیں گے کہ غالب مومن اور ذوقؔ۔ آج سے سو برس پہلے بھی یہی جواب ملتا اور یہی نام لیے جاتے مگر اس زمانے کے لوگ ناموں کی ترتیب بدل دیتے اور کہتے کہ ذوقؔ، مومن اور غالب۔ اس ردو بدل کے اسباب کیا ہیں یہ سوال ذرا بحث طلب ہے اور اسے یہیں چھوڑیے۔ ہمیں تو ذوقؔ کے مرتبۂ شاعری اور ان کے کلام کی قدرو قیمت کا اندازہ کرنا ہے۔ ممکن ہے اس طرح ذوقؔ کی شہرت کے نشیب و فراز کا راز کچھ کھل جائے۔

ایک انسان اور نیز ایک شاعر کی حیثیت سے ذوقؔ کی خوش نصیبی اور بد نصیبی دونوں حیرت انگیز ہیں۔ وہ ایک غریب سپاہی زادے تھے۔ بچپن ہی سے مفلسی اور شاعری دونوں کا ساتھ رہا۔ قسمت کی ستم ظریفی سے ابھی عمر ہی کیا تھی کہ شاعری میں شاہ نصیرؔ کے شاگرد ہو گئے جو نہایت قادر الکلام، نہایت جید لیکن نہایت پر مذاق شاعر تھے۔ ان کے رسوخ کا کیا کہنا ولی عہد سلطنت کے استاد تھے دنیا بھر کو چیلنج دے کر مشاعرے کرتے تھے اور ''قفس کی تیلیاں، مگس کی تیلیاں'' سال بھر کے لیے طرح کر دیتے تھے۔ یہ سب سہی مگر آدمی تھے پر لطف بوڑھوں میں بوڑھے بچوں میں بچے اور شاعری میں بیک وقت دونوں۔ ان کی ایجاد کردہ کچھ ردیفیں سنیے ''جبل کی مکھی''۔ ''سر پر طرہ ہار گلے میں''۔ ''ساون بھادوں''۔ ''فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں''۔ میر و سودا کے بعد اردو شاعری کی کیا گت بنی اس کا اندازہ شاہ نصیرؔ کی شاعری سے ہو سکتا ہے۔ شمس العلماء محمد حسین آزاد شاہ نصیرؔ کا تذکرہ لکھتے وقت تین احساسات کا شکار

ہوئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی شاعری عجیب الخلقت ہے، دوسرے یہ کہ جو کچھ بھی ہو وہ ذوقؔ کے استاد تھے۔ تیسرے یہ کہ ذوقؔ شاہ نصیرؔ کی شاعری سے نہیں بلکہ ان کے برتاؤ اور ان کی بے رخی سے بیزار ہو کر ان کی شاگردی سے الگ ہوئے۔ ایک چوتھا احساس بھی تھا وہ یہ کہ ذوقؔ بڑی حد تک ان کی شاگردی چھوڑنے کے بعد بھی شاہ نصیرؔ ہی کے رنگ کو پسند کرتے تھے اور ان کے حریف و مقابل ہو کر بھی اسی رنگ میں کہنا اور اسی رنگ کو چمکانا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ آزادؔ شاہ نصیرؔ کا ذکر کبھی مرعوب لہجے میں کرتے ہیں کبھی تذبذب کے لہجے میں اور بیچ بیچ میں چٹکیاں لیتے جاتے ہیں اور چوٹیں کرتے جاتے ہیں شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں ان میں فتح کا سہرا ذوقؔ کے سر رہا۔ لیکن یہ فتح کن داموں نصیب ہوئی میرے والد مرحوم حضرت عبرتؔ گورکھپوری کا ایک شعر ہے

قاتل سے انتقام نہیں چاہتا مگر میں جس کا صید ہوں وہی میرا شکار ہے

یعنی جن شاہ نصیرؔ پر ذوقؔ فتح حاصل کرنا چاہتے تھے انھی کے رنگ کے شکار ہو گئے۔ بعد کو ضرور بچ نکلے۔ شاعری کے ساتھ کھیلنا خطرے سے خالی نہیں۔ ذوقؔ نے شہرت تو وہ پائی کہ آسمان کو رشک آ جائے لیکن ایک بڑی حد تک حقیقی شاعری سے محروم رہ کر۔

ابھی تقدیر اور گل کھلانے والی تھی۔ شاہ نصیرؔ نے کافی عرصے کے لیے دلی چھوڑی۔ ادھر ذوقؔ کو ولی عہد سلطنت نے اپنا استاد بنالیا۔ مگر اسے خوش قسمتی کہیے یا بد قسمتی کہ ولی عہد کی حالت خود نازک تھی۔ شاہی خاندان خانہ جنگیوں کا شکار ہو رہا تھا۔ بادشاہ ولی عہد سے منحرف تھے۔ ولی عہد کو بجائے ۵ ہزار مہینہ کے صرف ۵ سو مہینہ ملتا تھا۔ بہر حال ذوقؔ کو چار روپیہ مہینہ ملنے لگا۔ جب ولی عہد بادشاہ ہوئے تو یہ تنخواہ چار سے پانچ اور پانچ سے چھ اور ایک مدت دراز کے بعد تیس روپیہ مہینہ پر جا کر ختم ہو گئی۔ یوں تو ذوقؔ کو ملک الشعرا خاقانی ہند اور استاد شہنشاہ کا لقب ملا۔ قسمت نے کیا نہیں دیا اور کیا دیا؟ بقول غالبؔ

تم سے بے، جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

اس استادی اور شاگردی نے ذوقؔ کی زندگی کے ساتھ تو یہ کیا اور ذوقؔ کی شاعری کے ساتھ کیا کیا؟ آزادؔ لکھتے ہیں کہ بادشاہ کی فرمائشیں دم لینے کی مہلت نہ دیتی تھیں اور تماشا یہ کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا۔ بات میں بات نکالتا مگر اسے سمیٹ نہ سکتا تھا۔ مجبوراً ذوقؔ کو

سنبھالنا پڑتا تھا۔ وہ اپنی غزل بادشاہ کو سناتے نہ تھے اگر کسی طرح اس تک پہنچ جاتی تو وہ اسی غزل پر خود غزل کہتا تھا اب اگر نئی غزل کہہ کر دیں اور وہ اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچہ نہ تھا ۷۰ برس کا سخن فہم تھا، خوب سمجھتا تھا۔ اور اگر اس سے چست کہیں تو اپنے کہے کو آپ مٹانا بھی آسان نہ تھا، ناچار اپنی غزل میں ان کا تخلص ڈال کر دے دیتے تھے۔ بادشاہ کو بڑا خیال تھا کہ وہ اپنی کسی چیز پر زور طبع نہ صرف کریں۔ جب ان کے شوق طبع کو کسی طرف متوجہ دیکھتا تو برابر غزلوں کا تانتا باندھ دیتا کہ جو کچھ جوش طبع ہو ادھر ہی صرف ہو۔ آزاد نے ذوق کے حالات میں کئی جگہ لکھا ہے کہ بادشاہ صرف اپنا کہا ہوا ذوق کو نہیں دکھاتا تھا بلکہ سیکڑوں طریقے سے غزل، نظمیں، ٹھمری، دوھرے اور گیتوں کی فرمائش کرتا تھا اور یہ سب فرمائشیں بہت کم وقت اور مقررہ وقت کے اندر اور کبھی کبھی تو چند گھنٹوں کے اندر ذوق کو پوری کرنی پڑتی تھیں۔

آزاد کے جادو نگار قلم نے اس بارے میں جس انداز سے لکھا ہے اسے پڑھ کر اس احساس سے دل خون ہو جاتا ہے کہ بادشاہ کی شاگردی نے ذوق کے لیے شاعری ایسی لطیف اور نازک چیز کو ایک بیگار بنا دیا۔ ظفر کا ضخیم دیوان کل کا کل ذوق کا کہا ہوا تو ہے نہیں۔ ظفر کے کلام میں خلوص جذبات، شاعرانہ احساس، سوز و گداز اور دل میں چٹکیاں لینے والی اداسی اور ایک درماندگی کا کیف اور کئی جگہ موسیقیت کا جو عنصر ملتا ہے وہ کل کی کل ذوق کی دین نہیں ہے۔ اصلاح ذوق کی ضرور ہے۔ لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ دم لینے کی فرصت نہ ہوتے ہوئے بھی اور ذوق کا بہت سا کلام ضائع ہو جانے کے بعد بھی ذوق کا جو دیوان ملتا ہے وہ غالب کے دیوان سے کچھ زیادہ ہی ضخیم ہے۔ وہ دیوان ہمارے سامنے ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ذوق اپنے وقت کے مالک ہوتے اور بادشاہ کی اصلاح اور اس کی فرمائشوں سے وہ آزاد بھی رہتے اگر ان کی یہ تمنا بھی بر آتی کہ

دل چاہتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

تو مقدار اور صنعت سے قطع نظر کر کے جہاں تک نفس شاعری اور ذوق کے مخصوص رنگ کلام کا تعلق ہے کیا ذوق اپنے موجودہ کلام سے کوئی مختلف اور لطیف تر چیز پیش کرتے۔ آپ ناسخ کے دیوان کو لے لیجیے اس کی چند غزلوں میں بھی شاعری کا وہی نمونہ اور وہی معیار ملتا ہے۔ جو پورے دیواں میں نظر آتا ہے۔ شاعری سے کتنا کہا یہ سرے سے ایک غیر ضروری

سوال ہے۔ اگر ضخامت اور مقدار کے لحاظ سے ذوقؔ کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ بادشاہ اور ایسے دھواں دھار کہنے والے بادشاہ کا استاد ہونا بڑی غیر شاعرانہ بات تھی۔ آپ کہیں گے کہ اس رسوخ کی تمنا تو غالبؔ کو بھی تھی لیکن یہ نہ بھولیے کہ غالب نہایت لاچار شاعر تھا کسی بادشاہ کا استاد ہو کر بھی غالب اپنا کلام مٹنے نہ دیتا۔ غالبؔ ہی رہتا، نواب رام پور جو ناظم تخلص کرتے تھے غالبؔ کے شاگرد تھے۔ ان کا ایک شعر غالب نے یوں بنادیا

ہے یہ ساقی کی کرامت کہ نہیں جام کے پاؤں
اور پھر ہم نے اسے بزم میں چلتے دیکھا

لیکن خود غالبؔ نے ساقی اور جام پر اپنے یہاں جیسے شعر کہے ہیں وہ سب کو معلوم ہیں۔

بہر حال ذوقؔ کا جو دیوان موجود ہے اس سے ذوقؔ کے کلام کی قدر و قیمت ضرور معلوم ہو سکتی ہے۔ دیکھیے خود آزاد اس کلام کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

"جب وہ صاحبِ کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہان میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آبِ حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اتارے ہیں ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس پر یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا"۔

اس دل فریب اور سامعہ نواز نثر کا کیا کہنا۔ لیکن اس شدت کی گلفشانی کرتا ہوا بھی آزادؔ کا رنگین نگار قلم شاعری کی خصوصیات کے ذکر سے کترا کر نکل گیا۔ یوں تو "ساقی نے التفات کے دریا بہا دیے" لیکن تغزل، ترنم، خلوص جذبات، شدت احساس، اسرار و معانی، حسن و عشق، کائنات کا محاکاتی پہلو، شاعرانہ مصوری یا ترجمانی، استعجاب 'حیرت'، انفعال، سوز و گداز، دِقّتِ نظر، دل کی چوٹ، روحانی عناصر، کیف و اثر، فطری مگر خلاقانہ اندازِ بیان، یا اور کوئی صفت جس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ شاعری جزویست از پیغمبری، ان میں سے کسی چیز کا ذکر آزاد نے تعریف کی بھرمار کرتے ہوئے بھی کیا۔ لارڈ میکالے کی طرح آزاد بھی اپنے اندازِ بیان کا بادشاہ ہے جو اثر چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے مگر کھلی ڈھلی غلط بیانی سے اپنے کو بچا لیتا ہے۔ آزاد نے کیا یہ ہے کہ ذوقؔ کی شاعری پر اپنے خاص انداز سے ایک جگمگاتا ہوا پردہ ڈال دیا ہے۔

لیکن وقت کے ہاتھوں ہر پردہ اٹھ جاتا ہے اور اسی سے سمجھ لیجیے کہ آج ذوق کا نام غالب اور مومن کے بعد کیوں آتا ہے جو انفرادی رنگ اور جو اصلیت کا جوہر غالب اور مومن کے یہاں ہے وہ ذوق کے یہاں اس انداز میں نہیں، وہ زمانہ سہل پسندی کا تھا اور اسی سے ذوق بازی مار لے گئے اور اسی کمی کے احساس سے بے چین ہوکر آزاد، ظفر کے کلام پر حریصانہ نظر ڈالتے ہیں

اب دیکھیے کہ ذوق کے جو اشعار آزاد نے نہایت دل فریب تمہیدوں کے ساتھ پیش کیے ہیں وہ یہ ہیں

پاک کر اپنا دہاں ذکر خدائے پاک سے کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ پست ہمت یہ نہ ہوئے پست قامت ہو تو ہو

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیرِ پائے ہے یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

ماتھے یہ ترے جھمکے ہے جھومر کا بڑا چاند
لا بوسہ۔ چڑھے چاند کا وعدہ تھا۔ چڑھا چاند

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

شوق ہے اس کو بھی طرزِ عشاق سے دمبدم چھوڑے ہے منہ سے دود قلیاں چھوڑکر
دریائے عشق میں دم تحریر حالِ دل کشتی کی طرح میرا قلمدان بہ گیا

سنا آپ نے؟ قلمدان بہ گیا۔ اچھا ہوا۔ ان اشعار میں حقیقی شاعری کی فضائیں اور صدائیں کہاں۔ یوں تو استاد کے شعر ہیں خوش خیالی اور خوش ترکیبی سے خالی نہیں ہو سکتے۔

لیکن ذوق کا بیدرد سے بیدرد نقاد بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ذوق کی تقریباً سو غزلیں کچھ قصیدے اور طبع آزمائی کے دوسرے نمونے شاعرانہ خوبیوں اور لطافتوں سے خالی نہیں

ہیں یہ اشعار بھی سنیے

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیل عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے

دوق کے ایک شعر کو میں نے یوں سنا ہے

چارہ گروں سے ہو گئی غفلت ہاتھ سے نشتر چھوٹ گیا
جسم سراپا زخم جگر تھا ٹانکا ٹانکا ٹوٹ گیا

استادانہ بندش، لطیفِ زبان اور محاورات کے برجستہ استعمال کے نمونے دیکھیے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں خامشی تری سب کے جواب میں

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا — پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ — جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا — کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

بل بے کمر کہ زلفِ مسلسل کے پیچ میں — کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

اس نے جب میل بہت ردوبدل میں مارا — میں نے دل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا — میں بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

ان اشعار پر تو وہ لوگ بھی کچھ چونک پڑیں گے جو ذوق کو شاعر نہیں مانتے ایسے یا قریب قریب ایسے اشعار پچاسوں ذوق کے دیوان میں ملیں گے۔ عام طور پر ذوق کی غزلیں کیسی ہیں۔ ان میں جابجا جذباتی اور داخلی پہلو کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے اور ان کا کلام صحرائے بے آب و گیاہ کی طرح بالکل خشک اور بنجر نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کلام کا زیادہ حصہ خارجی اور مصنوعی قسم کی شاعری کا نمونہ ہے۔ لیکن اس رنگ کو بھی ذوق نے اپنی مشاقی، قادرالکلامی اور استادانہ انداز سے سجادیا ہے۔ بیان میں ایک پختگی، ایک شستگی اور استادانہ شان ملتی ہے۔ غالب اور مومن کے کلام کی سی معنویت و داخلیت (Inwardness) نہ سہی لیکن ناسخ کے کلام کی طرح ذوق کے اشعار ریگِ رواں بھی نہیں ہیں۔ وہ ناسخ سے متاثر ضرور تھے لیکن وہ دلی کے شاعر تھے۔ اس لیے غالب، مومن اور اپنے شاگرد ظفر کے یہاں پر خلوص رنگ کی شاعری دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ظفر کے ذکر سے آپ چونکیں نہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ اور روایتوں میں جو فائدے استادوں نے شاگردوں سے اٹھائے ہیں وہ ہمیشہ صیغۂ راز میں رہے ہیں اور ظفر کوئی معمولی شاگرد نہیں تھا وہ ذوق کی شاعری اور شاعرانہ ذہنیت کی فضا بن گیا تھا۔ رہے غالب اور ذوق سو یہ کہنا تو بے سروپا سی بات ہے کہ ذوق کی زبان غالب سے اچھی ہے۔ ٹھیٹھ اردو، ٹکسالی اردو، بول چال کی نرم شستہ اور فصیح اردو، مدھی رچائی اردو میں بھی، غالب کا مقابلہ ذوق نہیں کر سکتے۔ غالب اردو معلّے کا بادشاہ ہے کہ آج اس کے اشعار سکہ رائج کی طرح دنیا کی زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ غالب کے خطوط کو بھی نہ بھولیے جس میں اس نے مراسلہ کو مکالمہ بنادیا۔ پھر بھی ذوق کی زبان کی شیرینی اور حلاوتِ میر کو چھوڑ کر کسی اور کے یہاں نہیں ملتی اور یوں ذوق اور میر میں بعد المشرقین ہے۔ آج اگر غالب کی زبان نرم ہو کر حالی کی زبان بن گئی ہے اور مومن کی زبان حسرت موہانی کی زبان بن گئی ہے تو ذوق کی زبان بھی دو آتشہ ہو کر داغ کی زبان بن گئی۔ رہے ذوق کے قصیدے تو خاقانی، انوری اور قاآنی کی تو اور بات ہے لیکن اگر سودا آسمانِ قصیدہ کے آفتاب نصف النہار ہیں تو ذوق اسی آسمان کے ماہِ کامل ہیں۔ لیکن اگر ذوق نے ہزار ڈیڑھ ہزار اشعار کی بھی اردو میں کوئی مثنوی لکھی ہوتی تو وہ ایک خاصے کی چیز ہوتی۔ اس غیر تصنیف شدہ مثنوی کے محاسن کا خیال کر کے ایک خلا کا احساس ہوتا ہے۔ کئی اچھے غزل گو شاعروں میں ذوق کے برابر مثنوی نگاری کی صلاحیت غالباً نہیں تھی۔ لیکن کون جانے[1]؟

---

[1] محمد حسین آزاد نے ذوق کی ایک غالباً نامکمل تلف شدہ مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ فراق

(۲)

سات برس بعد

مندرجہ بالا مضمون آل انڈیا ریڈیو دلی سے ۱۹۳۷ء میں ذوقؔ ڈے پر نشر ہوا تھا۔ یہ ۱۹۴۴ء ہے۔ سات برس بیت گئے۔ میرا خیال تھا کہ اس کتاب میں اسی مضمون کو بغیر اسے زیادہ ہاتھ لگائے داخل کر دوں گا۔ مگر جب اتنے دنوں بعد اپنا مضمون پڑھا تو اسے جتنا دلچسپ پایا اتنا ہی تشنہ بھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس مضمون کی ہر بات اگرچہ اپنی جگہ ایک بات ضرور ہے لیکن ذوقؔ کے کلام کے خط و خال صاف نمایاں نہیں ہوئے۔ مجھے بچپن ہی سے نہ جانے کیوں ذوقؔ کا کلام ناپسند تھا۔ نہ جانے کیوں اس لیے میں نے کہا کہ ناپسندیدگی کا احساس پہلے ہوا اور ناپسندیدگی کے اسباب کا احساس سن شعور کو پہنچنے کے بعد ہوا۔ میں دیکھتا تھا کہ میرے ہم عمر و ہم جماعت غالبؔ کے نہیں بلکہ ذوقؔ کے اشعار دہرایا کرتے تھے میں تنہا غالبؔ کے اشعار اکثر گنگنایا کرتا تھا۔ مجھے بچپن ہی سے نیم شعوری طور پر اس کا احساس ہوتا تھا کہ غالبؔ کے اشعار میں موسیقیت ہے اور تاثیر بھی۔ کھلے ڈھلے اشعار، خاص کر اخلاقی مضامین کے رسمی اشعار مجھے بچپن ہی سے ناپسند تھے۔ اخلاق کو کہاوت یا ضرب المثل کی شکل میں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اخلاق کی توہین ہو رہی ہے۔ مجھے اُسی سے ہندی کے اخلاقی دوہے بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ مگر میرے ہم عمر لڑکے تھے اور معلم صاحبان تھے کہ لہک لہک کر ذوقؔ کے اشعار سنایا کرتے تھے۔

جب میں جوان ہوا تو اپنے دوست مجنوںؔ کو دیکھا کہ بعض اوقات وہ لگاتار ذوقؔ کے کئی اشعار سنا جاتے تھے۔ مجھے یہ اشعار اب بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ اور حضرات بھی ذوقؔ کے اشعار سنایا کرتے تھے۔ یہ سب اہلِ نظر تھے لیکن میں سنی ان سنی ایک کر دیتا تھا۔ رفتہ رفتہ جب میری طبیعت میرا وجدان میرا احساسِ شعری اور خود میری شاعری ان سب کو جیسا بننا بگڑنا تھا بن بگڑ چکے تب مجھ میں ایک رواداری پیدا ہو گئی۔ ایک بار اتفاقیہ طور پر میرے کرم فرما سید اعجاز حسین صاحب لکچرار شعبۂ اردو الٰہ آباد یونی ورسٹی کے منہ سے یہ فقرہ دورانِ گفتگو میں نکل

گیا کہ ذوقؔ کی زبان بہت شیریں ہے اس وقت مجھ میں خود اعتمادی آچلی تھی اور اپنے مذاق، وجدان سے مختلف چیزوں کے محاسن پر میری آنکھ جم سکتی تھی۔ چناں چہ ذوقؔ کی کچھ قدر رِدائی بھی آہستہ آہستہ مجھ میں پیدا ہونے لگی۔ میرا مزاج خود ایسا بنا ہوا تھا کہ داغؔ کے اشعار جن کے سننے سنانے کا کچھ دنوں پہلے فیشن تھا مجھ پر ایک ناخوشگوار اثر ڈالتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ شاعری کی نرم روح کو داغؔ کی برجستگی اور شوخی سے ان کی چاق چوبند زبان سے چوٹ پہنچ رہی ہے۔ اس کے علاوہ جو ڈھیلا پن اور بے کیفی کہیں کہیں ذوقؔ کے یہاں ہے وہی داغؔ کے بہت سے اشعار میں بھی موجود ہے۔ بلکہ ذوقؔ کے اخلاقی اشعار شعریت کی کمی کی وجہ سے اتنے بے کیف بے مزہ نہیں ہوتے جتنے داغؔ کے بہت سے عشقیہ اشعار۔ عشقیہ اشعار میں شرئیت دیکھ کر بہت غصہ آتا ہے خاص کہ جب ان میں شوخی و بزلہ سنجی بھی نہ ہو۔ میں ذوقؔ اور داغؔ کے متعلق اپنے ردِّعمل پر اب بھی نادم نہیں ہوں۔ ان دونوں کے لب و لہجے میں محاسن ہیں لیکن گو دماغ انھیں پہچانتا ہے وہ دل کو نہیں لگتے۔ مگر ادب میں ہمیں ترجیح کا تو حق ہے اخراج کا حق نہیں ہے۔ پھر میں نے یہ بھی سوچا اور مثالیں بھی نظروں کے سامنے پیش ہو گئیں کہ ذوقؔ نے جس طرح اردو شاعری کو نرمایا اور اس میں کبھی لچ اور کبھی لچک پیدا کی اس میں شعریت کا رس اور جس نہ سہی یا کم سہی لیکن ہماری زبان کے جن ٹکڑوں کو وہ باندھ گیا ہے اور جس طرح باندھ گیا ہے انھیں ٹکڑوں کو اور اسی طرح کے ہزارہا ٹکڑوں کو ترنم، نشتریت اور شعریت کے ساتھ اور ذوقؔ سے کہیں زیادہ نرمی کے ساتھ نئی لچکنوں، نئی تھرتھراہٹوں کے ساتھ بعد کی اردو شاعری میں ہم بندھا ہوا دیکھتے ہیں۔ ذوقؔ کے کارنامے کے نجی محاسن بھی اور ان کے پھیلے ہوئے اثرات بھی، یہ محاسن اپنے چولے میں بھی اور بدلے ہوئے چولوں میں بھی اس قابل ہیں کہ انصاف سے ان کی داد دی جائے۔

آزادؔ جن الفاظ میں ذوقؔ کی شاعری کو سراہتے ہیں انھیں اب مبالغہ سمجھا جانے لگا ہے۔ وہ مبالغہ سہی لیکن نیم شعوری طور پر آزادؔ کو کلامِ ذوقؔ کے مخصوص محاسن، مخصوص خدوخال اس کے نکھ سکھ کا احساس ضرور تھا۔ علاوہ ذوقؔ سے ذاتی خصوصیت کے یہی وہ احساس ہے جو انھیں غالبؔ پر بہتیری چوٹیں کر جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس وقت بھی جب مجھے ذوقؔ کی شاعری ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جہاں تک ذوقؔ کو سراہنے کا معاملہ ہے آزادؔ سراسر جھوٹ تو کیا بولتے ہوں گے۔ ذوقؔ کی غزلوں کا میں نے اب جو مطالعہ کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آزادؔ کے "جھوٹ" اور "مبالغے" میں بھی ایک سچائی ضرور ہے۔ آزادؔ کسی ایسے ویسے کی تعریف نہیں کر رہے ہیں وہ ایک ایسے استادِ فن کا گن گا رہے ہیں جو ہماری

ِ عری کی زبان کے لیے وہ کچھ کر گیا جو سب سے نہیں ہو سکتا تھا۔ ذوقؔ کا کلمہ پڑھنے والے ہ حب "آبِ حیات" آزاد کے لیے نہیں بلکہ آزاد انصاری شاگرد حالیؔ کے لیے جوشؔ ملیح آبادی کہتے ہیں "آپ کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ الفاظ کی ترتیب اور نشست ایسی ہوتی ہے کہ اکثر و بیشتر اس کی نثر نہیں کی جا سکتی" کہنے اور سننے میں تو یہ بات شاید زیادہ مشکل معلوم نہ ہو، مگر اس کے برتنے میں جو ہفت خواں طے کرنا ہوتے ہیں ان کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے"۔ لیکن اس بیل کو پہلے پہل ذوقؔ ہی نے منڈھے چڑھایا تھا۔ اس کام کو چھیلے ذوقؔ ہی نے سنوارا تھا۔ ذوقؔ ہی کی بدولت ذوقؔ کے زمانے میں اور ان کے بعد بہت سے کہنے والوں نے الفاظ کی ترتیب اور نشست یوں رکھنا سیکھا کہ مصرعے کی نثر نہ ہو سکے اور غزل میں شعر موروں کا لطف پیدا ہو جائے۔

یہی سلاست و روانی محض سطحی صفات ہیں۔ ذوقؔ سو فیصدی صرف سطحی شاعر نہیں ہے۔ وہ پنچائتی اور روائتی خیالات کو جس طرح مکمل بناتا ہے اس میں کافی سوجھ بوجھ اور غور و فکر کی ضرورت ہے۔ یوں تو ہر وہ خیال جس کا ایک اظہار کرے اور جسے دوسرا مانے یا پسند کرے پنچائتی خیال ضرور ہے، روائتی نہ سہی۔ انفرادیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سماج جس احساس اور خیال کو اپنا ہی نہیں سکتا وہ احساس و خیال کوئی ظاہر کرے۔ سماج کے دل و دماغ پر کچھ خیالات معتقدات تیرتے رہتے ہیں انہی کو عموماً ہم پنچائتی چیزیں کہتے ہیں۔ ہاں تو ذوقؔ کے یہاں جس چیز کی کمی ہے وہ شاعرانہ اندازِ احساس ہے اور یہی کمی ذوقؔ کے اندازِ بیان کو اس کے سارے محاسن کے باوجود شعریت سے محروم رکھتی ہے زبان و خیال میں یا پنچائتی آواز میں اگر ایک مخصوص چٹیلاپن اور تھرتھراہٹ پیدا ہو جائے تو اس وقت شاعری میں انفرادیت آجاتی ہے۔ جو کچھ اور جیسا کچھ ذوقؔ نے کہا ہے وہ بے عیب ہے، مکمل ہے، استادانہ ہے، کئی اچھی خوبیوں کا حامل ہے لیکن شاعری میں خاص کر غزل کی شاعری میں ہم کچھ اور چیزیں بھی پانے کی امید رکھتے ہیں اور وہی چیزیں ہم ذوقؔ کی غزلوں میں نہیں پاتے یا بہت کم پاتے ہیں۔ دو شاعروں میں ہم نمایاں طور پر یہی بات استاد آرزو کے یہاں پاتے ہیں۔ جس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ذوقؔ اور آرزو کا رنگِ کلام یکساں ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ ذوقؔ کی طرح آرزو بھی بات بہت رچا کر کہتے ہیں لیکن اپنی آواز میں شاعری کی روح نہیں پھونک سکتے۔ پھر بھی ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ شاعری کی روح جو کچھ بھی ہو یا بہت کچھ بھی ہو شاعری ایک فن یا آرٹ ہے۔ آرٹ کے معنی ہیں کسی چیز کو بنانا یا کچھ کرنا۔ فن کے لحاظ سے ذوقؔ کا کارنامہ بھلایا جا ہی نہیں سکتا۔ اس کارنامے کی خود اپنی ایک حیثیت ہے اور اس کی

تاریخی اہمیت بھی غیر معمولی ہے۔

ذوقؔ کے یہاں وہ کئی چیزیں نہ پا کر جو ہمیں محبوب و مرغوب ہیں ہمیں بے صبری سے ذوقؔ کا دیوان الگ نہیں پھینک دینا چاہیے۔ اگر ہم نے ذرا تامل و رواداری سے کام لیا تو اپنا الگ مذاق رکھتے ہوئے بھی ذوقؔ کے مذاقِ سخن سے ہم لطف اندوز ہو سکیں گے۔ اب مندرجہ ذیل اشعار کو ذرا ٹھہر ٹھہر کے پڑھیے اور ان کے مخصوص محاسن پر نظر ڈالتے جائیے۔ غالب اور مومنؔ دونوں نے مختلف زاویوں اور مختلف سمتوں اور اندازوں سے بعد کی اردو شاعری کو متاثر کیا۔ اور ذوقؔ نے؟ کیا اور بہت کچھ متاثر کیا۔ اس سلسلے میں ذوقؔ کے اشعار درج کرنے سے پہلے اور بعد میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اپنے ہم عصروں اور بعد کے آنے والوں کو ذوقؔ نے جان اور انجان طریقوں سے نمایاں طور پر متاثر کیا۔ رسالہ "آج کل" دلی نے حال میں کلامِ عارف (وہی عارف جس کا مرثیہ غالبؔ نے کہا ہے) پر ایک مضمون شائع کیا ہے اور عارف کے بہت سے اشعار کا اقتباس بھی دیا ہے۔ اگر عارف اور اس زمانے کے کئی اور شعرا کا کلام ہمیں دستیاب ہوتا تو ہم دیکھتے کہ اسلوبِ ذوقؔ کی صلاحیتوں اور محاسن سے جہاں تک زبان اور طرزِ بیان کا تعلق ہے جو وسیع اور ہمہ گیر اثر شعراء اور شاعری پر ڈالا اس کی حیثیت غالب و مومنؔ کے اثرات سے جداگانہ سہی لیکن ہے وہ قابلِ قدر۔

اے صنم کیا پوچھتا ہے حال اس رنجور کا
دل نہ اٹکائے کہیں اللہ بے مقدور کا

دوسرے مصرعے میں بول چال کی زبان کو ذوقؔ نے کس طرح سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ یہ صفت مومنؔ و غالب سے ذوقؔ کو الگ کرتی ہے گھلاوٹ اور خود گداختگی اس شعر میں نہ ہو لیکن بیان کی صفائی میں استادانہ شان ہے۔

اسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا　　اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا　　فرشتہ اس کا ہمپایا نہ پایا
مقدمے ہی سے گر سود و زیاں ہے　　تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا
لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام　　خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا
فلک کے گنبدِ بے در سے ہم تو　　نکل جاتے مگر رستا نہ پایا

جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا　کہیں ہم نے تجھے تنہا نہ پایا
کیا ہم نے سلام اے عشق تجھ کو　کہ اپنا حوصلہ اتنا نہ پایا
نہ مارا تو نے پورا ہاتھ قاتل　ستم میں بھی تجھے پورا نہ پایا
نظیر اس کا کہاں عالم میں اے ذوقؔ
کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

یہ اسلوبِ بیان نہ مومنؔ کا ہے نہ غالبؔ کا۔ یہ اسلوب بیاں سو (۱۰۰) فی صدی اردو ہے۔ کم سے کم فارسی الفاظ آئے ہیں۔ اضافتیں اور بھی کم ہیں اور یہ سب ٹھیٹھ اردو کے سانچے میں بے تکلف ڈھل گئی ہیں۔ قافئے بھی ذوقؔ کی اردوئیت کی طرف اشارے کر رہے ہیں۔ اخلاقی مضامین پنچایتی روایتوں، مسلمہ کلیوں سے ذوقؔ کی رغبت ان اشعار سے نمایاں ہے۔ انفرادی جذبات ذوقؔ کے یہاں نہ ڈھونڈھیے۔

میں ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا　تم وقت پہ آپہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا
آنے سے مرے ٹھہر گئے آپ وگرنہ　جانے کا ارادہ تو کہیں ہو ہی چکا تھا
کیا دیکھتے ہم یوسفِ کنعاں کو کہ اپنا　منظور نظر ایک حسیں ہو ہی چکا تھا
برہم اسے کیوں تو نے کیا چھیڑ کے پھر زلف
اے دل وہ ابھی چیں بہ جبیں ہو ہی چکا تھا

ردیف قابل توجہ ہے۔ مطلع کے دوسرے مصرعے میں "نہیں ہو ہی چکا تھا" کے ٹکڑے میں خالص اردو کا بے تکلف نکھار، بے لاگ اندازِ بیان دیکھنے کی چیز ہے۔ تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں "ایک" کا لفظ بہت بلیغ ہے۔

گل ہوا، مل ہوا میں ذوقؔ کی غزل کے یہ دو شعر سنیے

پروانہ بھی تھا گرم تپش پر کھلا نہ راز　بلبل کی تنگ حوصلگی تھی کہ غل ہوا
بندہ نواز یاں تو یہ دیکھو کہ آدمی
جزوِ ضعیف محرمِ اسرارِ کل ہوا

فارسی کافی آئی ہے لیکن اس نرمی سے کہ معلوم نہیں ہوتا

موت نے کردیا ناچار وگرنہ انساں ہے وہ خودبیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا
آپ آئینۂ ہستی میں ہے تو اپنا حریف ورنہ یاں کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا
سینۂ چرخ میں ہر اختر اگر دل ہے تو کیا ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا

عام باتیں، عام راہیں روایتی خیالات ہیں مگر کس ہلکے پھلکے انداز سے نظم ہوگئے ہیں۔

جو نہ رنگِ رنج و ماتم کا یہاں نمود ہوتا تو زمیں نہ زرد ہوتی نہ فلک کبود ہوتا
یہ حیاتِ چند روزہ جو نہ سدِّ راہ ہوتی تو پھر ایک عرصہ گاہِ عدم و وجود ہوتا

قدرے مشکل مضامین کو بھی کس سہل اور صاف طریقے سے باندھ دیا ہے۔

نیمچہ یار نے جس وقت بغل میں مارا جو چڑھا منہ اسے میدانِ اجل میں مارا
اس نے جب مال بہت رد و بدل میں مارا میں نے دل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا
اجل آئی نہ شب ہجر میں اور تو نے فلک بے اجل ہم کو تمنائے اجل میں مارا
دل کو اس کاکل پیچاں سے نہ بل کرنا تھا یہ سیہ بخت گیا اپنے ہی بل میں مارا
اس لب و چشم پہ ہے زندگی و موت اپنی کہ کبھی دم میں جلایا کبھی پل میں مارا

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

پہلا شعر بہت کمزور ہے۔ یہ مطلع بالکل برائے بیت ہے۔ دوسرے شعر کا کیا کہنا، شعریت نہ ہوتے ہوئے بھی دوسرا مطلع اس طرح سانچے میں ڈھلا ہوا ہے کہ منہ سے بے اختیار واہ نکل جاتی ہے۔ تیسرا شعر بھی بہت سست ہے لیکن دوسرے مصرعے میں بیان کی صفائی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ چوتھے شعر میں بھی محاورہ اور بول چال کے الفاظ پر ذوقؔ کس طرح جان دیتے تھے صاف نمایاں ہے۔ پانچویں شعر میں دم اور پل کے الفاظ بھی خوشگوار روزمرہ کی مثال ہیں۔ مقطعے میں غزل کے قافیے نے جھک مار کے میرؔ کی تعریف ذوقؔ سے کرائی ہے۔ یہ بولتا ہوا شعر اپنی برجستگی کے باوجود میر کی تعریف میں مجھے ہمیشہ کچھ غیر آسودہ

"نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب"

جدا ہوں یار سے ہم اور نہ ہوں رقیب جدا
ہے اپنا اپنا مقدر جدا نصیب جدا

تری گلی سے نکلتے ہی اپنا دم نکلا
رہے ہے کیوں کہ گلستاں سے عندلیب جدا

ہے اور علم و ادب مکتبِ محبت میں
کہ ہے وہاں کا معلم جدا ادیب جدا

فراقِ خلد سے گندم ہے سینہ چاک اب تک
الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا

کریں جدائی کا کس کس کی رنج ہم اے ذوقؔ
کہ ہونے والے ہیں ہم سب سے عنقریب جدا

ردیف اور قافیے نگینے کی طرح جڑ دیے گئے ہیں۔ آواز میں رکاوٹ نہیں ہے لیکن گھلاوٹ بھی نہیں ہے۔ آواز حساس نہیں ہونے پائی۔ غم کے مضامین ہیں لیکن آواز دکھتی ہوئی نہیں ہے۔

شکر پردے ہی میں اس بت کو حیا نے رکھا
ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا

آشیاں باغ میں ڈھونڈھا جو قفس سے جاکر
ایک تنکا بھی نہ تھا بادِ صبا نے رکھا

نہ رکھی خوبی و زشتی سے غرض آئینہ دار
گھر میں مہماں جسے اہلِ صفا نے رکھا

مطلع کے دوسرے مصرعے میں دو فقرے کس اچانک برجستگی سے آئے ہیں۔ اس اسلوب کو ذوقؔ نے شروع میں چمکایا۔ آتشؔ اور شاگردانِ آتشؔ نے زبان میں جو صفائی پیدا کی جو برجستگی اور بے تکلفی لائے دلی میں اس کی مثال ان اشعار میں نظر آتی ہے۔ ردیف پر جس طرح اشعار کی تان ٹوٹ رہی ہے وہ فاتحانہ شان سے اردو کے آگے بڑھنے کی مثال ہے۔

نشہ دولت کا بداطوار کو جس آن چڑھا
سر پہ شیطان کے یاں اور بھی شیطان چڑھا

عشق کے ڈھب پہ نہ کوئی بجز انسان چڑھا
اس کے قابو پہ چڑھا تو یہی نادان چڑھا

دیکھنا ملت و دیں دونوں ہی برباد کہ آج
باد کے گھوڑے پہ وہ دشمن ایمان چڑھا

سنگ سرمہ میں سیہ تاب تھی وہ تیغ نگاہ
گردش چشم نے پردی ہے عجب سان چڑھا

اشک آئے نہیں مژگاں پہ کہ یاروں نے ابھی
پانی سو نیزہ دیا باندھ کے طوفان چڑھا

حضرت عشق کی درگاہ میں آکر اے ذوق

دل و دیں دیتے ہیں سب گبرو مسلمان چڑھا

دیکھیے ردیف اور قافیہ کے میل سے اردو کے ٹھنڈول کا رنگ۔ ذوق لوگوں کو محسوس کرا دیتے تھے کہ اردو شاعری طرز بیان میں فارسی شاعری سے الگ نکھار رکھتی ہے۔ غالب و مومن کے یہاں اردومیت پر جذبات اور تخیل حاوی ہیں۔ ذوق اردو کا نرالا پن دکھا کر لوگوں کو چونکا دیتے تھے۔ گہرے جذبات سے متاثر ہونے کی صلاحیت اس زمانے میں بہت کم لوگوں میں تھی۔ سطحی مگر ذرا چمکتی ہوئی بزلہ سنجی کو پہچان کر پھڑک اٹھنا خاص و عام سب کے لیے آسان تھا۔ دوسرے مطلعے میں نادان کے لفظ کی معنویت دیکھیے۔

خلافِ وعدہ سے میں تیرے کل تو جاں بلب آیا — نہ آیا آج بھی گر تو تو اے ظالم غضب آیا

برنگ غنچہ خونیں دل ہنسے کیا اس گلستاں میں — بھر آیا منہ میں خوں گر اک تبسم زیر لب آیا

مطلع کے دوسرے مصرعے میں "غضب آیا" کا ٹکڑا بول چال کو غزل کے سانچے میں ڈھال دینے کی مثال ہے۔ "نہ آیا آج بھی گر تو" کے ٹکڑے کو بھی دیکھیے انھی نقوش کو تو داغ کے ہاتھوں چمک جانا ہے۔

سر رہِ فنا میں ہوں مہیا ہے سفر لیکن — برنگِ اشکِ مژگاں منتظر ہوں اک اشارے کا

بہت اچھا شعر ہے۔ دوسرے مصرعے میں شاعری اور مصوری یوں مل گئی ہیں کہ کیا کہنا۔

آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا — یہ حسرت پابوس نکل جائے تو اچھا

جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر — جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا

وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر — اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا

ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام — اور پھر کہوں گر آج سے کل جائے تو اچھا

القصہ نہیں چاہتا میں جائے وہ یاں سے — دل میری ہی باتوں میں بہل جائے تو اچھا

ہے قطع رہِ عشق میں اے ذوق ادب شرط

یاں شمع نمط سر ہی کے بل جائے تو اچھا

دیکھیے ذوقؔ کی ردیفوں میں ٹھیٹھ اردو (یا ٹھیٹھ ہندی) کا ٹھاٹھ۔ مگر بیان کی خارجیت بھی دیکھیے۔ سوزوگداز پیدا نہیں ہو سکا۔ زبان کی شاعری کے یہی خطرے ہیں، مگر مشاقی کے یہ کرتب کچھ دیر کے لیے متوجہ تو کر ہی لیتے ہیں۔

کہے ہے خنجر قاتل سے یہ گلو میرا — کہ جو مجھ سے کرے تو پیے لہو میرا
مجھے وہ پردہ نشیں سامنے کب آنے دے — جو ذکر آنے نہ دے اپنے روبرو میرا
مقام وجد میں آئیں ابھی ملایکِ عرش — جو میکدے میں سنیں شور ہائے و ہو میرا
کروں میں کیا کہ گریبان صبح کی مانند — نہیں ہے چاک جگر قابلِ رفو میرا

ہمیشہ میں ہوں اسی داؤ گھات میں اے ذوقؔ
کہ رام ہو وہ غزالِ پلنگ خو میرا

شاعری کہاں ہے۔ ذوقؔ کے کمال کی بھی بہترین مثال یہ اشعار نہیں ہیں۔ پھر بھی صفائی اور روانی اور بول چال کی چاشنی اشعار کو بالکل بے مزہ ہونے سے بچا لیتی ہیں۔ مقطعے میں وہ شکار کھیلنا چاہا ہے جس میں بڑے خطرے ہیں۔

کب صبا آئی ترے کوچے سے اے یار کہ میں — جوں حبابِ لبِ جو جامہ سے باہر نہ ہوا

"حبابِ لبِ جو" کے ٹوٹنے کو جامے سے باہر ہونا کہنا استادانہ انداز بیان ہے۔ غالبؔ و مومنؔ بھی اس کی داد دیے بغیر نہ رہتے۔

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے — لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا
مجھ میں اس میں ربط ہے گویا برنگِ بوو گل — وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

پہلا شعر ضرب المثل بن گیا ہے۔ دوسرے شعر کی تشبیہ لطافت سے خالی نہیں۔ 'ہی رہا' کی ردیف بھی اردو کی خصوصیت کو چمکا دینے کا امکان رکھتی ہے۔

ترے رخسار کا پرتو پڑے گر عارض گل پر
کرے چشمک زنی خورشید پر ہر قطرہ شبنم کا

اس شعر سے جو تصویر جھلک جاتی ہے اس کی رنگینی اور آب و تاب سے کون انکار کر سکتا ہے۔

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا　　　پر میرا جگر دیکھ کہ میں اف نہیں کرتا
پڑھتا نہیں خط غیر مراداں کسی عنواں　　　جب تک کہ عبارت میں تصرف نہیں کرتا
اے ذوقؔ تکلف میں ہے تکلیف سراسر　　　آرام سے ہے وہ جو تکلف نہیں کرتا

مطلع کا دوسرا مصرع کسی قدر بے لاگ ہے۔ دوسرا شعر مزے دار ہے مقطع تو ضرب المثل ہو گیا ہے۔ مطلع تو بے لاگ داغؔ کی یاد دلاتا ہے۔

خاکساری کو ہماری مل گئی اکسیر عشق　　　اب تو پارس ہو گا جو آئے گا پتھر زیر پا
زیردستی پر بھی ہے موذی سے لازم احتراز　　　جب دبے گا سانپ کاٹے گا مقرر زیر پا

پارس اور پتھر نے ٹھیٹھ اردو کی شان شعر میں پیدا کردی ہے۔ دوسرے شعر میں اخلاقی مضمون کو مثالیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ "جب دبے گا سانپ کاٹے گا" بے لاگ اردو ہے۔

کوہ کے چشموں سے اشکوں کو نکلتے دیکھا　　　اے صنم پر ترا پتھر نہ پگھلتے دیکھا
تھا میں اس باغ میں نخلِ گلِ آتش بازی　　　پھولتے دیکھا مگر آہ نہ پھلتے دیکھا

"ترا پتھر نہ پگھلتے دیکھا" دوسرے شعر میں پھولتے، پھلتے کے الفاظ یہ سب اس رجحان کا پتا دے رہے ہیں جس کے زیر اثر اردو شاعری میں نمایاں طور پر اردو زبان کو ابھارا جا رہا ہے۔

چاہے عالم میں فروغ اپنا تو ہو گھر سے جدا
دیکھ چمکے ہے شرر ہوتے ہی پتھر سے جدا

اخلاقی مضمون کو مثالیہ شاعری کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اسی زمانے میں ناسخؔ اور دیگر شعرائے لکھنؤ اس طرف متوجہ تھے۔

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہرے گا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہرے گا

پہلا مصرع یوں بھی شائع ہوا ہے

تیرے ہاتھوں کوئی آوارہ اے گردوں نہ ٹھہرے گا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہرے گا

حالت میں چھوڑ دیتا ہے۔ پوری غزل مصحفی کی یاد دلاتی ہے۔

جینا ہمیں اصلاً نظر اپنا نہیں آتا   گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا   پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

آئے تو کہاں جائے نہ تاجی سے کوئی جائے
جب تک نہیں آتا اسے غصہ نہیں آتا

پہلا شعر صاف ستھرا اور رواں دواں ضرور ہے۔ اس شعر میں جو روانی ہے یا جو اس کی کامیابی ہے وہی اسے شعریت سے معرا کہ رہی ہے۔ کہیں ایسی حالت میں ایسی رواں دواں بات منہ سے نکل سکتی ہے؟ دوسرے شعر میں چوں کہ بہت تکلیف دہ جذبے یا احساس کا ذکر نہیں ہے زبان کی روانی و برجستگی اور اردو کی بہار مزہ دے رہی ہے۔ تیسرے شعر کا دوسرا مصرع بہت استادانہ ہے۔ داغ اسی اندازِ بیان کو چمکائیں گے۔

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں   کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہہ گیا

ہے موجِ بحرِ عشق وہ طوفاں کہ الحفیظ   بیچارہ مشتِ خاک تھا انسان بہہ گیا

تھا ذوق پہلے دہلی میں پنجاب کا سا حسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہہ گیا

بڑی مشکل ردیف تھی۔ ذوق نے اپنی چابک دستی سے اس زمین میں بہت صاف اور بے تکلف اشعار موزوں کیے ہیں۔ تیسرے شعر میں محاورے کا استعمال بہت بے لاگ ہے۔ جب کوئی موقع ہاتھ سے جاتا رہتا یا کسی کام کا وقت گزر جاتا تو کہتے تھے کہ اب وہ پانی ملتان بہ گیا یعنی اب وہ بات جاتی رہی۔

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا   خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا

میں ہوں چکر میں لگی جس دن سے دنیا کی ہوا   حال میرا ہے بعینہٖ آسیائے باد کا

مطلع کا دوسرا مصرع کس قدر بے لاگ ہے۔ یہی صفت ذوق کے شاگرد داغ کے یہاں دہک اٹھنے والی ہے۔ دوسرے شعر میں تشبیہ کی تلاش قابلِ توجہ ہے۔ اسے صابیت کہیں یا

ناسخیت یا محض کلاسکیت؟

اسے عیار پایا یار سمجھے ذوقؔ ہم جس کو   جسے یاں دوست اپنا ہم نے جانا وہ عدو نکلا

کیا دوسرا مصرع داغؔ کے کلام کی جلن اور تیکھے پن کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہے؟

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا   کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا
محتسب گرچہ دل آزاد ہے مے خواروں کا   دیجیے اک جام تو ہے یار ابھی یاروں کا

اتنا تو شورِ فغاں ہو کہ چمن میں بلبل
خرمنِ گل کی جگہ ڈھیر ہو انگاروں کا

بیان کی صفائی اور بے تکلفی تینوں اشعار میں دیکھیے۔ دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں یہ صفت کس طرح چمک اٹھی ہے۔ اردو کی چمک یہیں قابلِ سماعت ہے۔

نالہ اس شور سے کیوں میرا دہائی دیتا   اے فلک گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا
دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا   آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا
لاکھ دیتا فلک آزار گوارا تھے مگر   ایک تیرا نہ مجھے دردِ جدائی دیتا
کوں گھر آئے کے آتا اگر وہ دل میں   خاکساری سے نہ جاروبِ صفائی دیتا
مے سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے   گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا

دیکھ گر دیکھنا ہے ذوقؔ کو وہ پردہ نشیں
دیدۂ روزنِ دل سے ہے دکھائی دیتا

اردو کا اردو پن اس طرح نہ غالبؔ کے یہاں نمایاں ہے نہ مومنؔ کے یہاں مگر اردو میں شعریت کے جو امکان ہیں وہاں تک ذوقؔ کی پہنچ نہیں۔

ہر اک سے ہے قول آشنائی کا جھوٹا   وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا

بغیر شعریت کے لطفِ زبان کی مثال یہ مطلع بھی ہے۔ طربیہ یا ہجویہ اشعار کا اسلوب سانچے میں ڈھل رہا ہے۔

نکتہ اس بت سے کبھی لے دیں گے ہم ایمان کا　　ایسی جلدی کیا ہے جلدی کام ہے شیطان کا

جھوٹ ہی جانو کلام اس رہزنِ ایمان کا　　پہن کر جامہ بھی وہ آئے اگر قرآن کا

تو ہماری زندگی پر زندگی کی کیا امید　　تو ہماری جان لیکن کیا بھروسہ جان کا

جو فرشتے کرتے ہیں کر سکتے ہیں انساں بھی　　پر فرشتوں سے نہ ہو جو کام ہے انسان کا

نفسِ بے مقدور کو قدرت ہو گر تھوڑی سی بھی
دیکھ پھر سامان اس فرعونِ بے سامان کا

لطفِ زبان لیکن بے نمک شاعری کی مثال یہ تمام اشعار ہیں۔ بیان کا جیتا جاگتا جادو دیکھ لیجیے مگر شاعری کا جادو یوں نہیں جگایا جا سکتا۔ ذرا لطفِ بیان سے بچ کر شاعری کا جادو جگایا جاتا ہے۔ تیسرا شعر داغ کی یاد دلاتا ہے۔

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا　　جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

اس غزل کے اور اشعار اس لیے نظر انداز کرتا ہوں کہ یہ غزل اکثر اسکولوں کے اردو نصاب میں رہی ہے۔ ذوق کی خصوصیت کی یکسانیت یہاں بھی نظر آ رہی ہے۔

میں وہ شہید ہوں لبِ خندانِ یار کا　　ہنستا رہے چراغ بھی میرے مزار کا

ہنگامہ گرم ہستی ناپائدار کا　　چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

تو بر میں ہے مگر مری آنکھوں سے دور ہے　　لپکا جو پڑ گیا ہے مجھے انتظار کا

اس روئے تابناک پہ ہر قطرۂ عرق　　گویا کہ اک ستارہ ہے صبح بہار کا

اس شعر کو ذوق یوں بھی کرنا چاہتے تھے حاشیہ پر لکھ لیا تھا لیکن فیصلہ نہیں کر سکتے تھے کہ مندرجہ بالا شکل میں شعر کو رکھیں یا یوں رکھیں

دیکھ اپنے درِ گوش کو عارض سے متصل　　دیکھا نہ ہو ستارہ جو صبح بہار کا

اے ذوق ہوش گر ہے تو دنیا سے دور بھاگ　　اس میکدے میں کام نہیں ہوشیار کا

زبان، زبان، زبان! مضمون، مضمون، مضمون، لیکن شاعری؟ سرے سے تو غائب نہیں لیکن

کم ہے بہت کم۔

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا ‏ ‏ ‏ میں بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

بظاہر یہ مطلع بے کوشش و بے کاوش موزوں ہو گیا ایسا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ذوقؔ کو چھوڑ کر اور کس شاعر کے ایسے مطلعے یاد کرنے سے یاد آتے ہیں۔ شاعری اردو زبان کو گویا یار ہی ہے۔

اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا ‏ ‏ ‏ وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا[1]

رنگین اور رسیلی معاملہ بندی ہے۔ جراَتؔ کی پرچھائیں سی اس شعر پر پڑتی ہے۔ لیکن اس ہلکے پھلکے طریقے سے یہ مضمون باندھ دینا ذوقؔ ہی کا کام تھا۔ بات پوری کی پوری کہہ دی گئی ہے۔ اس لیے شعر میں رمزیت نہیں آسکی۔

بغل سے لے گئے دل کو نکال کر وہ صریح ‏ ‏ ‏ جو مانگا تو کہا آنکھیں نکال کے کیسا

"کیسا" کے لفظ میں روزمرہ کا لطف لے لیجیے اور بس۔

جنبشِ برگ صفت باغِ جہاں میں اے ذوقؔ ‏ ‏ ‏ کچھ نہ ہاتھ آئے گا تو ہاتھ ہی مل جاؤں گا

استادانہ مقطع ہے۔ مگر کھلے ڈھلے اندازِ بیان نے زیادہ تاثیر پیدا نہیں ہونے دی۔

اس سے تو اور آگ وہ بیدرد ہو گیا ‏ ‏ ‏ اب آہ آتشیں سے بھی دل سرد ہو گیا

پیرِ مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوقؔ ‏ ‏ ‏ نامرد مرد۔ مرد جواں مرد ہو گیا

دونوں اشعار کے دوسرے مصرعوں میں مشاقی کے کرشمے دیکھیے۔

پانی طبیب دے گا ہمیں کیا بجھا ہوا ‏ ‏ ‏ ہے دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا

کہتے تھے آفتابِ قیامت جسے سو وہ ‏ ‏ ‏ نکلا چراغ داغ دل اپنا بجھا ہوا

ہم آپ جل بجھے مگر اس دل کی آگ کو ‏ ‏ ‏ سینے میں ہم نے ذوقؔ نہ پایا بجھا ہوا

رواں دواں بے تکلف نثریت میں ہی ان اشعار کی استادانہ شان ہے۔ میرؔ کے کچھ اشعار یاد آتے ہیں اور ذوقؔ کا یہ مصرع بھی

---

[1] نہیں اٹھتی ہیں اوّل تو نگاہیں صبح کو اس کی
مگر اٹھیں تو پھر اٹھتی ہیں وہ اک داستاں ہو کر (عارف میسوری مرحوم)

خوب کہا ہے۔ کہاوت یہی نہیں کہ بے لاگ بندھ گئی ہے بلکہ ذوقؔ کے اسلوب میں اثر پیدا ہونے کے جو امکان ہیں وہ یہاں پورے ہوگئے ہیں۔

پھر تو آئے خیر سے ہم جا کے اس مغرور تک پر اچھلتا ہی رہا اپنا کلیجہ دور تک

شعر ذوقؔ کے اسلوب کی صاف مثال ہے۔ لیکن میرؔ کے اس شعر کے اثر کو ذوقؔ کہاں سے لائیں۔

تڑپے ہے جب کہ سینے میں اچھلے ہے دو دو ہاتھ گر دل یہی ہے میرؔ تو آرام ہو چکا

پابند جوں و خاں ہیں پریشانیوں میں ہم
یارب ہیں کس کی زلف کے زندانیوں میں ہم

ذوقؔ نے دل چسپ خارجیت لیے ہوئے شعر کہا ہے۔ لیکن غالبؔ کے "دودِ چراغِ کشتہ" سے نبض کی تشبیہ میں داخلیت آگئی ہے۔

بے یار روزِ عید شب غم سے کم نہیں جامِ شراب دیدۂ پر نم سے کم نہیں
دیتا ہے دورِ چرخ کے فرصتِ نشاط ہو جام جس کے ہاتھ میں وہ جم سے کم نہیں
ہوتی ہے جمعِ زر سے پریشانی آخرش درہم کی شکل صورتِ درہم سے کم نہیں

اس حوروش کا گھر مجھے جنت سے ہے سوا
لیکن رقیب ہو تو جہنم سے کم نہیں

آپ محسوس کر رہے ہیں ناکہ یہ رنگ نہ غالبؔ کا ہے نہ مومنؔ کا نہ ذوقؔ کے پہلے کسی اور شاعر کا۔ یہ صرف ذوقؔ کا رنگ ہے۔

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں
جاندادگانِ عشق پوچھو فنا کی راہ اس میں جنابِ خضر ابھی نابلد سے ہیں
جتنے مزے ہیں یاں روشِ نشۂ شراب ہو جاتے بے مزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

دل کے ورق پہ ثبت ہیں صد مہر داغِ عشق
ہم کرتے ذوقؔ عشق کا دعویٰ سند سے ہیں

عجب زمین ہے مگر ذوقؔ کی استادی نے اسے بس میں کر لیا ہے۔

بلائیں آنکھوں سے ان کی مدام لیتے ہیں ہم اپنے ہاتھوں کا مژگاں سے کام لیتے ہیں
ہمارے ہاتھ سے اے ذوقؔ وقت مے نوشی ہزار ناز سے وہ ایک جام لیتے ہیں

مقطعے کا دوسرا مصرع کس بانکپن سے کہا ہے! اس ادائے معشوقانہ میں کیا لطیف رکاوٹ ہے۔

دودِ دل سے ہے یہ تاریکی مرے غم خانے میں شمع ہے اک سوزنِ گم گشتہ اس کاشانے میں
برقِ خرمن سوز ہے عالم میں نافہمی تری ورنہ کیا کیا لہلہاتے کھیت ہیں ہر دانے میں

مطلعے میں تشبیہ بہت لطف دے رہی ہے۔ یوں تو یہ رنگ ناسخؔ سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن ناسخؔ کی انتہا پسندی کا عیب ذوقؔ کے مطلعے میں نہیں آنے پایا۔ دوسرے شعر کی معنویت قابل داد ہے۔ دونوں اشعار میں ایک نرم آہنگی ہے جو لکھنؤ اسکول کی شاعری سے ذوقؔ کے کلام کو الگ کر دیتی ہے، لکھنؤ اسکول کے اس قسم کے اشعار عموماً خشک اور کرخت ہوتے ہیں۔

علم جس کا عشق اور جس کا عمل وحشت نہیں وہ فلاطوں ہے تو اپنے قابلِ صحبت نہیں
خاک ہو کر بھی فلک کے ہاتھ سے ہم کو قرار ایک ساعت مثلِ ریگِ شیشۂ ساعت نہیں
ذوقؔ اس صورت کدے میں ہیں ہزاروں صورتیں
کوئی صورت اپنے صورت گر کی بے صورت نہیں

یہ اشعار بھی ناسخؔ کی کچھ یاد دلاتے ہوئے کسی قدر آتشؔ کے انداز کی طرف جھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

وقت پیری شباب کی باتیں ایسی ہی جیسے خواب کی باتیں
واعظا چھوڑ ذکر نعمتِ خلد کر شراب و کباب کی باتیں
مہ جبیں! یاد ہیں کہ بھول گئے؟ وہ شبِ ماہتاب کی باتیں
جامِ مے لب سے تو لگا اپنے چھوڑ شرم و حجاب کی باتیں
سنتے ہیں اس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم کس مزے سے عتاب کی باتیں

دیکھ اے دل نہ چھیڑ قصۂ زلف کہ ہیں یہ پیچ و تاب کی باتیں
ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوقؔ
ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

میرؔ کی چھوٹی بحر کی غزلیں "ساری مستی شراب کی سی ہے"۔ یا "ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں"۔ کتنی نشتریت رکھتی ہیں۔ مصحفیؔ کی غزل "ہاتھوں کی پناہ ہم نے کرلی" سوز و ساز کی رم چاشنی لیے ہوئے ہے۔ ذوقؔ کی غزل سطحی بات چیت کو شعر میں ڈھال دینے کی مثال ہے اور یاد دلاتی ہے داغؔ کی ایسی غزلوں کی جیسے "آپ بندہ نواز کیا جانیں"۔

ہے جی میں اپنے غرۂ جوہر کو توڑ دوں آئینۂ خیال مکدر کو توڑ دوں
دنیا سے میں اگر دلِ مضطر کو توڑ دوں سارے طلسمِ وہمِ مکدر کو توڑ دوں
میں کاٹ دوں پہاڑ کو پتھر کو توڑ دوں پر کیوں کہ غیر سے بتِ کافر کو توڑ دوں
کیا دشمنی ہے اہلِ کرم سے کہے ہے چرخ یاں تک جھکاؤں شاخ ثمر ور کو توڑ دوں
ساقی لڑائیوں سے تری چاہتا ہے جی باہم لڑا کے شیشہ و ساغر کو توڑ دوں
احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں
ہر موجِ بحر عشق کو یہ بل ہے۔ بل بے زور کہتی ہے دست و پائے شناور کو توڑ دوں
نازک خیالیاں مری توڑیں عدو کا دل میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں
پھر اس مژہ کو یاد کرے دل تو دل میں ذوقؔ
نشتر چبھو کے میں سر نشتر کو توڑ دوں

پتھریلی زمین سے ذوقؔ نے خوب خوب کام لیا ہے۔ مومنؔ، غالبؔ، میرؔ اور سوداؔ یہ نہیں رتے تھے۔ لیکن ذوقؔ اردو کے امکانات کو چمکا رہے ہیں۔ مصحفیؔ نے عموماً بسا اوقات انشا نے سی سنگلاخ زمینوں میں اپنی طبیعت اور اپنی استادی کے جوہر دکھائے ہیں۔ لیکن جس طرح یف اور قافیہ میں ذوقؔ محاورے باندھ گئے ہیں اور گوناگوں مضامین نظم کر گئے ہیں وہ ان کا حصہ ہے۔ اگرچہ بل جاؤں گا، پھل جاؤں گا والی غزل میں آتشؔ نے بھی قافیہ و ردیف کو ملا کر

محاورہ باندھا ہے اور اپنے خاص انداز کو بھی چمکا دیا ہے:

صورتِ پیرہنِ تنگ نکل جاؤں گا

گذرتی عمر ہے یوں دور آسمانی میں	کہ جیسے جائے کوئی کشتی دخانی میں
رکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی میں	کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں
وفور اشک اگر سر بہ موج ہو اپنا	فلک برنگِ گُل نیلو فر ہو پانی میں

وہ سیدھے گھر کو سدھارے اور ان کے کھوج میں ہم
پھرے بھٹکتے ہوئے کوئے بدگمانی میں

پہلا مطلع معہ تعقید کے ناسخیت کی جھلک لیے ہوئے ہے مگر اعتدال کے ساتھ۔ اس خارجی رنگ میں شعریت نہ سہی لیکن خیال کو ہلکا سا انبساط ضرور ملتا ہے۔ دوسرا مطلع اپنے بے لاگ اندازِ بیان کی وجہ سے ذوق کے کمال سخنوری کا صاف آئینہ ہے۔ تیسرے شعر میں پھر ناسخ کا رنگ جھلکنے لگا ہے۔ آخری شعر میں کوئے بدگمانی کی ترکیب بجائے خود بھی خوب ہے اور پورا شعر ایک حالت کی صحیح تصویر بھی ہے۔ کوئے بدگمانی غالب کی "کوئے ملامت" کی یاد دلا دیتی ہے مگر غالب کا شعر کتنا پراثر ہے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

گہر کو جوہری صراف زر کو دیکھتے ہیں	بشر کے دیکھنے والے بشر کو دیکھتے ہیں
جب اپنے رونے میں سوزِ جگر کو دیکھتے ہیں	دھوئیں پہ اڑتا ہوا خشک و تر کو دیکھتے ہیں
ہے ان کی چشم کی گردش پہ گردش عالم	جدھر ہو ان کی نظر سب اُدھر کو دیکھتے ہیں
پڑے گا سایۂ زلف اس پہ بھی ضرور کبھی	کہ پیچ و تاب تمھاری کمر کو دیکھتے ہیں

وہ دولت کر طلب جس سے کہ دل ہو جائے مستغنی

اگر ہاتھ آئے گا گنجینۂ قاروں نہ ٹھہرے گا

مطلع کے دوسرے مصرعے میں دو فقرے پیوست کر دیے گئے ہیں۔ ردیف کی شخصیت الگ سے نکھر آئی ہے چوں کہ ردیف اردو کا ایک فقرہ ہے اس لیے بیان کی تان جب اس پر ٹوٹتی ہے تو شعر کی اردویت چمک جاتی ہے۔

آدم دوبارہ سوئے بہشتِ بریں گیا دیکھو جہاں خراب ہوا پھر وہیں گیا

دوسرے مصرعے پر بے ساختہ منہ سے واہ نکل جاتی ہے "جہاں" اور "وہیں" کے الفاظ سے مصرعے میں جو لہک پیدا ہو گئی ہے یہ وہ صفت ہے جو غالب و مومن سے ذوق کو متمائز کرتی ہے۔

کیا کیا مزہ نہ تیرے ستم کا اٹھا لیا ہم نے بھی لطفِ زندگی اچھا اٹھا لیا

یوں لائے واں سے ہم دلِ سیپارہ کر کے جمع دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

حالی کہتے ہیں

کہہ دیا خو گرِ جفا تو نے خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

میر کا شعر ہے

جفائیں دیکھ لیں کج ادائیاں دیکھیں بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

ذوق، حالی میر تینوں کے مطلعے سیدھی سادی اردو میں ہیں۔ لیکن ذوق کے مطلعے میں نہ حالی کی سی بات پیدا ہو سکی نہ میر کی سی۔ ہاں ذوق کے مطلعے میں وہ دبی سی طنز ضرور ہے جو داغ کے اکسانے سے چنگاریاں بن کر اڑے گی۔

آنا تو خفا آنا۔ جانا تو رلا جانا آنا ہے تو کیا آنا جانا ہے تو کیا جانا

طنز ہی مطلعے کی جان ہے اور یہی کامیاب طنزیہ انداز شعر کو طنز سے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔

اے دل نہ راہِ عشق کشادہ سمجھ کے جا یاں اژدہا ہے ہر خطِ جادہ، سمجھ کے جا

عیاریوں سے یار کی نالاں ہے کیوں دلا　　اور اس کو اپنا دوست زیادہ سمجھ کے جا

دوسرے شعر میں بھی طنزیہ اندازِ بیان ہے لیکن اس طنز میں نہ داخلی کشش ہے نہ نوک نہ چبھن۔ بس ایک چھیڑ ہے ایک چٹکی اور کچھ نہیں۔ محبوب میں عیاریوں کا ہونا سمجھ میں ضرور آتا ہے لیکن اس کا یوں ذکر کرنا کیا غزل کی لطیف ترین اسپرٹ کو چوٹ نہیں پہنچاتا؟ دیکھیے معشوق کی "برائیوں" کی میر نے کس طرح شکایت کی ہے۔ "بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں"۔

بعد فراق کوئی دن ایسا نہ وصل کا ہوا　　وہ کہیں تم کو کیا ہوا ہم کہیں تم کو کیا ہوا

محاکاتی مطلع ہے۔ راز و نیاز کے ایک خاص لمحے کی تصویر دوسرے مصرعے میں کھنچ گئی ہے۔

چشم و نگہ کو تیری بدنام کیوں کرے گا　　مرگ و قضا کو تیرا عاشق نہ لے مرے گا

یعنی عاشق مرے گا تو تیری چشم و نگہ سے لیکن اپنی موت کے ساتھ وہ مرگ و قضا کو نہ لے مرے گا اور لوگ یہی کہیں گے کہ اس کی موت ہی آگئی تھی بے لاگ اندازِ بیان قابلِ داد ہے۔

مسجد میں اس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا　　کافر کی دیکھو شوخی۔ گھر میں خدا کے مارا

کسی فتنۂ خانقاہ کی کیسی تصویر کھینچی ہے دوسرے مصرعے میں دو فقرے کس برجستگی سے لائے گئے ہیں۔ گھر میں خدا کے مارا کا ٹکڑا بتا رہا ہے کہ یہ نہ مومن ہیں نہ غالب بلکہ ذوق اور صرف ذوق۔

آخر گل اپنی خاکِ درِ میکدہ ہوئی　　پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند　　گل آدم بسر شتند و بہ پیمانہ زدند

حافظ کا یہ مطلع یاد آگیا۔ ذوق کے شعر میں کچھ شوخی تو آہی گئی لیکن گہرائی؟

ذوق جلدی مۓ گلرنگ سے بھر ساغرِ گل

لبِ نازک کو ہے اس کے ہوسِ جامِ شراب

ردیف کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ اچھا خاصہ شعر نکال لیا۔

ہو ہجر مدتوں جو ہو وصل ایک دم نصیب　　کم ہو گا کوئی ہم سا بھی الفت میں کم نصیب

مطلع میں پہلے مصرعے میں قافیہ اور ردیف کا الگ الگ لفظ ہونا اور دوسرے مصرعے میں قافیہ ردیف مل کر ایک لفظ بن جانا خالی از لطف نہیں۔ ذوق زبان کو وسعت دے رہے ہیں۔ اسی مضمون کو مومن نے نشتر بنادیا ہے:

اس سے تقدیر میں تھا کم ملنا　　کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی

دل عبادت سے چرانا اور جنت کی طلب　　کام چور اس کام پر کس منہ سے اجرت کی طلب

عبادت سے جنت پانے ہی پر تو عمر خیام نے کہا تھا "ایں مزد بود مہر د عطائے تو کجا است" مگر ذوق کو تو اردو کی بہار دکھانی ہے سو انھوں نے دکھادی۔

ٹھہری ہے ان کے آنے کی اب کل پہ جاصلاح
اے جان برلب آمدہ تیری ہے کیا صلاح
رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ
جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح

استادانہ قدرتِ بیان سے مطلع کہا ہے۔ یہ ردیف اور ثقل کا نام نہیں۔ دوسرے شعر میں تو وہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ ایک لمحے کے لیے ذوق کو جذبات کا شاعر ماننا پڑ جاتا ہے۔

بل بے کمر کہ زلفِ مسلسل کے بیچ میں　　کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

شعر کسی اور کا تھا اور ذوق کو بہت پسند تھا لیکن اصلی شعر کا دوسرا مصرعہ بہت الجھا ہوا تھا۔ ذوق نے گنگنا گنگنا کے شعر کے دوسرے مصرعے میں ایک لچک اور ہلکا سا جھٹکا پیدا کر دیا ہے۔

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد　　سینے میں ہو گی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

گر دم کے دم وہ ہم سے ملائم ہوئے تو کیا　　کہہ بیٹھیں گے پھر ایک گھڑی دو گھڑی کے بعد

کل اس سے ہم نے ترک ملاقات کی تو کیا　　پھر اس بغیر کل نہ پڑی دو گھڑی کے بعد

گو دو گھڑی تک اس نے نہ دیکھا ادھر تو کیا　　آخر ہمیں سے آنکھ لڑی دو گھڑی کے بعد

کیا جانے دو گھڑی وہ رہے ذوقؔ کس طرح
پھر تو نہ ٹھہرے پاؤں گھڑی دو گھڑی کے بعد

پھر دیکھیے کہ ردیف اور قافیوں میں کتنی شیفتہ اردویت ہے۔

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر   پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

آزادؔ لکھتے ہیں کہ مومنؔ جب ایک بار ذوقؔ سے ملنے آئے تو ان کی فرمائش پر ذوقؔ نے یہ مطلع سنایا۔ مومن نے ہنس کر کہا کہ اب کوئی کیا کہے گا۔ راستہ بند ہے۔

دل کو رفیقِ عشق میں اپنا سمجھ نہ ذوقؔ   ٹل جائے گا یہ اپنی بلا تجھ پہ ڈال کر

ذوقؔ لکھنؤ اسکول کے شاعر نہیں ہیں مگر دوسرا مصرع اس رنگ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جسے لکھنؤ اسکول نے فروغ دیا۔

گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

یہاں بھی وہی بات کہنے کو جی چاہتا ہے جو اس کے پہلے والے شعر پر میں نے کہی۔ دلی کی اسپرٹ تو غالب کے اس مصرعے میں ہے "ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا"۔

دلِ شوریدہ سر نے خاک اڑا کر   بیاباں رکھ لیا سر پر اٹھا کر

میر کا شعر ہے

دل زاک قطرہ خوں نہیں تھا بیش   ایک عالم کے سر بلا لایا

میرؔ کے ایسے بے لاگ مصرعوں پر ذوقؔ کی نظر انتخاب پڑتی تھی چوں کہ یہ مصرعے زباں میں ہوتے تھے۔ مگر میرؔ کی طرز عنصری چیز ہے۔ جب ذوقؔ یہ رنگ اڑاتے ہیں تو یہ رنگ اڑ جاتا ہے۔

مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے ہے تو آن کے پاس
بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

فنا کی راہ میں پتھر جو بن کے بیٹھے ہیں   انھی کو دیکھ کے ہنستے شرر کو دیکھتے ہیں
بنا کے آئینہ ہیں دیکھتے جو آئینہ گر   ہنر (و) اپنے بھی عیب و ہنر دیکھتے ہیں

عیارِ نقدِ محبت کا دیکھ سختی پر
لگا کے ذوقؔ کسوٹی پہ زر کو دیکھتے ہیں

اسی زمین میں غالبؔ کی غزلیں بھی دیکھیے۔ ذوقؔ کے اشعار ان کی مشق سخن اور قدرت بیان کی اچھی مثالیں ہیں۔ غالب نے اپنی غزل میں ترنم پیدا کر دیا ہے۔ ذوقؔ کی غزل گائی نہیں جا سکتی۔ شعر میں موسیقیت آتی ہے داخلیت سے۔ پھر بھی مضمون آرائیوں سے اور نثریت میں ایک روانی پیدا کر کے ذوقؔ نے اپنے اشعار کو بے لطف ہونے سے بچالیا ہے۔

مے ملا کر ساقیانِ سامری فن آب میں
کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں
پھرتا ہے سیلِ حوادث سے کوئی مردوں کا منہ
شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں

کچھ ناسخؔ کی بلکہ اس سے زیادہ آتشؔ کی یاد ان اشعار سے آتی ہے۔

وہ دن ہے کون سا کہ ستم پر ستم نہیں   گر یہ ستم ہیں روز تو اک روز ہم نہیں
مشکل ہے میرے عہدِ محبت کا ٹوٹنا   اے بیوفا یہ تیری خدا کی قسم نہیں

ہاتھ آئے کس طرح سے دلِ گمشدہ کا کھوج
ہے چور وہ کہ جس پہ کسی کا بھرم نہیں

کیا یہ اشعار داغؔ سے پہلے داغؔ کی یاد نہیں دلا رہے ہیں؟

ہم سے ظاہر و پنہاں جو اس غارت گر کے جھگڑے ہیں
دل سے دل کے جھگڑے ہیں نظروں سے نظر کے جھگڑے ہیں
حضرتِ دل کا دیکھنا عالم۔ ہاتھ اٹھائے دنیا سے
پاؤں پسارے بیٹھے ہیں اور سر پہ سفر کے جھگڑے ہیں

ذوقؔ مرتب کیوں کہ ہو دیواں شکوۂ فرصت کس سے کریں
باندھے گلے میں ہم نے اپنے آپ ظفرؔ کے جھگڑے ہیں

ردیف کہہ رہی ہے کہ ہم اردو غزل کی ردیف ہیں۔ جمہور کی دیسی بولی ٹھولی ایسی ہی ردیفوں میں چمکتی ہے۔ پنجابی زبان کا لطف ایسی زمینوں میں آجاتا ہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کا دیوان بھی ایسی زمینوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس وقت دلی کا عام مذاق یہی تھا نہ کہ وہ مذاق جو غالبؔ و مومنؔ کا مذاق ہے۔[1]

آج ان سے مدعی کچھ مدعا کہنے کو ہیں
پر نہیں معلوم کیا کہویں گے کیا کہنے کو ہیں

غالبؔ اور ذوقؔ سب کے یہاں کہویں گے کا لفظ آجاتا ہے۔ اور اس وقت کی زبان کا لطف مل جاتا ہے۔

کرے وحشت بیاں چشم سخن گو اس کو کہتے ہیں
یہ سچ کہتے ہیں سر چڑھ بولے جادو اس کو کہتے ہیں
سوال بوسہ کو ٹالا جوابِ چین ابرو سے
براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو اس کو کہتے ہیں
گرہ کھولی ذرا اس نے جو اپنی زلف مشکیں سے
معطر ہو گیا آفاق خوشبو اس کو کہتے ہیں

"جھگڑے ہیں" والی غزل پر جو کچھ میں نے کہا ہے وہی بات یہاں بھی ہے۔ غالبؔ تو نہیں لیکن مومنؔ کبھی کبھار بول ٹھٹھول کی ردیف کی طرف جھک آئے ہیں۔ مومنؔ کی غزل "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" کچھ اسی قسم کی ہے۔

قصد جب تیری زیارت کا کبھو کرتے ہیں　　　چشم پر آب سے آئینے وضو کرتے ہیں

---

[1] پروفیسر شیرانی مرحوم نے رذی کے ایک مسودے میں محمد حسین آزادؔ کے ہاتھوں لکھی ہوئی اس غزل کا مسودہ دیکھا میں کئی قافیے آزادؔ نے لکھ رکھے تھے مثلاً زیور ور ر۔ پروفیسر شیرانی اس نتیجہ پر پہنچے کہ ذوقؔ کی اس غزل میں ذوقؔ کے نام سے کچھ اشعار اپنی طرف سے کہہ کے آزادؔ کی غزل میں ملا دینا چاہتے تھے۔ فراقؔ

شاعرانہ تصنع (Cenceit) قابلِ دید ہے۔

تم وہ غضب کہ ہوتے بھی کم ایسے شخص ہیں   اور ہم تمھیں پہ مرتے ہیں ہم ایسے شخص ہیں

داغؔ کی ہلکی جھلک بلکہ قریب قریب پوری جھلک اس مطلعے میں نظر آتی ہے یا نہیں؟

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں   واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

غالبؔ کی بھی غزل اس زمین میں ہے۔ مومنؔ، شیفتہؔ اور دیگر مشاہیر کی بھی۔ ذوقؔ نے بھی اپنی شان قائم رکھی ہے۔

خانقہ میں بھی وہی ہے جو خرابات میں ہے

فرق پر یہ ہے، یہاں منہ پہ ہے اور واں دل میں

یہ بزلہ سنجی یا طنز لیے ہوئے محاورہ، پنچایتی بولی میں خانقاہ والوں کو چھیڑنا ذوقؔ کی وہ خصوصیت ہے جو غالب و مومن سے انہیں الگ کرتی ہے اور جس کی بہت سی اور مثالیں ہم دیکھ چکے ہیں۔

تیرے آفت زدہ جن دشتوں میں اڑ جاتے ہیں

صبر و طاقت کے وہاں پاؤں اکھڑ جاتے ہیں

کیوں نہ لڑوائیں انھیں غیر کہ کرتے ہیں یہی

ہم نشیں جن کے نصیبے کہیں لڑ جاتے ہیں

فارسی قافیہ اس غزل میں آ ہی نہیں سکتا۔ ڑ کا حرف خالص ہندی حرف ہے۔ ان قافیوں سے اردو آسانی سے پہچانی جانے والی اپنی الگ حیثیت قائم کر لیتی ہے۔

مرے نالوں سے چپ میں مرغ خوش الحاں زمانے میں

صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانے میں

کہاوت یا ضرب المثل بے لاگ بندھ گئی ہے۔

مر گئے پر بھی تغافل ہی رہا آنے میں   بے وفا پوچھے ہے کیا دیر ہے لے جانے میں

ایسے اشعار میں عشق سطحی چھیڑ چھاڑ سے آگے نہیں بڑھتا۔ لیکن یہ سطحی چھیڑ چھاڑ بھی ایک سطحی مزہ دے ہی جاتی ہے۔

جس جگہ بیٹھے ہیں بادیدہ نم اٹھے ہیں آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اٹھے ہیں

پورے شعر خصوصاً دوسرے مصرعے کی برجستگی کا کیا کہنا۔ عام عقیدہ کس بے ساختہ پن کے ساتھ شعر میں نظم ہو گیا ہے۔

رخصت جو ہم سے ہو کے جاتے وہ اپنے گھر ہیں
گھبرا کے پہنچے واں ہم ان سے پیشتر ہیں

محاکاتی مطلع ہے۔

رکھ مکدر نہ بس اے چرخ تو اتنا ہم کو ہم نے جانا کہ کیا خاک سے پیدا ہم کو
اور ہمدرد کہاں۔ ہو نہو اے حضرت دل درد اب تم کو ہمارا ہو تمھارا ہم کو
دل میں تھے قطرۂ خوں چند سو ماتند انار نہ رہے وہ بھی جب الفت نے نچوڑا ہم کو

ہم نہ کہتے تھے کہ ذوقؔ اس کی تو زلفوں کو نہ چھیڑ
اب وہ برہم ہے تو ہے تجھ کو قلق یا ہم کو

اسی زمین میں دوسری غزل کے کچھ شعر:

آسماں اور وہ انسان بنانا ہم کو خاک میں تھا مگر اس ڈھب سے ملانا ہم کو
دیکھا آخر نہ کہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو
ہم تبرک ہیں بس اب کر لے زیارت مجنوں سر پہ پھرتا ہے لیے آبلۂ پا ہم کو

اس زمانے کے دلی کے چوٹی کے شاعروں میں اس سج دھج کے ساتھ یہ رنگ سخن ذوقؔ کا اور تنہا ذوقؔ کا تھا۔ یہ رنگ سخن تو عام تھا لیکن اس رواں دواں طور پر اس سج دھج کے ساتھ صرف ذوقؔ اسے نباہتے ہیں۔ ہاں لکھنؤ میں آتشؔ کے خاندان میں زبان کی یہ صفائی اور روانی نظر آتی ہے

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو　　تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو
عمر رواں کا توسنِ چالاک اس لیے　　تجھ کو دیا کہ جلد کرے یاں سے ایڑ تو
اے زاہد دو رنگ نہ پیر آپ کو بنا　　مانند صبح کا ذب ابھی ہے ادھیڑ تو

قافیے میں ڑ کا حرف اردو کی مہر غزل پر لگا دیتا ہے۔ مطلع تو بول چال کی ایک تصویر ہے۔ اسی سے آج تک زبان زدِ خاص و عام ہے۔

موت ہی سے کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو　　غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو
آگ میں جل مرتا ہے پروانہ سا کرم ضعیف　　آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

"ہو تو ہو" کی ردیف بھی اردو بول چال ہی کی مثال ہے۔ ایسی ردیفیں ذوقؔ اور ظفرؔ کے یہاں بکثرت ملتی ہیں۔

دن کٹا جائے کدھر رات کدھر کاٹنے کو　　جب سے وہ گھر میں نہیں دوڑے ہے گھر کاٹنے کو
شام ہی سے دلِ بیتاب کا ہے ذوقؔ یہ حال　　ہے ابھی رات پڑی چار پہر کاٹنے کو

کاٹنے کو کی ردیف میں اردو نمایاں ہے۔ ٹ کا حرف فارسی عربی میں ہے ہی نہیں۔ اشعار کی سلاست اور روانی۔ بول چال اور محاوروں کا لطف یہ سب چیزیں متوجہ کر لیتی ہیں۔

مشتِ خاک اپنی ہم اس کوچے میں کل پھینک آئے
اب وہ ذوقؔ آپ اٹھائے نہ اٹھائے اس کو

یہ زمین بھی صاف اردو کی بوباس دیتی ہے۔ مضمون بھی لطف سے خالی نہیں شعر کی نرم روی اور سبک رفتاری بھی قابل دید ہے۔

صفائیں رخ سے تیرے آئینہ کیا خاک ہمسر ہو　　نگاہ چشم سرمہ آلود سے بھی جو مکدر ہو (کذا)

رچا ہوا مضمون رچے ہوئے شعر میں ادا کیا گیا ہے۔
آسیؔ غازی پوری کی غزل اسی زمین میں دیکھنے کی چیز ہے جس کا مطلع ہے

اگر تم چاہتے ہو دل کو منزل گاہِ دلبر ہو
تو جو ہو غیر، تم ہو یا کہ غیر اس گھر سے باہر ہو

آسی کی اسی غزل کا یہ شعر بھی نہیں بھولتا۔

بہر صورت طلب لازم ہے آبِ زندگانی کی — اگر پایا خضر تم ہو نہ پایا تو سکندر ہو

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو — زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

سمجھ ہے اور تمہاری کہوں میں تم سے کیا — تم اپنے دل میں خدا جانے سن کے کیا سمجھو

نہیں ہے کم زرِ خالص سے زردیٔ رخسار — تم اپنے عشق کو اے ذوق کیمیا سمجھو

مطلع نہایت مشہور ہے۔ دوسرے شعر میں وہ بات آنے لگی ہے جسے داغ کے ہاتھوں فروغ پانا تھا۔ مقطعے میں بھی تمثیلی رنگ کی خیال آرائی خوب ہے۔ مومن کا شعر بھی یاد آگیا۔

زرد رخ دکھلا دیا داغِ جگر دکھلادیا — آج اس کو ہم نے اپنا زور و زر دکھلا دیا

ہاتھ سینے پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو — اک نظر دل سے ادھر دیکھ لو گر دیکھتے ہو

ہے دمِ بازپسیں دیکھ لو گر دیکھتے ہو — آئینہ رکھ کے مرے منہ پہ کدھر دیکھتے ہو

پر پروانہ پڑے ہیں شجر شمع کے گرد — برگ ریزیٔ محبت کا ثمر دیکھتے ہو

پہلے مطلع کے دوسرے مصرعے میں "دیکھ لو گر دیکھتے ہو" بول چال کو لطیف انداز سے باندھنے کی مثال ہے۔ دوسرے مطلع کے پہلے مصرعے میں بھی یہی بات ہے۔ تیسرے شعر کی مضمون آرائی خارجیت کے باوجود لطف دیتی ہے۔

عبث تم اپنی رکاوٹ سے منہ بناتے ہو — وہ آئی لب پہ ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

لگا کے سرمہ تم آنسو نہیں بہاتے ہو — یہ ہم کو جلوۂ عشق القمر دکھاتے ہو

اٹھو گے یار کی ٹھوکر سے لے چلو تشریف — نہیں تو پھر کوئی صلوات سن کے جاتے ہو

سب اشعار سلیس اور رواں دواں ہیں۔ سطحی شوخی بھی موجود ہے تیسرے شعر کا دوسرا مصرع کس قدر برجستہ ہے۔ ذوق ٹھیٹھ اردو کو چمکائے جا رہے ہیں یہی کام سینکڑوں اور شعرا

کے ہاتھوں آگے بڑھنے والا ہے۔

جو ہیں مرتے حسن صفات میں وہ رہیں گے اپنی ہی بات میں
تو فنا ہو ذوقؔ اسی ذات میں کہ جو ذات جملہ صفات ہو

نثریت میں نظمیت کی ہلکی سی چاشنی دے کر باتوں باتوں میں تصوف کا مضمون ادا کر دیا ہے۔

کوسوں کیا تنگیِ زمانے کو کہ نہیں جائے سر اٹھانے کو

تنگیِ زمانہ کی جگہ مطلعے کی ضرورت سے "تنگیِ زمانے" کہنا شاید اس دور میں قابل اعتراض نہ رہا ہو۔

زیادہ ہوتا ہے پیری میں فربہ نفسِ امّارہ   یہ بالوں کی سفیدی شیر ہے اس مار رہزن کا

آتشؔ و ناسخؔ کی یاد آتی ہے۔ تمثیلی انداز میں اخلاقی مضمون باندھا ہے لکھنؤ اسکول سے اس معاملے میں ذوقؔ متعلق معلوم ہوتے ہیں۔

اشکباری مری مژگاں کی ذرا دیکھیں تو   کتنے پانی میں ہیں فوارے بھلا دیکھیں تو

روایتی شاعری۔ محاورہ، روزمرہ سب کا لطف دیکھیے۔

یا تو پاسِ دوستی تجھ کو بت بیباک ہو   یا مجھی کو موت آجائے کہ قصہ پاک ہو

دوسرا مصرع صاف بول چال کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

مرتے ہیں ترے پیار سے ہم اور زیادہ   تو لطف میں کرتا ہے ستم اور زیادہ
وہ دل کو چرا کر جو لگے آنکھ چرانے   یاروں کا گیا ان پہ بھرم اور زیادہ
یارب یہ مری نبض یا موجِ رم برق   کیا ہوگا جو ہوگی تپِ غم اور زیادہ
کیا قہر ہے جتنا ہی وہ چاہت سے رکے ہے   اتنا ہی اسے چاہیں ہیں ہم اور زیادہ
جو کنج قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر   ہے ذوقؔ برابر انہیں کم اور زیادہ

"اور زیادہ" کی تعریف بھی اردو کے مخصوص اندازِ بیان کو رچانے سنوارنے اور نکھارنے کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔ ان اشعار میں نشتریت یا سوز و گداز نہ سہی لیکن ایک ہلکی

سی شعریت ضرور ہے۔ نثر موزوں کا کافی لطف ان اشعار میں ہے۔ ہلکی ہلکی سی کسک بھی ہے۔ مطلع سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ آزاد انصاری شاگرد حالی نے اس مضمون میں درد بھر دیا ہے

احساس قلق بر حق لیکن یہ گذارش ہے	جب رحم کیا ہوگا جینے نہ دیا ہوگا

اپنے لیے ذوق "یاروں" کا لفظ کبھی کبھی لاتے ہیں اور بول چال کا حسن پیدا ہو جاتا ہے جیسے دوسرے شعر میں یا اس مصرعے میں دوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا" اس طرح اب بھی بولتے ہیں مگر غالب اور مومن کے یہاں "یاروں" کا استعمال مجھے یاد نہیں آتا کہ کہیں موجود ہے۔ پانچوں اشعار کس کھلی ڈھلی زبان میں ہیں۔ ان اشعار کو پڑھ کر زبان چٹخارے لیتی ہے۔ اس رنگ میں کہنا بظاہر سہل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لیے بڑی مشق چاہیے اور بہت سلیقہ

ہوش و خرد گئے نگہ سحر فن کے ساتھ	اب جو ہے اپنی بات سو دیوانہ پن کے ساتھ

جنوں کے جیب دری پر ہیں خوب چلتے ہاتھ	سلوک سینہ سے بھی کچھ تو کرلے چلتے ہاتھ

دونوں مطلعوں میں ردیف جس کینڈے سے دوسرے مصرعے میں بندھی ہے وہ ذوق کا حصہ ہے۔ یہ ردیفیں بھی ٹھیٹھ اردو کا ٹھاٹھ دکھاتی ہیں۔ کچھ تو کرلے چلتے ہاتھ" ایسی زبان جس میں نثر موزوں کا لطف ہو ذوق اور ان کے مقلدین ہی کا حصہ ہے۔

رقعہ ہے چوری کا اور بھیجا ہے انجان کے ہاتھ	یا الٰہی کہیں پڑ جاوے نہ دربان کے ہاتھ

ایک بار نامہ و پیام میں ایسی ہی غلطی مجھ سے ہو گئی تھی۔ فراق

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ	ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

میر کا شعر

میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے	جان ہے تو جہان ہے پیارے

کچھ اسی قسم کے الفاظ سے بنا ہے جن سے ذوق کا مطلع۔ لیکن ذوق کا شعر لطف زبان سے آگے نہیں بڑھتا اور میر کے شعر میں تو ماورائی نرمی نے اس شدت کا اثر بھر دیا ہے جسے بیان کرنے کو الفاظ نہیں ملتے۔

ترے کوچے کو وہ بیمار غم دارالشفا سمجھے — اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

ستم کو ہم کرم سمجھے، جفا کو ہم وفا سمجھے — اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوقؔ اس کی — کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

ذوقؔ کے کلام کے وہ تمام صفات جواب تک ہم آپ دیکھتے آئے ہیں ان اشعار میں بھی جھلک رہے ہیں۔ کچھ منچلے چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ مقطع میں درپردہ غالب کی مشکل گوئی پر چوٹ ہے۔

لیتے ہی دل جو عاشقِ دلسوز کا چلے — تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

ذوقؔ کا پنچائتی طرزِ بیان، یہاں معجزہ کی حد تک پہنچ گیا ہے۔

رخصت اے زنداں! جنوں زنجیر در کھڑ کائے ہے

مژدہ خارِ دشت پھر تلوہ مرا کھجلائے ہے

غزل اچھی خاصی ہے لیکن جتنی مشہور ہونی چاہیے اس سے زیادہ مشہور ہے اور اشعار نظر انداز کرتا ہوں۔ مقطع خوب کہا ہے۔ موت اور انتظار دوست؟ لیکن کیا کوئی جواں مرگ بھی اگر مرتے وقت تک ہوش و حواس میں رہے تو دوست کی راہ دیکھے گا؟ شاید ایسا ہونا ممکن ہیں۔ مرض الموت سے بچ کر یہ تو میرا تجربہ ہے کہ ہوش آتے ہی اگر آنکھوں نے کسی کو ڈھونڈھا تو محبوب کو

نزع میں بھی ذوقؔ کو تیرا ہی بس ہے انتظار — جانبِ در دیکھ لے ہے جبکہ ہوش آجائے ہے

ذوقؔ کا ایک مقطع زبانوں پر یوں چڑھا ہوا ہے

اے ذوقؔ کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا — بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

شعر بہت رواں دواں ہے لیکن آزادؔ کے مرتبہ دیوانِ ذوقؔ کا جو نسخہ میرے پاس ہے اس میں یہ شعر یوں ہے۔

اے ذوقؔ رہِ عشق میں ہے خضر و مسیحا — ہمدم جو نکل آئے کوئی گردِ سفر سے

دوسرے مصرعے میں گردِ سفر کے ٹکڑے نے شعر میں ایک تہہ گیری (خواہ وہ خارجی کیوں نہ

سو) پیدا کر دی ہے اور "نکل آئے" کے ٹکڑے نے ایک خوشگوار اچانک پن پیدا کر دیا ہے۔

خوب رو کا شکاتوں سے مجھے تو نے مارا عناتوں سے مجھے
کیا کہوں کہہ رہے ہیں کیا کیا کچھ غیر تیری حماتوں سے مجھے
بات قسمت کی ہے کہ لکھتے ہیں خط وہ کن کن کناتوں سے مجھے
واجب القتل اس نے ٹھہرایا آیتوں سے رواتوں سے مجھے
حال مہر و فا کہوں تو کہیں نہیں شوق ان حکاتوں سے مجھے
سمجھے ہے واجب الرعایت دوست دشمنوں کی رعاتوں سے مجھے
کمی گریہ نے جلایا دل ہوا نقصاں کفاتوں سے مجھے
لے گئی عشق کی ہدایت ذوقؔ اس سرے سب نہاتوں سے مجھے

س ہلکے پھلکے انداز میں پوری غزل کہہ ڈالی ہے۔ مطلع لاجواب ہے بغیر کاوش اور ٹیس کے بھی ہر شعر کی نرم چٹکی لطف دیتی ہے۔ سہل ممتنع کی مثال یہ اشعار نہیں ہیں لیکن اس سہل یانی کی مثال ضرور ہیں جس پر قدرت حاصل کرنا مشکل ہے۔ پوری غزل میں کیا سلاست ہے کیا روانی۔ پانچویں شعر میں "حال مہر ووفا" کا ٹکڑا مثنوی مہر ووفا کی طرف دھیان لے جاتا ہے جو فارسی کی ایک عمدہ مثنوی ہے اور ان دنوں ہندوستان میں کافی رائج تھی۔ مقطعے میں "نہاتوں" کا قافیہ استادانہ ہے۔ ایسے ہی اشعار کی سہل بیانی ذوقؔ کے ہاتھوں اور چمک جانے والی ہے

ستر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے
ہوئے ہیں اس اپنی سادگی سے ہم آشنا جنگ و آشتی سے
اگر نہ ہو یہ تو پھر کسی سے نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے

ذوقؔ کے فلسفیانہ اشعار میں وہ تہیں وہ رمزیت وہ تحیر کے عناصر نہیں جو غالبؔ و میرؔ، خصوصاً میرؔ کے فلسفیانہ اشعار میں ہیں۔ لیکن فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین کو صریحی اندازِ بیاں کے

ساتھ ذوق نہایت حسن و خوبی سے اور کافی شد و مد سے بیان کر جاتے ہیں۔ پنچایتی اقتاد طبع استادانہ قدرتِ بیان سے مل کر ذوق کو اس کا موقع دیتی ہے کہ بلند خیالات اور گہرے حقائق کو وہ قبولِ عام و پسندِ عام کے مطابق ظاہری محاسنِ شاعری سے سجا کر نظم کر دیں۔ ذوق کو خیالات کے عامِ فہم بنانے اور ان کی اشاعت کرنے کا خاص ملکہ ہے۔ کسی کا قول ہے کہ ذوق کے درسی و اخلاقی اشعار کو ترتیب دیا جائے تو اخلاقی کلیوں کا ایک سسٹم مرتب ہو سکتا ہے۔

دیکھو اس چشم مست کی شوخی　　جب کسی پار سا سے لڑتی ہے

اور اس شعر کی شوخی بھی دیکھو۔ پھر انھی دبی چنگاریوں کا داغؔ کے دامن کی ہوا سے بھڑک اٹھنا بھی کلامِ داغؔ میں دیکھو

ہے تیرے کان زلف معنبر لگی ہوئی　　رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

منہ سے لگا ہوا ہے اگر جامِ مے تو کیا　　ہے دل سے یادِ ساقی کوثر لگی ہوئی

اے ذوقؔ اتنا دختر رز کو نہ منہ لگا　　چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اردو ردیف کے پہلو محاوروں اور روز مرہ کے برجستہ استعمال سے چمکائے گئے ہیں۔ غالبؔ کے بزلہ سنجی اور شوخی میں خیال کی چٹکیاں ہوتی ہیں اندر سے داخلی طور پر گدگدی پیدا ہوتی ہے۔ ذوقؔ کے یہاں صرف بول چال کی چٹکیاں ہوتی ہیں، زبانی چھیڑ چھاڑ میں جو محاورے یا زبان کے ٹکڑے لائے جاتے ہیں۔ ان کا برمحل استعمال ہوتا ہے۔ ردیف اور قافیے اس باب میں خصوصاً ان کے لیے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ایک سطحی گدگدی پیدا ہو جاتی ہے اور ایک سطحی فرحت۔ لال قلعہ کی زندگی اب اسی بھر کے رہ گئی تھی یعنی باتوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

مجھ سے کچھ پوچھو نہ خوں نابہ حسرت کے مزے　　زہر کے گھونٹ ہیں پر رکھتے ہیں شربت کے مزے

تجھ کو کچھ یاد بھی ہیں پہلی محبت کے مزے　　بے مزہ ہونے کے لطف اور شکایت کے مزے

بے محبت نہیں اے ذوقؔ شکایت کے مزے

بے شکایت نہیں اے ذوقؔ محبت کے مزے

بات، بات اور کچھ نہیں، انفرادی جذبات و محسوسات لاپتہ مگر بات میں وہ روانی کہ ایک بار تو سن لینا ہی پڑتا ہے۔ پنچایتی خیالات بھی خوش سلیقگی سے سب سے کہاں ادا ہوتے

ہیں۔

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے
گئے جنت میں اگر سوزِ محبت والے تو یہ جانور ہے دوزخ ہی میں جنت والے
ساقیا ہوں جو صبوحی کی نہ عادت والے صبح محشر کو بھی اٹھیں نہ تری متوالے
رہے جوں شیشۂ ساعت وہ مکدر دونوں کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے
کس مرض کی ہیں دوا یہ لب جاں بخش ترے جاں بلب ہیں ترے آزارِ محبت والے
حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ وسعت تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے
نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے
بے نصیبوں کے نصیبوں میں کہاں یار کا وصل ان کی قسمت میں ہے جو لوگ ہیں قسمت والے
تو مرے حال سے غافل ہے پر اے غفلت کیش ترے اندازِ تغافل نہیں غفلت والے

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوقؔ
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز نزاکت والے

شعر ڈھلتے چلتے گئے ہیں۔ ہر شعر صفائی اور مشاقی کی مثال ہے۔ یہاں ضرب المثل باندھی نہیں گئی ہے لیکن کئی اشعار خود ضرب المثل بن گئے ہیں۔ ذوقؔ کو اور چاہیے کیا؟

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے
اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے
یقیں ہے صبح قیامت کو بھی صبوحی کش اٹھیں گے خواب سے ساقی سبو سبو کرتے
چمن بھی دیکھتے گلزارِ آرزو کی بہار تمھاری یادِ بہاری میں آرزو کرتے
سراغ عمر گذشتہ کا لیجیے گر ذوقؔ تمام عمر گذر جائے جستجو کرتے

اپنے رنگ میں روایتی خیالات باندھتے باندھتے مقطعے کی ردیف میں ذوقؔ نے ایک لہک پید

کر ہی دی اور نئے انداز سے ردیف لے ہی آئے۔ روحِ شاعری کے شاید یہ انداز منافی ہے لیکن لطفِ زبان سے کون انکار کر سکتا ہے۔ داغؔ اور آتشؔ تو کبھی کبھی ردیف اور قافیے کے پہلو بدل کر شعریت بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ مصحفیؔ کے بھی کئی اشعار میں جو مصحفیؔ والے مضمون میں درج ہیں یہ بات ملے گی۔ وہ بھی ردیف کو محاوروں کے ساتھ بسا اوقات ملا دیتے ہیں۔

اس سنگِ آستاں پہ جبینِ نیاز ہے ۔۔۔ وہ اپنی جا نماز ہے اور یہ نماز ہے
ناساز ہم سے جو ہے اسی سے یہ ساز ہے ۔۔۔ کیا خوب دل ہے واہ ہمیں جس پہ ناز ہے
پہنچا ہے شب کمند لگا کر کہاں رقیب ۔۔۔ سچ ہے حرامزادے کی رسی دراز ہے
اس بت پہ گر خدا بھی ہو عاشق تو آئے رشک ۔۔۔ ہر چند جانتا ہوں کہ وہ پاک باز ہے

اے ذوقؔ کیوں نہ سب پہ کھلے تیرا رازِ عشق
جو نالہ ہے کلیدِ درِ گنجِ راز ہے

تیسرے اور چوتھے شعر کے دوسرے مصرعوں کی داد دیجیے۔ یہ طرح یہ انداز غالبؔ و مومنؔ کا کاہے کو ہونے لگا۔ مگر ذوقؔ کے اسلوب سے ہم آہنگ ہونے پر مزہ دے ہی جاتا ہے۔

سنا کرتے تھے شہرہ ذوقؔ جن کی پارسائی کا ۔۔۔ وہ سب یار خرابات اپنے نکلے ہم نشیں نکلے

"اپنے نکلے، ہم نشیں نکلے" کیا ٹکڑے ہیں۔

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے ۔۔۔ ہنستے تو ہیں پر تری ہنسی کو نہیں پاتے
ہم تم سا عدو اپنا کسی کو نہیں پاتے ۔۔۔ تم ہم کو جو پاؤ تو چھری کو نہیں پاتے
وہ کون سی شے ہے جسے پاتے نہیں دل میں ۔۔۔ لیکن پاتے تو خوشی کو نہیں پاتے
میں ایسا ہوا گم کہ عزیزانِ عدم بھی ۔۔۔ گم ہو کے مری گم شدگی کو نہیں پاتے
رکھتے ہیں دم شعلہ فشاں اژدرِ دوزخ ۔۔۔ لیکن مری آتش نفسی کو نہیں پاتے

یہاں بھی اشعار کے عام لب و لہجے ہیں لیکن خصوصاً ردیف، قافیہ میں اردو زبان کا چہرہ نکھرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ذوقؔ کے ہاتھ عروسِ اردو کے چہرے پر گویا غازہ مل رہے ہیں۔ دلی

میں ہر خاص و عام اپنی بولی کا نکھار دیکھ کر لہک لہک اٹھا ہوگا۔ چوتھے شعر کے دوسرے مصرعے میں "نہیں پاتے" کے ٹکڑے میں زبان نے پہلو بدل دیا اور محاورہ روزمرہ کا مزہ شعر میں پیدا ہو گیا۔

خط بڑھا کاکل بڑھی زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے　　حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے دل
اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

مغل دربار میں باریابی اور رسوخ کے لیے جو باہمی چشمک ہندو مسلمانوں میں ہوتی چلی آئی تھی اس کی یاد مطلعے کا دوسرا مصرع دلا رہا ہے۔ دوسرے شعر میں "رکتا ہے دل" کتنا اچھا فقرہ ہے۔ رکنا اور کاؤ وہ الفاظ ہیں جنھیں ذوق خاص حسن سے صرف کرتے ہیں۔ "کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے" کے فقرے میں ٹھیٹھ اردو کا لطف دیکھیے عام بول چال کو شعر میں یوں کھپا دینا ہی ذوق کے کلام کی استادانہ شان و سند ہے۔

ثبات کب ہے زمانے کے عزوشاں کے لیے　　کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لیے [۱]
فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لیے　　کہ یہ چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لیے
ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کے لیے　　ستم شریک ہوا کون آسماں کے لیے
صبا ہے آئی خس و خار گلستاں کے لیے　　قفس میں لوٹ رہا ہے دل آستاں کے لیے
دکان حسن میں رکھتے نہیں متاع وفا　　وگرنہ لیتے ہم اک اپنے مہرباں کے لیے
نہ دنیا ہاتھ سے تم راستی کہ عالم میں　　عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لیے
نگاہ ناز نے دیکھے تھے جوہر آج اپنے　　دل اپنا ہم کو بھی یاد آیا امتحاں کے لیے
مزاج ان کا نہ بجلی ہے اور نہ ہے سیماب　　خطر جو ہے تو یہی ہے مزاج داں کے لیے
چلیں گے دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم　　شکستِ توبہ لیے ارمغاں مغاں کے لیے
اشارہ چشم کا تیری یکایک اے قاتل　　ہوا بہانہ مری مرگِ ناگہاں کے لیے

۱؎ پہلا مصرع اس مطلعے کا یوں بھی دیکھا ہے　نہیں ثبات بلندی عزوشاں کے لیے۔

بنایا ذوقؔ جو انساں کو اس نے جزوِ ضعیف
تو اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لیے

غالبؔ اور مومنؔ دونوں کی غزلیں اس زمین میں مشہور ہیں۔ ذوقؔ نے بھی سو فیصدی اپنی شان قائم رکھی ہے۔

جو دل قمار خانے میں بت سے لگا چکے — وہ کعبتیں چھوڑ کے کعبہ کو جاچکے
زہراب یاشراب یہاں سب ہے نوشِ جاں — ساقی پیالہ منہ سے ہم اب تو لگا چکے
یاد آیاں کے آنے کا وعدہ بھی خوب انھیں — جب رات کو وہ پاؤں میں مہندی لگا چکے
مدت سے موت وزیست پڑے ہیں گلے کا ہار — تیغِ نگہ تری کہیں قصہ چکا چکے
تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی — ہم تو تمھاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے

مسجد میں بیٹھے کیا ہو چلو میکدے کو ذوقؔ
اٹھو کہیں وظیفہ بہت بڑ بڑا چکے

شب بام ایک خواجہ سرا قلعہ دلّی میں بہت بار سوخ ہو گیا تھا، بے علم بے لیاقت، بیہودہ، عید سیاہ، موقوفی، بحالی سب اس خواجہ سرا کی زبان پر تھی۔ دھاوتی جواری بھی تھا۔ شرفاء امراخاص وعام سب اس سے تنگ آگئے تھے۔ ایک باراس نے مشہور کر دیا کہ وہ حج کو جانے والا ہے کیوں کہ بادشاہ بھی اس سے ناراض ہو گئے تھے ذوقؔ نے مطلع میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کمبخت کو نہ آنا تھا نہ جانا تھا محض باتیں تھیں۔ غزل کے ہر شعر میں ذوقؔ کے کلام کی شان، سلاست، روانی، اردو پن، سب نمایاں ہیں۔

جیکے چپکے غم کا کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
جی ہی جی میں تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
... کیا آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
برق کیا ہے تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
جب کہا مرتا ہوں وہ بولے میرا سر کاٹ کر

جھوٹ کو سچ کر دکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ہم نے پہلے ہی کہا تھا تو کرے گا ہم کو قتل
تیوروں کا تاڑ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

کیا ہوا اے ذوقؔ ہیں جو مردمک ہم روسیاہ
لیکن آنکھوں میں سمانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ابھی میں لڑکا ہی تھا کہ ایک دن اس غزل کا تیسرا شعر مجھے میرے پھوپھی زاد بھائی راج کشور لال سحر نے سنایا۔ مجھے بڑا برا لگا۔ اس ہلکے پھلکے طریقے سے قتل کرنے کا تصور شعر کی بذلہ سنجی سمیت مجھے خوشگوار نہیں معلوم ہوا۔ شعر کی اور شعر میں جس کام کی طرف اشارہ ہے اس کی برجستگی کا احساس مجھے اس وقت بھی ہوا تھا لیکن برجستگی بیان کا یہ استعمال غلط اور بے موقع اور نامناسب معلوم ہوا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اب تو اسے مدتیں گزر گئیں۔ اس غزل کو اب دیکھتا ہوں تو اس کی حسین سطحیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ شاعری بنی ہو یا بگڑی ہو اس غزل میں ذوقؔ کے عام کلام کی طرح زبان تو بن ٹھن گئی ہی ہے۔

جو کچھ کہ ہے دنیا میں وہ انساں کے لیے ہے — آراستہ یہ گھر اسی مہماں کے لیے ہے
بیٹھا ہے سخنور جو گرفتار تفکر — زیبا یہ قفس مرغ خوش الحاں کے لیے ہے
لبوں سے منہ ملاتے ہیں سب لبوں کے دشمن — ہر نے میں بھری آگ نیستاں کے لیے
دل بھی ہے مرا جان تری مشق ستم کی — جو تیر سے ہے اس تودۂ طوفاں کے لیے ہے
دل قید تعلق سے نکل سکتا نہیں ذوقؔ — کیا در نہیں اس خانۂ زنداں کے لیے ہے

اخلاقی فلسفیانہ مضامین کس ہلکے پھلکے اور بے لاگ طریقے سے ذوقؔ ان اشعار میں باندھ گئے ہیں۔ دماغ کو یہ اشعار سن کر اور سمجھ کر ایک ہلکا سا انبساط ملتا ہے۔

پڑے تفرقے یہ جدائی سے تیری — کہ میں ہوں کہیں دل کہیں جاں کہیں ہے

دوسرے مصرعے کی روانی و سلاست مسلّم ہے۔ شعر اچھا ہے اور بہت صاف ہے۔ لیکن یہ میرؔ کے اس کمبخت مطلع کو اسی وقت یاد آنا تھا۔

کیا میں بھی پریشانیِ خاطر سے قریں تھا
آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غم دیدہ کہیں تھا

میر بڑے بڑوں کے شعر خراب کر دیتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ میر کے کسی اچھے شعر کی پرچھائیں کسی کے اچھے شعر پر پڑ جائے۔

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات   ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

اب تک یہ شعر زبانوں پر ہے۔ مگر نہ جانیں کیوں جب جب یہ شعر میں نے سنایا یاد کیا غالب کا یہ شعر بھی یاد آ گیا اور ذوق کے شعر کا مزہ کم ہو گیا۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اگرچہ ذوق کچھ کہہ رہے ہیں اور غالب کچھ اور۔

کافرِ عشق ہوں گر سر بھی جدا ہو تن سے   نکلے زنار محبت نہ مری گردن سے
میں گرانبارِ محبت مراخوں بھی ہے گراں   جی دھڑکتا ہے تری نازکیِ گردن سے
چشمِ میگوں و صراحی بہ بغل جام بکف   دیکھنا آج وہ گل آتا ہے کس جوبن سے

سجے سجائے، رچے رچائے اشعار ہیں۔ تیسرا شعر حافظ کی یاد دلاتا ہے۔

فلک تو میڑھ ہی کی صبح سے تا شام چلتا ہے   مگر سیدھی نظر سے تیرا اپنا کام چلتا ہے

"میڑھ ہی کی چلنا" میں زبان کی اٹھلاہٹ اور اچپلاہٹ دیکھیے (داغ کے یہاں بھی ٹیڑھ کا لفظ آیا ہے اور خوب آیا ہے

بھری ہیں کیا ادائیں اس شوخِ سیم تن میں
اک ٹیڑھ سادگی میں اک سیدھ بانکپن میں

پھولا نہیں سماتا جو گل پیرہن میں ہے   آتا یہ کس بھروسے پہ ہنستا چمن میں ہے

رنگیں ہے آج کل کے گل نو بہار سے　　اگلا جو برگ زرد کوئی اس چمن میں ہے

وہ دل کہ لا نہ سکتا تھا چینِ جبیں کی تاب　　زیرِ شکنجہ زلفِ شکن در شکن میں ہے

مطلع تو خیر یونہی سا ہے۔ لیکن اگلے وقتوں کی دلی کی شان جس تیور سے دوسرے شعر میں ذوقؔ نے بیان کی ہے وہ دیکھنے کی چیز ہے۔ تیسرے شعر میں بھی عشقیہ مضمون استادانہ شان سے رچے ہوئے انداز میں بندھا ہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے　　مر گئے پر نہ لگا جی تو کدھر جائیں گے

کہا جاتا ہے کہ ذوقؔ کے اس شعر پر غالبؔ سر دھنتے تھے۔ دوسرا مصرع یوں بھی مشہور ہے "مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے" غالب دوسرا مصرع کہتے تو یونہی کہتے کیوں کہ اس طرح بندش چست ہو جاتی ہے۔ لیکن "مر گئے پر" اور "نہ لگا جی" ان ٹکڑوں میں اردو زبان کی ایک مخصوص شان ہے۔ ذوقؔ نے یونہی کہا ہوگا جیسا یہ شعر اوپر درج ہے اور جیسا دیوان ذوقؔ مرتبہ آزاد میں بھی ہے۔ ذوقؔ کا یہ مطلع ایسا ہے جو کسی زبان کی شاعری میں بھی بڑے سے بڑا شاعر ہی کہہ سکتا تھا۔ اور یوں تو معلوم ہوتا ہے کہ شعر نہیں کہا ہے محض ایک بات کہی ہے۔ شیکسپیر کے مشہور المیہ ہملیٹ میں اسی قسم کا خیال ظاہر کرتے ہوئے ہملیٹ نے اپنے کو خودکشی سے روکا ہے۔ "موت کی نیند میں نہ جانے کیسے خواب دکھائی دیں، یہ سوچ کر ہم خودکشی کرتے کرتے رک جاتے ہیں"۔

کوئی ان تنگ دہانوں سے محبت نہ کرے　　اور یہ تنگ کریں منہ تو شکایت نہ کرے

بن جلے شمع کے پروانہ نہیں جل سکتا　　کیا کرے عشق اگر حسن ہی سبقت نہ کرے

"تنگ کریں منہ" یعنی منہ بنائیں یا ترش رو ہوں۔ رواں دواں مطلع ہے دوسرے شعر پر فارسی کا مصرع "عشق اول در دِل معشوق پیدا می شود" اور آزاد کا شعر یاد آتا ہے۔

حسن اور عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ ادھر سے ہوتی ہے

شمع کا شعلہ جب لہرایا اڑ کے چلا پروانہ بھی

لیکن جس خاموش انداز سے ذوقؔ نے "کیا کرے عشق اگر حسن ہی سبقت نہ کرے" کہا ہے (خاص کر "سبقت نہ کرے" کا فقرہ) وہ حسرت موہانی کی معجز نما سہل بیانی کی یاد دلاتا ہے۔ شعر خوب ہے۔

کہتے ہیں جھوٹ سب کہ نہیں پاؤں جھوٹ کے　　جھوٹے تو بیٹھتے بھی نہیں پاؤں ٹوٹ کے
کیوں کر حباب ہو سکے دریائے بیکراں　　دریا سے جب تلک نہ ملے پھوٹ پھوٹ کے

ٹوٹی پھوٹی زمین کو ہموار کر دیا ہے مصحفی کی یاد آتی ہے

زباں کھولیں گے مجھ پر بدزباں کیا بد شعاری سے
کہ میں نے خاک بھر دی ان کے منہ میں خاکساری سے
نہیں آتا نہ آئے رحم اے ذوقؔ اس ستمگر کو
بلا سے خوش تو ہو جاتا ہے میری آہ وزاری سے

معمولی اشعار ہیں لیکن بہت صاف

یار ہنسنے حال پر ہم دل فگاروں کے لگے　　کاش کے ایسے ہی یارب دل کو یاروں کے لگے

"ایسے ہی یارب دل کو یاروں کے لگے" بہت خوب۔ آمین

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی　　چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

غالبؔ تو یہ شعر کہتے ہی نہیں۔ مومنؔ ممکن ہے کہہ جاتے۔ لیکن یہ طرز ذوقؔ ہی کا ہے۔ عام طرز گفتگو سانچے میں ڈھل گئی ہے دوسرے مصرع میں۔

نیچے جس غزل کے کچھ اشعار دیے جاتے ہیں۔ اس غزل پر آزاد کا یہ مختصر نوٹ کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ غزل "ابتدائی مشق کی ہے۔ ردیف کو دیکھو۔ عہدِ مذکور کا محاورہ سناتی ہے"۔

ملنا ہمارا ان کا تو کب جائے جائے ہے　　البتہ آدمی سو کبھو آئے جائے ہے
جو اس گلی میں مثل صبا آئے جائے ہے　　فردوس میں کب اس کو تمنائے جائے ہے
لکھوا کے بھیج دیتا ہے اک پرچہ گاہ گاہ　　دل کو ذرا مرے پر چائے جائے ہے
فوارے سے بجا ہے تو اضع کا سیکھنا　　اس سر کشی پہ سر کو وہ نہوڑائے جائے ہے

سو کوس کیا نہ جاسکے مجنوں تو دو قدم — پر شوق مدعا ہے کہ دوڑائے جائے ہے

کچھ نہیں چاہیے تجہیز کا اسباب مجھے — عشق نے کشتہ کیا صورتِ سیماب مجھے

اس نے مارا رخِ روشن کی دکھا تاب مجھے — چاہیے میرے لیے چادر مہتاب مجھے

سفر عمر ہے یا رب کہ ہے طوفانِ بلا — ہر قدم سیل حوادث کا ہے گرداب مجھے

ہو گیا جلوۂ انجم مری آنکھوں میں نمک — کیوں کہ آئے شبِ ہجراں میں کہو خواب مجھے

مضمون آرائی ذوقؔ کے مطلع کی قابل تعریف ہے لیکن آتشؔ کا مطلع ذوق کے مطلعے کو مٹا کر رکھ دیتا ہے۔

موت مانگوں تو ملے آرزوے خواب مجھے — ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

ذوقؔ کے پتلے اور سطحی رنگ کی یہ غزل بری مثال نہیں ہے۔ کچھ لکھنؤ کا رنگ بھی اس غزل میں جھلک رہا ہے۔ یعنی لفظی تناسب، ایہام، تمثیلی انداز بیان وغیرہ "ہو گیا جلوۂ انجم مری آنکھوں میں نمک"۔ خوب!

لائی حیات، آئے قضا، لے چلی چلے — اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

کم ہوں گے اس بساط پہ ہم ایسے بدقمار — جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے

ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ — ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو وہ ہی ہو — دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ — تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوقؔ
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

زندگی اور موت پر سامنے کی بات کس بے لاگ طریقے سے کہہ گئے ہیں مطلعے کے بعد جتنے اشعار ہیں ان میں قافیہ اور ردیف دونوں کو نئے نئے پہلوؤں سے باندھا ہے۔

لیا ایمان و دیں تو نے اگرچہ اک زمانے سے
نہیں اس پر بھی اے ظالم ترا ایماں ٹھکانے سے
ستم گر تو نے روکا سب کو میرے پاس آنے سے
اجل بھی اب یہاں آئے تو آئے کس بہانے سے
نہ کیجیے خوانِ دوں ہمت پہ ہاتھ اے ذوقؔ آلودہ
کہ یہ کھانا مرے آگے ہے بہتر زہر کھانے سے

ردیف اور قافیہ سے ہر شعر میں کھیل رہے ہیں اور ہنسی کھیل میں کچھ باتیں کہہ گئے ہیں

اگر ہوتے ہو تم برہم ابھی سے — تو پھر ہوتے ہیں رخصت ہم ابھی سے
لگے کیوں تم پہ مرنے ہم ابھی سے — لگایا جی کو اپنے غم ابھی سے
موا جاتا مجھے غیروں نے اے ذوقؔ — کہ پھرتے ہیں خوش و خرم ابھی سے

یہاں بھی ردیف اور قافیے شعر کہلوا رہے ہیں۔ نرم آہنگ، نثریت سبک رو فقرے، رسمی طنز، موزونیِ طبع کے نمونے یہ اشعار بھی ہیں۔ اردوئے محض یا ٹھیٹھ اردو کی ایسی مثالیں پیش کرنے کی طرف غالب و مومن مائل ہی نہیں ہوتے۔

خدا کی خدائی اگر آگے آئے — یہ کافر کسی کو نہ موجود سمجھے

آتے ہی تو نے گھر کے پھر جانے کی سنائی — رہ جاؤں سن نہ کیوں کر یہ تو بری سنائی
جس بات پر تمھاری سب غش ہیں ہم سے پوچھو — ہم کہویں آنکھوں دیکھی وہ سب سنی سنائی
کہنے نہ پائے اس سے ساری حقیقت اک دن
آدھی کبھی سنائی، آدھی کبھی سنائی

اردو، محض اردو، ٹھیٹھ اردو۔ شعریت نہ ہو نہ سہی۔

اک صدمہ دردِ دل سے مری جان پر تو ہے
لیکن بلا سے یار کے زانو پہ سر تو ہے

میرؔ کا شعر ہے جس کا میرؔ کے نشتروں میں شمار نہیں ہے لیکن ذوقؔ کے بزلہ سنجانہ مطلع کے مقابلے میں میر کا شعر تاثیر ترنم اور سوز و گداز کی تصویر ہے

مرا سر نزع میں زانو پہ رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
کہ اے بیمار میرے تجھ پہ جلد آساں ہو مر جانا

خدا نے میرے دیا سینہ لالہ زار مجھے — بتو نہ بن کے نظر آؤ تم بہار مجھے
نظر جو لطف کی ہے روزِ وصل پر موقوف — تو کرنا کیا تھا نظر بندِ انتظار مجھے
ہوائے وادیٔ وحشت مجھے موافق تھی — دکھا رہے ہیں چمن کی یہ کیا بہار مجھے

ذوقؔ کا مطلع دیکھ کر غالبؔ کا یہ شعر دیکھیے:

فراقِ یار میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

دوسرے شعر میں "نظر بند انتظار" اچھی ترکیب ہے۔ تیسرا شعر سلاوست روانی کا نمونہ ہے۔

مرضِ عشق جسے ہو اسے کیا یاد رہے — نہ دوا یاد رہے اور نہ دعا یاد رہے
تم جسے یاد کرو پھر اسے کیا یاد رہے — نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے
قتلِ عاشق پہ کمر باندھی ہے اے دل اس نے — پر خدا ہے کہ اسے نام مرا یاد رہے
جب یہ دیندار ہیں دنیا کی نمازیں پڑھتے — کاش اس وقت انہیں نام خدا یاد رہے
ہم پہ سو بار جفا ہو تو رکھو ایک نہ یاد — بھول کر بھی کبھی ہووے تو وفا یاد رہے

حالیؔ کا مطلع ہے

جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے — آج دل لے گا اگر کل نہ لیا یاد رہے

ذوقؔ کی یہ غزل ان کے مخصوص رنگ میں بہت کامیاب ہے۔ زمین بھی ایسی ہے کہ بندش میں ڈھیلا پن یا سستی نہیں آنے پائی۔ خوب رواں دواں شعر کہے ہیں۔ آخری شعر میں کتنی سچی شکایت ہے

تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر میں کیا ہے   کچھ یہ بھی خبر ہے تری تقدیر میں کیا ہے
پارہ کی جگہ کشتہ اگر ہو دل بیتاب   پھر آپ ہی اکسیر ہے اکسیر میں کیا ہے
یہ غنچۂ تصویر کھلا ہے نہ کھلے گا   کیا جانے دلِ عاشق دلگیر میں کیا ہے
زاہد کی طرف دیکھو نہ تم میرے دم ذبح   لو نام تم اللہ کا تکبیر میں کیا ہے

کیا ہے کی ردیف کی کروٹیں ہر شعر میں دیکھتے جائیے۔

وہ جب واں بے تکلف رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے
صبا کے جھونکے یاں وقت سحرا ایسے نہ ہوتے تھے

آج کتنے غزل گو ایسا مطلع کہہ سکتے ہیں؟ معشوق "واں" رات بھر بے تکلف رہا ہے (پہلے مصرعے میں "بے تکلف رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے" کسے پرکیف ٹکڑے پر غور کرو) بے تکلف معشوق کے عریاں اور معطر بدن کو اس کے کھل کھیل کی اداؤں کو اس کی رنگینی معصومی ہم آہنگی و سپردگی اس کی کھلتی ہوئی اور نکھرتی ہوئی محبوبیت کو چھوتی ہوئی ان سب میں رس بس کر بادِ صبا کے جھوکے آج چل رہے ہیں۔ ہوا کے جھوکوں میں کچھ دیکھ کر شاعر سمجھ جاتا ہے کہ وہاں وہ رات بھر "بے تکلف" ہوتے رہے ہیں۔ کتنا لطیف احساس ہے اور کتنا پرکیف! معشوق غیر کے یہاں رات بھر بے تکلف ہوتا رہا ہے اس سے جو جذبۂ رشک و رقابت پیدا ہوا اسے شاعر نے کتنا پر اثر، کتنا پاکیزہ، کتنا پرسوز و ساز بنا دیا ہے اور کتنا مترنم۔ "ایسے" کا لفظ مصرعوں میں کتنی نرم لچک پیدا کر رہا ہے۔ ذوقؔ نے اس شعر میں نظیریؔ کے فن تغزل کا راز قریب قریب پالیا ہے۔

جب ترا شعلۂ رخسار نظر آتا ہے   سردِ خورشید کا بازار نظر آتا ہے
جتنا بے ہوش ہو اتنا ہی سوا ہو آرام   مست ہاتھی ہو تو بے بار نظر آتا ہے
دیکھ کر اے بتِ مغرور یہ اندازِ ستم   شرم سے چرخ نگوں سار نظر آتا ہے

دل نے ہے دیکھ لیا دفترِ تقدیر تمام فلک اک نقطہ بیکار نظر آتا ہے

مطلع پر آتشؔ کی شعلہ بیانی کی کچھ پرچھائیں پڑ رہی ہے۔ دوسرے شعر کا مصرع ثانی ذوقؔ ہی کے ایک قصیدے کے مشہور مصرعے کی یاد دلاتا ہے "کہ جیسے جائے کوئی پیل مست بے زنجیر" مگر "مست ہاتھی ہو تو بے بار نظر آتا ہے" کا مصرع بھی ایک سماں کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ اور اشعار بھی استادانہ شان سے کہے گئے ہیں۔

بزم میں ذکر مرا لب پہ وہ لائے تو سہی وہیں معلوم کروں ہونٹھ ہلائے تو سہی

دیکھیے اردو کی بولی ٹھولی۔ غالبؔ اور مومنؔ اس انداز سے بچتے ہیں لیکن آتشؔ نے زبان کے اسی تیور سے چنگاریاں اڑا دی ہیں۔

سب کو دنیا کی ہوس خوار لیے پھرتی ہے کون پھرتا ہے یہ مردار لیے پھرتی ہے

اس زمین میں آتشؔ کی غزل بھی ہے اور آثرؔ شاگردِ آتشؔ کا یہ مشہور مطلع بھی ہے

حسن کی جنس خریدار لیے پھرتی ہے ساتھ بازار کا بازار لیے پھرتی ہے

کون وقت اے وائے گذرا جی کو گھبراتے ہوئے

موت آئی ہے اجل کو یہاں تلک آتے ہوئے

داغؔ کا مصرع ہے

اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے

ساتھ تیرے ہم بھی جوں سایہ مقرر جائیں گے

آگے جائیں پیچھے جائیں، جائیں گے پر جائیں گے

اردو کی بولی ٹھولی اول کے ساتھ زبان کا بھی مچلنا دیکھیے

جو دل نہ کشمکش طرۂ دوتا میں پڑے تو پھر بلا کو غرض ہے کوئی بلا میں پڑے

"کشمکش طرۂ دوتا" استادانہ ترکیب ہے اور دوسرا مصرع داغؔ کی یاد داغ سے پہلے دلا رہا ہے۔

مقابل اس رخ روشن کے شمع گر ہو جائے　　صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

خاندانِ دبیر کے شاعر اوجؔ نے غالباً اس شعر کا جواب کہنے کی کوشش کی تھی۔ آزادؔ کو سنا یا۔ آزاد نے اوج کے شعر پر تعریف کے پردے میں اعتراض کر دیا۔ اوج نے کہا۔ "بھئی شاگرد تھے ہماری بات ہی بگاڑ دی۔"[1]

ہم ہیں غلام ان کے جو ہیں وفا کے بندے　　اس کو یقین کرنا گر ہو خدا کے بندے

ذوقؔ کا مطلع خاص کر دوسرا مصرعہ کلامِ داغؔ کے تیور کی تخلیق کر رہا ہے۔

ہم بتوں کو اپنے جذب دل سے کھینچے جائیں گے
پر بڑے پتھر ہیں یہ مشکل سے کھینچے جائیں گے

استادانہ مطلع ہے۔ میرؔ بھی کبھی کبھار ایسے ٹھٹھول کر جاتے ہیں

بوسۂ یار لے کے منہ موڑا　　بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑا

کام لیجیے گا اور ہی دانائی سے　　ناصحو جاؤ نہ لپٹو کسی سودائی سے

شعر پڑھیے اور داغ کی یاد کیجیے

کون سے دن نگہِ تیز نہ خونریز رہی　　مجھ پہ ظالم تری ہر روز چھری تیز رہی

پھر داغؔ کی یاد کیجیے۔

جو دل سے اپنے دل آتشیں نکل جائے　　فلک کے پاؤں تلے سے زمیں نکل جائے

زبان بھی خوب ہے اور شعر بھی بہت خوب ہے۔

پلائے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری
خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

اس مطلع میں ذوقؔ اپنے مکمل رنگ میں جلوہ گر ہیں:

---

[1] آبِ حیات تذکرہ ذوق۔ فراق۔

کیا ہم تخنی کرتا ہے اس گل کے دہن سے　　غنچہ سے یہ کہہ دو کہ چخ جائے چمن سے

"چخ جائے چمن سے" کیا کہنا کیا چٹپٹی اردو ہے۔

ہم اور غیر یکجا دونوں بہم نہ ہوں گے　　ہم ہوں کے وہ نہ ہونگے وہ ہونگے ہم نہ ہونگے

گویا ذوقؔ اور داغؔ دونوں کی آوازیں مل گئی ہیں۔ الفاظ کی تکرار اور الٹ پھیر کے اس اسلوب کو جناب نوحؔ ناروی نے رگید مارا ہے۔

معلوم ہوا بینی وابروے بتاں سے　　اک تیر ہے گویا کہ چڑھا ہے دو کماں سے

پرانے قسم کی خارجی مثالیہ شاعری کی ایک دلچسپ مثال۔

بیقراری کا سبب ہر کام کی امید ہے　　نا امیدی سے مگر آرام کی امید ہے

اچھا خاصا شعر ہے۔ حالیؔ کا لاجواب شعر یاد آگیا

بیقراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ

اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

دل گرفتار ہوا یار کی عیاری سے　　ہم گرفتار ہوئے دل کی گرفتاری سے

جس در پہ یہ غل تھے کہ آتی کان پڑی آواز نہ تھی

عقل سحر اس در پر تھی حیران کھڑی آواز نہ تھی

"بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن" دوسرے مصرعے میں شکستِ ناروا کا عیب ہے۔ حیران کا لفظ دو لخت ہو گیا ہے۔

کتنے مفلس ہوگئے کتنے تونگر ہوگئے　　خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہوگئے

ٹلب ہے جاذیر مغیلاں ترے دیوانوں کی　　مدتوں چھان چکے خاک بیابانوں کی

الفت کا نشہ جب کوئی مر جائے تو جائے   یہ دردِ سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

رات جوں شمع کٹی ہم کو جو روتے روتے   بہہ گئے اشکوں میں ہم صبح کے ہوتے ہوتے

چاہیے زر ان بتانِ سیم تن کے واسطے   یاں قلندر ہیں، نہیں کوڑی کفن کے واسطے

پھر بہار آئی کفِ ہر شاخ پر پیمانہ ہے   ہر روش پر جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے

ہوتا نہ اگر دل تو محبت بھی نہ ہوتی   ہوتی نہ محبت تو یہ آفت بھی نہ ہوتی

مٹی سے اپنی مٹی جو تربت میں مل گئی   جو کچھ کہ تھی مراد محبت میں مل گئی

جنوں سے میرے مجنوں بھاگتا جیسے بگولا ہے
کہ میں صورت ہوں وحشت کی وہ یونہی اک ہیولا ہے

:

خاک اڑاتا دشت میں جب تیرا سودائی پھرے
پھر بگولا تو ہے کیا آندھی بھی بولائی پھرے

جس طرح ماہ ستاروں میں ایک ہے   یوں میرا مہ جبیں بھی ہزاروں میں ایک ہے

گل بھلا کچھ تو بہاریں لے صبا دکھلا گئے   حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

کیا کہوں اس ابروے پیوستہ کے دل بس میں ہے

ایک طعمہ، مچھلیاں دو، کشمکش آپس میں ہے

مؤذن مرحبا ہر وقت بولا تری آواز مکے اور مدینے

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گذر گیا

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ان تمام اشعار میں ذوقؔ اپنی شان سے جلوہ گر ہیں۔

ذوقؔ کے یہ اشعار کیسے لگتے ہیں؟ ہمارے دل و دماغ پر جو یا جیسا اثر ان اشعار کا پڑتا ہے اسے کیوں کر بیان کریں؟ میں اب اپنے انداز کے مطابق ان اشعار کے اثرات و صفات کو جستہ جستہ پیش کرتا ہوں۔ ان میں ایک نمایاں بات نظر آتی ہے وہ یہ کہ اس انتخاب میں مطلعوں کی بھرمار ہے۔ جلدی میں میں نے ان اشعار کو گنا تو چار سو سولہ (۴۱۶) اشعار تھے اور ان میں سے مطلعے ہیں ایک سو اناسی (۱۷۹)۔ یعنی پینتالیس (۴۵) فیصدی۔ ذوقؔ کی غزلوں سے جتنے انتخاب کیے جائیں گے ان میں ہر ایک کی یہ خصوصیت ہوگی کہ انتخاب کے چالیس پچاس فیصدی اشعار مطلعے ہوں گے۔ ولی دکنی سے لے کر آج تک اکبر الہ آبادی کے سوا کسی اردو شاعر کی غزلوں سے جن کی تعداد ذوقؔ کے مختصر دستیاب کلام سے بہت زیادہ ہے اشعار چنے جائیں تو اور اشعار کے مقابلے میں اتنے مطلعے ہاتھ نہ آئیں گے۔ ذوقؔ کے جو اشعار لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں ان میں ذوقؔ کے مطلعوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور تعداد سے قطع نظر ذوقؔ کے دیگر اشعار سے نسبتاً ذوقؔ کے بولتے ہوئے مطلعوں کی اہمیت بھی بڑی ہوئی ہے۔ ان کے اکثر مطلعوں میں قافیوں اور ردیف کی تکرار آواز میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ذوقؔ کے طرز سخن اور انداز اسلوب کو مطلعوں سے خاص مناسبت ہے۔ مطلعوں میں ان کی آواز کی چولیں بہترین انداز سے بیٹھتی ہیں۔ ذوقؔ کے مصرعوں کی سلاست و روانی کا احساس سب کو ہوتا ہے۔ لیکن کچھ ہی لوگوں کو شاید اس کی نیم شعوری احساس ہوا ہو کہ ذوقؔ کی آواز میں ایک رقاقت یا پتلا پن اور ہلکا پن ہے۔ مطلعوں میں دہرتے دہرے قافیوں اور ردیف سے آواز میں جو تکرار پیدا ہوتی ہے وہ پتلی اور ہلکی آواز کے بہاؤ میں روک تھام پیدا کر دیتی ہے۔ اس طرح روانی کے ساتھ ایک ٹھہراؤ یا جماؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب مطلعوں میں آواز لہراتی یا ٹکراتی ہے تو اس میں ایک گاڑھا پن اور حجم سا پیدا

ہو جاتا ہے اور ذرا سی چمک بھی۔ یہ رکاوٹ یا ٹھہراؤنی نفسہ رقاقت ہلکے پن اور پتلے پن کی صعات کی ضد ہے جو ذوق کی آواز کی خصوصیت ہے اور یہی ضد ذوق کی آواز کو مطلعوں میں چمکا دیتی ہے اور اس آواز کو اجاگر کر دیتی ہے۔ ذوق کے مطلعے ہندی کے ان دوہوں یا دوہروں کی یاد تازہ کرتے ہیں جو عوام میں ضرب المثل بن گئے ہیں۔ مگر ذوق کے مطلعوں کی کامیابی کا تعلق صرف ذوق کی آواز سے نہیں ہے۔ ان کے احساسات و خیالات و تاثرات میں ان کے شعور کی کیفیتوں میں بھی ایک ہلکا پن اور پتلا پن ہے۔ ایک سبک گام و نرم آہنگ نثریت ہے۔ سونے پن کا نہیں مگر ایک خلا کا احساس ان کے تخیل اور آواز دونوں میں ہوتا ہے۔ مطلع (Rhymed Couplet) ذوق کی افتادِ مزاج کو اس لیے موافق آتا ہے کہ ان کی فکر کا انداز اس صفت کا پتہ دیتا ہے جسے انگریزی زبان میں کہتے ہیں (Witticism) یا (Wit) یعنی بذلہ سنجی۔ حاضر بیانی یا برجستگی۔ اکثر ذوق کے مطلعے علم مجلس کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح خواص و عوام دونوں کی دربارداری ہو جاتی ہے۔

یہ محض اتفاقی بات نہیں کہ ذوق اکثر و بیشتر ضرب المثل کو اپنے اشعار میں باندھ دیتے ہیں لیکن جس طرح کی ضرب المثل ذوق کے لیے کشش رکھتی ہے وہ عموماً طنز آمیز ہوتی ہے۔ شیکسپیئر اپنے المیوں میں جب کسی کردار کے مکالمے یا خود کلامی (Soliloguy) کو ختم کرتا ہے تو بجائے نظم معرا کے مطلعے (Rhymedending) سے کام لیتا ہے۔ اس سے کبھی کبھی وہ طربیہ تسکین (Comic Relief) پیدا کر دیتا ہے۔ انگریزی شاعر پوپ نے تو تنہا مطلعوں کے ذریعوں سے اپنے فن کو چمکا دیا۔ ذوق کے مذاق میں بھی ہجو یا تضحیک یا سطحی بذلہ سنجی کا عنصر تھا۔ اس عنصر سے مطلع چمک جاتا ہے اور مطلع اس عنصر کو چمکا دیتا ہے۔ تین چوتھائی صدی کے بعد اکبر الہ آبادی نے اس رنگ کو بلیوں اچھال دیا۔ اکبر قافیوں کو بھان متی کے پٹارے سے نکالتے ہیں:

دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں
سر کشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

میرے اسلام کو اک قصہ ماضی سمجھو ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

رک اور جھک، ماضی اور راضی قسم کے قافیوں کو غزل کے مطلعوں میں نگینے کی طرح جڑ دینا ذوق کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ اور بات کہ اس صناعی پر غزلیت کو ایک حد تک نثار کر دینا ہے۔ سامنے کی پنچایتی باتیں (Platitudes) ذوق کے دماغ میں چکر کاٹتی رہتی تھیں۔

یہ بھی ایک وجہ ذوق کے ضرب المثل اور کہاوتوں پر "یا کہاوت نما" باتوں پر للچاکر نظر ڈالنے کی ہے۔ اردو کا کوئی شاعر صائب کی فارسی شاعری کی داد سخن تو کیا دے سکا لیکن لکھنؤ میں ناسخ اور ان کے ہمعصروں میں جو تمثیلی شاعری کرنے یا خشک اخلاقی باتیں کہنے کا رجحان ہم پاتے ہیں اس کی تنہا نمائندگی دلی میں ذوق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فرسودہ اور پھیکی باتوں کی فرسودگی اور پھیکا پن استادانہ انداز سے کہے ہوئے مطلعوں میں کم ہو جاتا ہے۔ قافیہ اور ردیف کی تکرار تجدید کا الٹا اثر پیدا کر دیتی ہے۔ تمثیلی "کہاوتی" یا اخلاقی باتوں کے کہنے کے لیے مطلع بہت موزوں ہوتا ہے۔ جیسے ہندی شاعری کے یہ دوہے

یا دنیا میں آئے کے سب سے ملیے دھائے
نا جانیں کس روپ میں نارائن مل جائیں[1]

صاحب کے گھر دور ہیں جیسے لمبی کھجور   چڑھے تر چاکھے پریم رس گرے تو چکنا چور
آوت ہی ہر کھے نہیں نین نہیں سینہ   تلسی وہاں نہ جایئے کنچن برسے مینہ

یعنی اگر میزباں تمہارے آتے ہی خوشی سے کھل نہ اٹھے اور اگر اس کی آنکھوں سے محبت چھلک سی نہ پڑے تو اے تلسی داس وہاں نہ جانا خواہ وہاں سونا برستا ہو۔

کچھ یہی انداز ذوق کا ہے اور اسی سے مطلعے کی تکنیک ان کے اندازِ بیان سے خاص طور پر تال میل کھا جاتی ہے۔ مطلعوں میں ذوق خود اپنے خیالات کا بھید پا جاتے ہیں اور ان کے لٹکائے جانے کا انداز (Hang) پا جاتے ہیں۔

ذوق کے ہم عصروں میں ذوق کے فنِ مطلع نگاری کی کچھ جھلک مومن کے کئی مطلعوں میں دکھائی دے جاتی ہے

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اٹھے   کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اٹھے
دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے   فلس ماہی کے گلِ شمع شبستاں ہوں گے

جہاں ذوق اور ناسخ کے اقلیم سخن کے ڈانڈے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس غزل کے کئی

---

[1] یہاں یہ دھائے اور جائیں کا قافیہ ایسا ہی ہے کہ "موت کیا ہے مری بلا جانے ہم بھو بیٹیاں یہ کیا جانیں" جسے حالی نے جواز کا فتویٰ اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں دیا۔

اشعار پر ذوقؔ کی پرچھائیں پڑتی ہے۔ "ہم نکالیں گے سن اے بادِ صبا بل تیرا"، "ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس" یا "تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کرے" والے اشعار بلکہ مومنؔ کی اس غزل کا مشہور مقطع بھی لفظ مومن و کافر کے تصادم و تقابل کی خصوصیت لیے ہوئے ذوقؔ کے انداز میں ڈھلا ہوا ہے۔

پھر وہ وحشت کے خیالات ہیں سر میں پھرتے

دشت یاد آتے ہیں آہو ہیں نظر میں پھرتے

اور ان مطلعوں سے بھی زیادہ مومنؔ کے اس مطلعے میں

کیونکر یہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے　　کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

ذوقؔ ایسے ہم عصر کا اثر مومنؔ پر کچھ پڑ جانا ناگزیر تھا ورنہ مومنؔ کے مطلعوں یا اشعار پر عموماً بجز مومن کے مخصوص مزاج کے اور کسی کا بھی اثر نہیں پڑا۔ غالبؔ کا یہ مطلع انداز بیان کے لحاظ سے تو ذوقؔ کی یاد دلاتا ہے لیکن اس کا مخصوص طنز اور اس کی تلخی خاص غالبؔ کی چیزیں ہیں۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی　　میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

غالبؔ کے اس مطلعے میں ذوقؔ کی سلاست و روانی و بے تکلفی سب کچھ ہوتے ہوئے وہ روحِ احساس ہے جو غالبؔ کو نصیب تھی اور صرف غالبؔ کو

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے

آتشؔ کے کچھ مطلعوں میں بھی قافیے اور مصرعوں کی روانی ذوقؔ کی کچھ یاد دلاتے ہیں۔ میرؔ، سوداؔ، جراتؔ، مصحفیؔ اور ناسخؔ کی یاد نہیں دلاتے نہ غالبؔ و مومنؔ کی۔

قصہ سلسلۂ زلف نہ کہنا بہتر　　پیچ در پیش ہے خاموش ہی رہنا بہتر

بات یہ ہے کہ بیان میں جو صفائی و روانی مصحفیؔ پیدا کر چلے تھے دلی میں اس سلسلے کو ذوقؔ ہی آگے بڑھا رہے تھے

دوست ہی جب دشمن جاں ہو تو کیا معلوم ہو　　آدمی کو کس طرح اپنی قضا معلوم ہو

لیکن جب آتش اپنے معرکہ آرا مطلع کہتا ہے تو ذوق کا انداز دھواں بن کر اڑ جاتا ہے۔

مگر اس کو فریبِ نرگس مستانہ آتا ہے الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

موت مانگوں تو ملے آرزوے خواب مجھے ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

ہاں رند شاگرد آتش کے اس مطلع میں ذوق کا انداز صاف جھلک رہا ہے اگرچہ کچھ دھوم دھام اس میں آواز آتش کی ہے

کوہ فرہاد سے مجنوں سے بیاباں جیتا جوش وحشت ترے اقبال سے میداں جیتا

اور صبا کے مطلعے میں بھی ذوق کا چھیڑا ہوا سلسلہ ملتا ہے۔

اختیاری عملِ رندِ قدح نوش نہیں خطِ تقدیر ہے موجِ مئے سر جوش نہیں

ناسخ کا مشہور عالم مطلع ہے جس میں ناسخ اپنے رنگ سے ہٹ کر اور ذوق سے دوش بدوش ہو کر کہتا ہے

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

اس مطلعے میں ببولوں اور پھولوں کے قافیے ذوق کی یاد دلا دیتے ہیں کسی اور شاعر کی نہیں ناسخ کی بھی نہیں۔

امداد امام اثر عظیم آبادی کا یہ مطلع اپنے اسپرٹ کے لحاظ سے تو آتش کی یاد دلاتا ہے اور برجستگی بھی آتش کی ہے لیکن نہ جانے کیوں اسے سن کر ذوق کی بھی یاد آجاتی ہے۔

حسن کی جنس خریدار لیے پھرتی ہے ساتھ بازاد کا بازاد لیے پھرتی ہے

میرے والد مرحوم حضرت عبرت گورکھپوری کے یہ مطلعے سنیے اور دیکھیے کہ میر، سودا، غالب، آتش یاد آتے ہیں یا ذوق اور کچھ کچھ مصحفی

زمانے کے ہاتھوں سے چارا نہیں ہے زمانہ ہمارا تمھارا نہیں ہے

اعمال کا پابند ہے چھوٹا بھی بڑا بھی ہاتھوں سے بشر اپنے ہی بگڑا بھی بنا بھی

ذوقؔ سے پہلے جرأتؔ اور انشاؔ کے کچھ بہت شوخ عشقیہ اشعار کو چھوڑ کر یہ بات بہت کم دیکھنے میں آتی ہے کہ مطلعوں یا غزلوں کے دوسرے اشعار میں بھی قافیہ اور ردیف کے میل سے یا کبھی کبھی صرف ردیف سے پہلے یا دوسرے مصرعے کے ایک حصے سے یا پورے دوسرے مصرعے سے اچانک ایک ایسا فقرہ بن جائے جس میں بول چال اور روزمرہ کا لطف آئے۔ ظفرؔ کی کئی غزلوں میں یہ بات ملے گی۔ ابھی میں نے آتشؔ کے کچھ وہ مطلعے جو ذوقؔ کے رنگ میں ہیں (اگرچہ ان میں آتشؔ کے انداز کا تیکھا پن بھی ہے) سنائے ہیں ان کے ان ٹکڑوں کو دیکھیے "نہ کہنا بہتر" یا "خاموش ہی رہنا بہتر" یا "آدمی کو کس طرح اپنی قضا معلوم ہو" داغؔ کی کئی غزلوں میں یہ باتیں ملیں گی مثلاً "ناز والے نیاز کیا جانیں" والی غزل "کہ جی جانتا ہے" والی غزل یا وہ غزل جس کی ردیف ہے "یہ کیا" ذوقؔ کے جو اشعار آپ اس مضمون میں پڑھ چکے ہیں ان میں بہت سے ایسے مطلعے اور اشعار مل جائیں گے۔ جن میں ٹھٹھول بزلہ سنجی (Witticism) کی صفت ہے۔ یہی صفت آتشؔ و شاگردانِ آتشؔ کے یہاں سنجیدہ خیالات کو برجستگی دے دے گی اور اسی صفت کو داغؔ کی بے پناہ شوخی بھڑکتی ہوئی چنگاریاں بنا دے گی۔ مثلاً پہلے مصرعے "میں ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا" میں ردیف بول چال میں ہے۔ لیکن دوسرے مصرعے میں ردیف اور قافیہ سے مل کر بول چال کا ایک ایسا شوخ و برجستہ انداز پیدا ہو گیا ہے کہ بے اختیار منہ سے واہ نکل جاتی ہے۔ "تم وقت پہ آپہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا"۔ حال میں مجھے میرے ایک خوش گو اور خوش فکر دوست نے اپنی ایک غزل سنائی "آسماں کیا ہے"، "آستاں کیا ہے"۔ ایک مطلعے میں ردیف "کیا ہے" ایک الگ فقرہ بن کر مصرعے میں اس خوبی سے لگا ہے کہ انداز بیان سنور اٹھا ہے۔

گریں جو ٹوٹ کے گرتی ہیں بجلیاں، کیا ہے
جب آشیاں ہی نہیں شاخِ آشیاں، کیا ہے

دیکھو پہلے مصرعے میں کیا ہے کس حسن سے آیا ہے۔ یعنی مجھے کیا یا کیا پردا یا مجھے کیا پڑی ہے۔ یا مجھے کیوں غم ہو۔ پہلے ذوقؔ نے اردو غزل میں اس صفت کو عام کیا بعد کو اس انداز بیان کی جو مثالیں نظر آتی ہیں وہ سب فیضانِ ذوقؔ ہے۔

اس مضمون کے دورانِ تحریر میں ایک دل چسپ واقعہ ہوا۔ میرا مذاقِ شاعری ذوقؔ کے رنگِ طبیعت و رنگ سخن سے بہت دور ہے۔ لیکن اس مضمون کے لیے جب میں نے ذوقؔ کے کلام پر پھر سے نظر ڈالی اور ان کے اشعار نقل کرنے لگا تو مضمون لکھنے اور سوچنے اور آرام کرنے

کے وقفوں میں مجھ سے ایک ایسا مطلع ہو گیا جو زبان و بیان کے لحاظ سے میر اکم اور ذوق کا زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ مطلع یہ ہوا

کرنے کو ہیں دور آج تو یہ روگ ہی جی سے

اب رکھیں گے ہم پیار نہ تم سے نہ کسی سے

ذوق کے مطلعے اردو غزل میں نشانِ راہ یا سنگ میل کا حکم رکھتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اردو اب اپنی آواز کو پارہی ہے اور اپنے نطق پر قابو حاصل کر چلی ہے۔ اس کی بولی میں ایک خود اعتمادی ایک توازن پیدا ہو چلا ہے۔ اٹک اٹک کے بات کرنے کی منزل سے اردو آگے بڑھ رہی ہے۔ اب وہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے جو اردو کو کہاں سے کہاں پہنچادے گا ذوق کے بعد سے سینکڑوں مشہور و گمنام شعرا کے یہاں اور اشعار جانے دیجیے صرف مطلعے ایسے اور اتنے ملتے ہیں جو ہمیں ذوق کی یاد دلاتے ہیں اور اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ اب اردو کی آواز کھل گئی ہے اور اس کے دل کی جھجک اور جھجک نکل گئی ہے یوں تو میر اور سودا کے بھی کئی مطلعے بہت رواں دواں ہیں جن میں براہیر کے مصرعے لگتے ہیں لیکن ذوق ہی کے زمانے سے اور ذوق کے بعد ہی عام طور پر یہ ممکن ہوا کہ اردو غزل میں ہزاروں مطلعے صفائی اور روانی سے کہے جائیں اگر شاعر میں ذوق کی آواز کا کھلاپن اور چلاپن اور ذوق کی تشریت نہیں ہے تو ان مطلعوں میں شعریت و تشتریت، کیف و اثر لوچ اور نغمگی بھی بدرجہ اتم موجود ہوں گے۔ ایسے مطلعوں کی باقاعدہ داغ بیل ذوق ہی نے ڈالی۔ سانچا ذوق ہی نے تیار کیا۔ ذوق کے بعد سے شاعری کی روح نئے نئے انداز سے اس میں ڈھلتی گئی۔

ذوق کے اسلوب شعر گوئی یا شعر کہنے کے کینڈے یا ڈھب کو اگرچہ مطلعے اجاگر کر دیتے ہیں اور اس کے طرز و انداز میں مزید خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن علاوہ مطلعوں کے ان کے اور اشعار پر یا ان کی پوری غزلوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہاں بھی ان کے اسلوب کی وہ خصوصیتیں نظر آتی ہیں جن کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ ذوق کے کلام کی روانی اور شستگی اس کی رقاقت اس کی سبک گام و نرم آہنگ نثریت ہمیں پوپ اور ٹینی سن کی یاد دلاتی ہیں۔ ذوق کے اسلوب، درک و تصور اور انداز بیان میں ایک قسم کی لاطینی کلاسکیت (Latin-Classicism) ہے۔ ان کے بہت سے اشعار میں تعقید ملے گی لیکن یہ تعقید مصرعوں کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرتی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہتے ہوئے پانی میں چکر یا بھنور پڑتے جارہے ہیں لیکن پانی کا بہاؤ نہیں رکتا۔ یہاں ذوق کے احساس، جذبات،

خیال اور آہنگ کی وہ کمزوری یعنی اس کا پتلا پن یا رقاقت ذوق کے لیے معاون اور سود مند ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح ذوق کے یہاں بسا اوقات عیبِ تعقید حسنِ تعقید بن جاتا ہے جیسے گرہ باز کبوتر فضا میں گرہوں پر گرہیں کھاتا ہوا اپنی اڑان جاری رکھے۔ ذوق کی بندشیں نہ چست ہوتی ہیں نہ سست۔ یہاں بھی نرم گام اور آہستہ خرام نثریت ان کے آڑے آتی ہے اور ان کی بندشوں میں ایک نرم لچک اور آواز میں ایک نرم روانی پیدا کر دیتی ہے۔ جیسے ایک پتنگ باز پتنگ کو کافی اوپر اڑا رہا ہو اور ڈور کو اس طرح ڈھیل دیے ہوئے ہو کہ اس میں جگہ جگہ پیچ و خم اور زاویے بن جائیں یہی پیچ و خم ذوق کی تعقیدیں ہیں اگر ان کے جذبات میں شدت ہوتی، احساس میں داخلی کھنچاؤ اور تناؤ ہوتا اگر ان کے خیالات میں کس بل اور گٹھیلا پن ہوتا تو تعقید کی یہ بھرمار ہر شعر میں تکلیف وہ رکاوٹ پیدا کر دیتی۔ اگر ان کے مصرعے جذبات سے بوجھل ہوتے تو جہاں تعقید آئی وہیں ٹھپ ہو جاتے۔ کھنچے تنے ہوئے شدید جذبات تعقیدوں کی ٹھیس کھا کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔ اتنی اور اس طرح کی تعقیدوں یا گرہوں سے غالب کا کلام تو مٹ جاتا لیکن ذوق کے کلام کا حسن چہ جائیکہ تعقید سے بگڑے کچھ اور بھی بن جاتا ہے کبھی کبھی حالی کے ہاں بھی تعقید کا یہ عیب ایک طرح کا حسن بن گیا ہے۔ جیسے "نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں"۔ کلاسیکی تکمیل (Classical Finish) ذوق کے کلام میں جتنی اور جیسی ملتی ہے اتنی اور ایسی ذوق کے سب سے بڑے شاگرد داغ کے یہاں نہیں ملتی۔ زبان کے ناتراشیدہ ٹکڑوں کو صفائی سے باندھ کر جس طرح ذوق چول سے چول ملا دیتے ہیں اس طرح کی کاری گری داغ سے نہ بن پڑتی اور یوں تو داغ نے استاد کا نام روشن کر دیا اور ذوق کے کلام کی کئی خصوصیتوں کو داغ نے چمکا دیا۔ شاگردانِ ذوق میں زیادہ تعقید سمیت رواں دواں مصرعے کہنے میں یا ناتراشیدہ لفظوں اور ٹکڑوں کو بناہ دینے میں داغ سے زیادہ صلاحیت ظفر میں تھی۔ یوں تو سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دکھانے میں مصحفی کا کوئی حریف نہیں لیکن مصحفی کا زیادہ تر کلام صرف عشقیہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ذوق ہر طرح کی باتیں عشقیہ اخلاقی، پنچایتی، تمثیلی، سنجیدہ، ظریفانہ، المیہ، طربیہ سب کچھ اس آسانی سے کہہ جاتے ہیں کہ انھی کا مصرع یاد آتا ہے "مست ہاتھی ہو تو بے بار نظر آتا ہے"۔ ذوق کو استاد ذوق کہا جاتا تھا۔ اس خطاب کی موزونیت صرف اس لیے نہیں مسلم ہے کہ ذوق بادشاہ کے استاد تھے (حالانکہ جن گوناگوں زمینوں میں ظفر نے شاعری کی ہے صرف ان زمینوں میں ظفر کے اشعار کی اصلاح جو کر سکے وہ اور سب کچھ بعد کو ہے استاد پہلے ہے) بلکہ اس لیے بھی ہے کہ مختلف العنوان اشعار کہنے میں روزمرہ، محاوروں، کہاوتوں ایسے الفاظ اور فقروں کو جو بظاہر شعر میں کھپائے نہیں جا سکتے تھے بے لاگ باندھ جانے میں اور

اس سب کو لے کر تعقیدوں کا کاواکاٹتے ہوئے کچھ شہسواروں کی طرح یوں آگے بڑھ جانے میں کہ ہاتھ کا پانی تک نہ ہلے ذوقؔ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یہی وہ قادر الکلامی ہے جس کی بدولت استاد کا لقب جتنا ذوقؔ پر پھبتا ہے کسی اور پر نہیں پھبتا۔ یہ لقب ایک شگون (Portent) تھا۔ ذوقؔ کی ادبی فتوحات کے لیے۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی لطف و دلچسپی سے خالی نہیں کہ ذوقؔ کی غزلیں اسکولوں کے اردو کورس کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہیں اور معلموں کو ذوقؔ کے اشعار سب سے زیادہ یاد رہتے ہیں یہاں تک کہ دیہات و قصبات کے مدرسوں کو بھی۔ ایک لحاظ سے ذوقؔ معلموں کا شاعر ہے۔ یہ شاعری سب سے زیادہ "ادبی" یا "قواعدی" شاعری ہے۔ ذوقؔ کے کلام میں ایک خوش آہنگ معلمانہ شان ملتی ہے۔ یہ بات کسی اور کے کلام میں نہیں۔ ان کی نرم رو، سبک رفتار اور خوش آہنگ نثریت ان کی شاعری میں فن انشا پردازی کی شان پیدا کر دیتی ہے۔ طلبا اور معلموں کو تو یہ خصوصیت خاص طور پر بھاتی ہے جذبات اور گہرائی کا فقدان طلبا اور معلموں کے لیے شاعری کو سمجھنے سمجھانے کے کام کو اور اس سے لطف اندوز ہونے کے کام کو آسان بنا دیتا ہے۔ مدرسوں کی فضا سوز و ساز کی فضا سے الگ ہوتی ہے وہاں تو ایسی شاعری چاہیے جو اقلیدس سے ملتی ہو۔ مگر اس قسم کی شاعری میں خیال اور زبان کے محاسن جس بے لاگ استادانہ شان سے ذوقؔ نے پیدا کیے وہ انھی کا کام تھا۔

ذوقؔ کی شاعری دل کی شاعری ہے یا دماغ کی؟ اس کا جواب جو بھی ہو لیکن ذوقؔ کی شاعری صناعی کی لاجواب مثال ہے۔ ذوقؔ رائے عامہ کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پوپ کا یہ بیان مجھے یاد آجاتا ہے کہ فن کی تمام تر خوبی یہ ہے کہ زندگی کے مسلمات اور پنچایتی خیالات اور معتقدات کو حسین ترین طریقے پر ظاہر کر دیا جائے۔ یعنی جو بات سب جانتے اور مانتے تھے لیکن اس کا اب تک اس خوش سلیقگی سے اظہار نہیں ہوا تھا۔

All art is nature to adcantaged rest What oft was thought but never so well expressed

ذوقؔ کے کلام سے ہمارے دماغ کے اس حصے کو ایک ہلکا سا انبساط ایک خوشگوار آسودگی ملتی ہے جو پیش پا افتادہ باتوں اور عام خیالات کو ادا کرنے میں غیر معمولی قدرت اظہار کو دیکھ کر ملتی ہے۔ اس لیے ہم ذوقؔ کو جن معنوں میں زبان کا شاعر کہہ سکتے ہیں ان کے ہم عصروں اور پیش رووں میں ہم کسی کو نہیں کہہ سکتے بلکہ داغ کو بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس لحاظ سے ہم ذوقؔ

کو اردو کا پنچایتی آرٹسٹ یا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ عوام اور متوسط طبقے کی اکثریت اور امراء رؤسا بھی گیتوں میں، غزلوں میں بزم حال و قال میں عموماً "پتلے" اور سطحی یا بے تہہ جذبات و خیالات کی چیزیں مانگتے ہیں۔ یہاں بھی جمود، تن آسانی اور سہل پسندی کار فرما ہیں۔ میرے علم میں اب تک کسی قوال نے غالب کی کوئی غزل نہیں گائی (اور کاش نہ گائے) اور ذوق نے تو قوالوں کے لیے کئی غزلیں لکھ کے دیں۔ غالب پہلا شخص ہے جس نے رچی اور سنواری ہوئی موسیقیت اردو شاعری میں پیدا کی لیکن پنچایتی طور پر عامیت زدہ کانوں کے سننے سنانے یا سطحی طور پر گانے بجانے کی چیز غالب کی موسیقیت نہیں ہے۔ ذوق کی غزلیں گانے کو لوگ بھلے گائیں لیکن سنگیت سے ان کو کیا واسطہ؟

ہاں تو ذوق پنچایتی شاعر ہے، رائے عامہ کا شاعر ہے۔ ذوق کی لغت، اسلوب بیان سازی، جس طرح زمینیں ذوق نے نکالی ہیں سب سے پتا چلتا ہے کہ وہ اہلِ دلی کے جمہوری مذاق سے بہت قریب ہیں بلکہ اس مذاق کی روح یا اس کے مرکز کو انھوں نے پالیا ہے۔ اس معاملے میں ذوق کا کوئی ثانی یا حریف نہیں۔ اسی سے ذوق استاد ذوق کہلائے۔ بول چال کی اردو کو جو شاعر اس جچے تلے طریقے پر باندھ دے، اس میں اتنی تکمیل پیدا کر دے اسے یوں چمکا دے کہ ترقی کی گنجائش باقی نہ رہے وہی پنچایت اور پنچایتی شاعری کا ملک الشعرا یا استاد مانا جاسکتا ہے۔ ایسے شاعر کا شاعر کم لیکن حیرت انگیز صناع ہونا ضروری ہے۔ اردویت جتنی ہمیں ذوق کے یہاں ملتی ہے اتنی ذوق کے پہلے کسی شاعر میں نہیں ملتی اور جتنے موضوعات پر شعر کہنے میں اردو کے اردو پن یا اس کی اردویت کو ذوق نے نمایاں کیا اتنے موضوعات پر داغ بھی اس انداز سے اشعار نہیں کہہ سکے۔ میر، سودا، درد، غالب و مومن سب کے یہاں بہت سہل اور سلیس اردو کی مثالیں ملیں گی لیکن ہم ان کی اردویت کے بجائے ان اشعار کی شعریت سے متاثر و متکیف ہوتے ہیں۔ ان کی سادگی اور ذوق کی سادگی میں بڑا فرق ہے۔ ان کی بزلہ سنجی بھی ذوق کے ٹھٹھول سے الگ ہے۔ ذوق کا مرکز جو (Centripetal) آرٹ اپنی خارجیت کے سبب داخلیت اور شعریت سے مغلوب نہیں ہوتا اس لیے محض زبان یا خالص اردو کی صفت تنہا چمکتی ہوئی نظر آتی ہے ہم پر استاد ذوق کے لقب کا مفہوم روشن ہو جاتا ہے۔ ہم اس کے اندازِ بیان کو دیکھتے رہ جاتے ہیں اور انشا پردازی کے معجزے کے قائل ہو جاتے ہیں۔

ذوق کی اردو سے اگرچہ داغ کی اردو بنی لیکن داغ کی شوخ بیانی نے اس میں ایک شدت اور تیکھا پن پیدا کر دیا۔ داغ کے چھچھے اور معجز نما چھلاہٹ جس پر پیار کا دھوکا ہو جاتا ہے داغ کی تنہا

ملکیت ہے۔ داغ کی اردو ذوق کی اردو کی نرم آہنگ نثریت سے کچھ الگ ہو گئی۔ داغ کی آواز میں ایک آنچ ہے اس کے اشعار میں ایک جلن ہے جو محض اردو یا زبان کا کرشمہ نہیں ہے۔ زبان کا خالص کرشمہ ذوق کے یہاں مختلف العنواں اشعار میں ملتا ہے ذوق کی اردویت نظیر اکبر آبادی کی پنچائتی بولی سے بھی الگ ہے کیوں کہ ذوق کے یہاں محض زبان وبیان وطرز ادا کے وہ تمام فن کارانہ صفات موجود ہیں جو مومن، شیفتہ اور خالص زبان پرست طبقے کے دلوں کو لگے۔ ذوق کی اردو میں چمکی ہوئی، بنی ٹھنی ہوئی، تراشی ہوئی عمومیت ہے۔ ذوق زبان کے لحاظ سے عمومیت زدہ ہرگز نہیں ہے بلکہ عمومیت ذوق کے قلم کی چوٹوں سے چمک گئی ہے اور اس میں فصاحت کی جھلک پیدا ہو گئی ہے۔ نظیر کے یہاں یہ عمومیت جوں کی توں ہو گئی ہے۔ نہ ذوق کی اردوئیت اس ''خالص اردو'' کی مثال ہے جس کو آرزو لکھنوی نے فروغ دیا۔ ذوق کا یہ شعر

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر گئے پر نہ لگا جی تو کدھر جائیں گے

یا ''مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے'' ہے تو خالص اردو لیکن اس تکلف اور تصنع اور اس انکاؤ سے بالکل آزاد ہے جو آرزو کے بالارادہ کہے ہوئے آورد زدہ خالص اردو کے اشعار میں ملتے ہیں۔ دیکھیے نہ آرزو کی خالص اردو اور ان کا وہ کلام بھی جس میں فارسی عربی الفاظ آتے ہیں اور پھر دیکھیے ذوق کے کلام کا ہلکا پھلکا پن اور اس کی تیز رفتاری اور سبک روی۔ آرزو کیا کسی شاعر کی زبان اس بے تکلف برجستگی کی مثال نہیں پیش کرتی۔

جس جگہ بیٹھے ہیں بادیدۂ نم اٹھے ہیں
آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اٹھے ہیں

یہ ہے ذوق کی اردویت جو ناسخ تک کو بھی نصیب نہیں ہوئی اور بالکل اسی انداز میں جس کی مثال آتش کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ ذوق واقعی استاد ذوق تھے۔ ذوق فنکار بڑے نہ ہوں صنعت کار وہ بہت بڑے ہیں۔

ذوق کے بہت سے اشعار اور کچھ غزلیں چالیس برس پہلے بہت لوگوں کو یاد تھیں۔ اس وقت تک غالب کے کلام کی نشاۃ ثانیہ ابتدائی منازل میں تھی۔ آج کافی لوگوں کو ذوق کے کلام کا کچھ حصہ یا اچھا خاصا حصہ یاد ہے۔ لیکن جتنا لوگوں کو یاد تھا یا ہے اس سے جو گنے اٹھ

گنے شعر ذوقؔ کے ایسے ہیں جن میں تعقید سمیت اور کئی زاویے بناتی ہوئی ڈھیل سمیت الفاظ، محاورے، فقرے، ردیفیں اور قافیے اس ڈھب سے بندھے ہیں کہ یہ اشعار زبانوں پر نہ ہوتے ہوئے بھی، یاد نہ ہوتے ہوئے بھی جب پڑھے جاتے ہیں تو بہت لطف دیتے ہیں۔ یہ شعر حافظہ میں محفوظ نہ رہیں لیکن جب آنکھوں کے سامنے آتے ہیں تو ہم ذرا ٹھٹک کر گویا پھسل پڑتے ہیں۔ ان اشعار میں بھی ایک نکھلھر اپن ہے۔ یاد وہ اس لیے نہیں رہتے کہ ذوقؔ کے معرکہ آرا اشعار کی برجستگی، رائے عامہ یا سامنے کی بات، یا مسلمہ کلیات کے بیان کا نکھار ان اشعار میں ذرا کم ہے، ان میں ذوقؔ کا پورا پورا زور بیان نہیں ہے لیکن لطفِ بیان موجود ہے۔ سطحیت اور پتلے پن میں جب سنگ مرمر کی چکناہٹ اور ہمواری یا بلور کی ہم دمیدگی اور انجماد آجاتے ہیں تب ہم احساسِ تکمیل کرتے ہیں اور ذوقؔ کے جن اشعار میں یہ صفات آگئے ہیں وہ یاد رہ جاتے ہیں لیکن ان کے بہت سے اشعار بلور یا سنگ مرمر ہوتے ہوتے رہ گئے ہیں اور ان کے پتلے پن میں مکمل انجماد پیدا نہیں ہو سکا ہے اسی لیے سامنے آکر لطف تو دے جاتے ہیں لیکن یاد نہیں رہتے۔ ذوقؔ کا جو اسلوب ہے اس کے لحاظ سے مطلعوں میں یہ انجماد یا جماؤ پیدا ہو جانے کا زیادہ امکان رہتا ہے۔ ذوقؔ کی شاعری زبان کی شاعری ہے اور زبان کے شعر مطلعوں میں اکثر نکھر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم ذوقؔ کو مطلعوں کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ جذبات میں گہرائی اور شدت نہ ہونے سے ذوقؔ کے اکثر اشعار ان کے استادانہ اور انداز بیان کے سبب پھسپھسے پن کے عیب سے بال بال بچ جاتے ہیں جہاں برجستگی نہیں آسکی یا شعر کی نرم رفتار میں ہمواری یا خوبصورت لچک پیدا نہیں ہو سکی وہاں ذوقؔ کے اشعار لچ لچ کر رہ گئے ہیں۔ ان کے پاؤں میں موچ آتے آتے رہ گئی ہے ذوقؔ کے ہر شعر میں زبان کی طنابیں پوری طرح کھنچی ہوئی نہیں ہیں نہ آواز کی روانی میں ہر جگہ وہ لچک پیدا ہو سکی ہے کہ الفاظ کی ''زلفِ مسلسل کے پیچ میں'' ہر شعر ایک ایک گدگدی کے ساتھ تین تین بل کھا جائے ایک خفیف سے ڈھیلے پن ہی کے کارن یہ اشعار یادداشت سے پھسل جاتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہوتا تو سطحیت کی وجہ سے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ جو ارد و یت ذوقؔ کے کلام میں ہے وہ کسی اور شاعر کو اس حد تک نصیب نہیں ہوئی۔ غالب اوروں سے استفادہ کرتا ہوا بھی اپنے رنگ میں پرگٹ ہو جاتا ہے۔

اس مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
بات پروں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

غالبؔ کے ان اشعار کی سادگی کو دیکھ کر ممکن ہے یہ خیال گزرے کہ میرؔ کی سادگی سے غالبؔ نے متاثر ہو کر یہ اشعار کہے لیکن ان اشعار میں میریت نہیں ہے بلکہ غالبیت ہے۔ غالب تقلید کرتے ہوئے بھی غالب ہی رہتا ہے۔

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی امتحاں اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ سہی

چند دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حریف معنی مشکل نہیں فسون نیاز دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

ممکن ہے ان مطلعوں میں غالبؔ نے ذوقؔ کے مطلعوں اور ان کے عام انداز کی برجستگی اور اردویت سے ذوقؔ کے کلام کی صفائی اور روانی سے اثر لیا ہو لیکن ان اشعار میں جو طنز ہے ان اشعار میں جو کھٹکے ہیں، لہجے میں جو تیکھاپن اور تلخی ہے وہ غالبؔ کی اپنی چیزیں ہیں۔ ان عناصر کے فقدان ہی سے ذوقؔ کی اردویت چمک جاتی ہے اور اس چمک میں کوئی اور کرن شامل نہیں ہونے پائی۔

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

لیتے ہی دل جو عاشق دلسوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

ان اشعار میں اردویت کے سوا کچھ نہیں مگر غالب سے بہت زیادہ اردویت ان میں ہے۔ ہندوستانی الفاظ اور فارسی عربی کے وہ الفاظ جو اتنے مانوسِ خاص و عام ہوگئے ہیں کہ ہندوستانی اردو کی بوباس ان میں آگئی ہے غالب، مومن اور میر و سودا نے بھی استعمال کیے ہیں لیکن جس طرح ہندی کی چندی یا جیسا محض زبان کا ٹھٹھول ان لفظوں سے ذوق کر دکھاتے ہیں وہ آپ اپنی مثال ہے۔ جہاں تک میر و غالب کا تعلق ہے زبان اور الفاظ نے اپنے آپ کو انھیں سونپ دیا ہے لیکن جہاں تک زبان و الفاظ کا تعلق ہے ذوق نے اپنے آپ کو انھیں سونپ دیا ہے۔ پھر ان کی سی اردوئیت اور کسی میں کہاں آسکتی تھی۔ ذوق کے یہاں الفاظ پر جذبات کا راج نہیں ہے بلکہ الفاظ اور زبان جذبات اور خیالات پر راج کرتے ہوئے اور خود اپنی فاتحانہ شان دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میر و غالب اپنی شعریت کے مخصوص اندازوں کی شرط لگا کر اردو کو اپناتے ہیں۔ ذوق اردو کو صرف اردویت کی شرط لگا کر اپناتے ہیں۔ غالب و میر کی اردو میں غالب و میر کی شخصیتیں جھلکتی ہیں۔ ذوق کی اردو میں صرف اردو کی شخصیت نظر آتی ہے۔ یہ ہے ذوق کی اردویت اور یہ ہے ذوق کا فن۔

ذوق کے یہاں اردو اس طرح غالب ہے کہ بادی النظر میں اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ ذوق نے فارسی ترکیبیں اس آسانی سے اپنے اسلوب میں جذب و پیوست کر لی ہیں کہ غور کرنے ہی سے وہ نظر آتی ہیں۔ ذوق کی اردو نے انھیں یوں اپنا لیا ہے کہ ہم سوچتے بھی نہیں کہ الگ الگ نظر ڈالنے سے ان ٹکڑوں اور ترکیبوں میں بڑی شستہ فارسیت ہے۔ ذوق نے فارسیت کو نمایاں نہیں ہونے دیا۔ اور اسے اردو کو دبا لینے سے بچایا ہے۔ دیکھیے ان اشعار میں یہ قابل توجہ فارسی ترکیبیں ہیں۔ (۱) کعبۂ بے در، (۲) گرم تپش، (۳) آسیائے باد، (۴) دیدۂ روزنِ دل، (۵) نفسِ بے مقدور، (۶) جنبشِ برگ صفت، (۷) اشکِ مژگاں، (۸) مقامِ وجد، (۹) غزالِ پلنگ خو، (۱۰) اکسیر عشق، (۱۱) نخلِ گل آتشبازی، (۱۲) سوزنِ گم گشتہ، (۱۳) غرہ جوہر، (۱۴) ساقیانِ سامری فن، (۱۵) شکوہ فرصت، (۱۶) توسنِ چالاک، (۱۷) زاہدِ دورنگ، (۱۸) عاشقِ دل سوز، (۱۹) واجب الرعایت، (۲۰) خونابۂ حسرت، (۲۱) کلیدِ درِ گنج راز، (۲۲) پیرِ خرابات، (۲۳) گرفتارِ تفکر، (۲۴) تودۂ طوفاں، (۲۵) صراحی بہ بغل، دفترِ تقدیر، (۲۷) کشمکشِ طرۂ دوتا، (۲۸) ابروئے پیوستہ، (۲۹) خوانِ دوں ہمت۔

ظاہر ہے کہ یہ فارسی ترکیبیں ایک کافی پڑھا لکھا آدمی ہی اپنے کلام میں لا سکتا ہے لیکن بجائے شعریت کے ایک لطیف نثریت ان ترکیبوں میں ملتی ہے۔ ان میں نظیری یا عرفی کی فارسیت کی وہ چلبلی شگفتگی نہیں ہے جس سے متاثر ہو کر غالب نے اپنے کلام کو رنگا رنگ بنادیا ہے۔

ذوق، مومن، غالب تینوں کی ہم طرح غزلیں بہت کم ہیں۔ تینوں نے نئی نئی زمینیں نکالی ہیں۔ ان زمینوں سے ہر ایک کی افتاد طبیعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح کی زمینیں ذوق نے نکالی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ ذوق جمہوری مذاق سے بہت قریب تھے خصوصاً جو ردیفیں ذوق کی طبع زاد ہوتی ہیں وہ اکثر خاص و عام کی بول چال کے ان ہلکے کھٹکوں کو لیے ہوتی ہیں جنھیں ذوق اپنی چابک دستی سے کچھ اس طرح سانچے میں ڈھال دیتے ہیں کہ عامیت میں بھی نکھرا پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی ردیفوں میں بھی اردویت کا عنصر غالب نظر آتا ہے کبھی کبھی مومن کچھ جرأت کے زیر اثر کچھ ذوق کے اس انداز سے للچا کر ایسی ردیفیں اور زمینیں اختیار کرتے ہیں۔ ''تمھیں یاد ہو کہ نہ ہو''، ''کیا کیا نہ کریں گے'' ذوق کے جن اشعار کا انتخاب میں نے دیا ہے ان میں کئی کئی زمینیں اور ردیفیں جمہوری مذاق گفتگو سے ذوق کی قربت و مناسبت کا پتہ دیتی ہیں مثلاً ''محبت کے مزے''، ''محبت والے'' ''کوئی ہم سے سیکھ جائے''۔ ''ذرا دیکھیں تو''، ''محبت ہو تو ہو''، ''جھگڑے ہیں''، ''اس کو کہتے ہیں'' وغیرہ وغیرہ۔

ذوق کے اشعار سے ہمیں وہی فرحت ملتی ہے جو معمولی یا سطحی یا رسمی و روایتی باتوں کے کہنے میں غیر معمولی قوتِ اظہار کے مظاہرے سے ملتی ہے ایسے شعر عموماً ہمیں یاد تو رہ جاتے ہیں، ہمارے دماغ میں تو جڑ پکڑ لیتے ہیں لیکن دل میں جڑ نہیں چھوڑتے۔ آزاد نے دیوانِ ذوق مرتب کرنے میں کئی غزلوں پر اس قسم کے حاشیے دیئے ہیں کہ استاد کی طبیعت جوش پر تھی، لہر پر تھی ایسے میں کسی خاص موقعے پر یا خاص بات پر یہ شعر ہوا یا یہ غزل ہوئی یہ کہیں نہیں لکھا کہ استاد بہت مغموم تھے یا بہت نازک دور سے گزر رہے تھے یا گزر چکے تھے یا کوئی گہری کیفیت استاد پر طاری تھی یا کسی بات یا واردات یا خیالی سے ذوق متاثر ہوئے تھے تب یہ غزل ہوئی۔ آزاد نے ذوق کے بارے میں جو باتیں نہیں لکھیں وہ ان باتوں سے کم اہم نہیں ہیں جو باتیں انھوں نے ذوق کے متعلق لکھیں۔ آزاد اپنے اسلوب بیان سے ہمیں محو حیرت کر کے ہماری توجہ ان نفوی امور کی طرف جانے نہیں دیتے۔ ذوق کی طبیعت کن محرکات سے جوش پر آتی تھی یا لہراتی تھی؟ وہ محرکات تھے خود زبان کے محرکات۔ آزاد کا ان موقعوں پر مطلب یہ ہے کہ استاد کی طبیعت حاضر تھی۔ ذوق کی طبیعت کا جوش نشاط کسی بہت گہری کیفیت کا حامل نہیں ہوتا تھا نہ کسی بہت لطیف یا شدید احساس کا۔ پھر بھی ہم ان کے اشعار کی خوشگوار

سطحیت سے لطف اندوز ہو جاتے ہیں اور ہماری طبیعتیں بھی ذوق کی طبیعت کی طرح ان اشعار پر بار بار نہ سہی مگر کبھی کبھار تو ضرور لہرا اٹھی ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ذوق کے شعر لوگوں کو یاد ہیں، غالب کے شعر لوگوں کو یاد ہیں، میر کے شعر لوگوں کو یاد ہیں تو ہر فقرے میں یاد لفظ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ یاد کی تمامتر نوعیت اس میں ہے کہ کیسا یا کیسے یاد ہے۔ غالب کے مروّجہ اردو دیوان میں جتنے اشعار ہیں اس سے کہیں زیادہ اشعار ذوق کی تلف ہو جانے سے بچی ہوئی غزلوں میں ہیں۔ لیکن دیوان غالب چھوٹی سی چیز ہوتے ہوئے ایک بھری دنیا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات ذوق کے نسبتاً ضخیم دیوان میں نہیں۔ پھیلا ہوا خوشگوار پتلا پن ٹھوس چیز نہیں معلوم ہو سکتا۔ دور تک پانی کا چھڑکاؤ زمین پھوڑ کر بہنے والے چشمے سے مختلف چیز ہے۔

لیکن یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ذوق کے یہاں سرے سے سوجھ بوجھ کی باتیں نہیں ہیں یا ان کے دماغ میں کوئی اپنا خیال تھا ہی نہیں۔ روایتی اور پنچایتی خیالات کو جس زندہ شکل میں ذوق نے اپنایا ہے اور جس جاندار پنچایتی زبان میں ان کا اظہار کیا ہے وہ ایک مفکرانہ شان لیے ہوئے ہے پنچایت میں ہر پنچ پنچایتی معاملات اور باتوں میں یکساں زندہ دل نہیں ہوتا ذوق کی یہی انفرادیت ہے کہ وہ پنچایتی خیالات کے بولتے ہوئے نمائندہ ہیں۔ وہ ایک ممتاز سرپنچ ہیں۔ ذوق کے یہاں حیات و کائنات پر اخلاقیات پر جو اردو غزل کے مسلمات میں سے ہیں سب پر ہر طرح کے اشعار ملیں گے لیکن میر و غالب جب انہی موضوعات پر شعر کہتے ہیں تو ان کا اوراک جذبات اور شدتِ احساس سے بوجھل اور تھرتھراتا ہوا نظر آتا ہے آتش جب ان موضوعات پر زبان کھولتا ہے تو اس کے تخیل میں اس کی قوتِ ارادی لہراتی ہوئی نظر آتی ہے ذوق کے یہاں حیات، کائنات، اخلاقیات کے مضامین پر ہمیں کبھی بزلہ سنجانہ اور کبھی سنجیدہ انداز میں اظہارِ رائے ملتا ہے۔ یہ نظریت (Abstractness) اس لاطینی کلاسکیت کی خصوصیت ہے جسے ہم ذوق کے کلام کی صفت بتا چکے ہیں۔ معلوم نہیں ذوق نے کبھی عشق کیا تھا یا نہیں۔ معرکتہ آرا عشقیہ شعر کہنا تو درحقیقت "کرتے کی وڈیا" ہے لیکن حسن و عشق پر مروّجہ خیالات کے حامل اچھے اشعار ذوق نے کہے ہیں اور ہر شخص کی جنسی زندگی و نفسیات اسے کچھ تجربات تو کرا ہی دیتی ہیں۔ اصلیت یا واقعیت کی ایک ہلکی چاشنی ذوق کے کئی عشقیہ اشعار میں ہے۔ اس لیے ان کے اشعار بالکل بے کیف نہیں ہیں ان کے عشقیہ اشعار میں کہیں کہیں ایک ہلکا، بہت ہلکا سا اوچھا پن بھی ہے اور جذبات سے لبریز طنز کے بدلے کچھ پھبتی کا انداز بھی پیدا ہو گیا ہے۔ رائے عامہ کے درک سے لہک اٹھنے کا عالم

بھی تو ایک جذبہ ہے۔ ذوق کا کلام ایک دم نروس اور خشک نہیں ہے۔ اس میں جس قسم کی شگفتگی ہے وہ لکھنوی مدرسۂ شاعری کے اندازِ بیان کی پر تصنع شگفتگی سے جدا ہے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ ذوق سرے سے دلی کا شاعر ہی نہیں اور یوں تو شاہ نصیر کے دم قدم سے کچھ لکھنویت دہلی کی شاعری میں آ ہی چلی تھی مگر لکھنویت کئی چیزوں سے مرکب ہے۔ ناسخ کی خشک اور سوئی شاعری ہی کل کی کل لکھنویت نہیں ہے۔ انشا کی شوخی اور جرأت کی معاملہ بندی بھی اسی لکھنویت کی دین ہے اور اس شوخی و معاملہ بندی کی ایک ہلکی چاشنی ذوق کے کلام میں ہمیں ملتی ہے لکھنوی شاعری کا سلسلہ بھی دلی تک پہنچ جاتا ہے۔ شاہ حاتم اور سودا دہلوی شاعری کے شگون تھے۔ اور ذوق بقول اپنے ہی "سودائی" تھے نہ کہ "میری" اگرچہ "نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب" کہ کے میر کو سراہا بھی ہے۔

ذوق کا جب ہم اردو کے کچھ بڑے غزل گو شعرا سے موازنہ کرتے ہیں تو ذوق میں اور ان میں دل چسپ فرق نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً سودا سے ذوق بہت متاثر ہیں۔ سودا میر کے مقابلے میں زبان نمایاں طور پر رواں، سلیس اور نکھری ہوئی لکھتے ہیں اور ذوق ایسے زبان کے شاعر کو اس صفت کا بھا جانا لازمی تھا لیکن سودا کی آواز بھرپور ہے اور ذوق کی آواز رقیق ہے۔ سودا کی آواز کچھ بوجھل ہے اور اس لیے اس میں وزن ہے۔ ذوق کی آواز ہلکی پھلکی ہے۔ میر کے یہاں جو گھلاوٹ اور حلاوت ہے وہ ذوق کی رقاقت سے الگ ہے۔ میر کی سادہ غزلوں اور ذوق کی ان سادہ غزلوں میں جن کی بحریں چھوٹی ہیں نمایاں اور اہم فرق ہے "ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں"۔ "جان ہے تو جہاں ہے پیارے"۔ "سو تم ہم سے منہ ہی چھپا کر چلے" میر کی یہ اور ایسی ہی اور غزلیں ذوق کی "اسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا"۔ "تو پھر ہوتے ہیں رخصت ہم ابھی سے"۔ "تو نے مارا عناتیوں سے مجھے"۔ "وقت پیری شباب کی باتیں" والی غزلوں سے بالکل الگ چیزیں ہیں۔ سہل اور سادہ زبان کی روح اور معنی دونوں کے یہاں بدلے ہوئے ہیں۔ میر عنصری (Elemental) شاعر ہے۔ اس کی سادہ زبان میں وہ سوز و ساز ہے جو واقعیت کو ماورائیت کا درجہ دیتا ہے۔ درد کی سادہ اور نرم زبان ان کی روشن ضمیری سے جگمگا رہی ہے۔ اور سادھنا، ریاضت یا تہذیب نفس سے پیدا شدہ کسک سے چمک رہی ہے۔ مومن کی بھی وہ غزلیں جو بہت سادہ ہیں اور جن کی زبان ذوق کی زبان کی طرح سلیس ہے ذوق کی غزلوں سے بہت مختلف ہیں۔ غالب کا اسلوب یوں تو ذوق کے اسلوب سے بہت الگ ہے لیکن غالب کے سادہ اور سہل اشعار کے بے پناہ ہونے کا احساس ذوق کو بھی ذوق کے سادہ اشعار سے بالکل الگ چیزیں ہیں۔ غالب کے دماغ کی رگیں دل کی

رگوں کی طرح حساس ہیں۔ غالبؔ کے جذبات اور کلام میں ایک ارتکاز (Concentration) ہے۔ ایک نوک (Point) ہے اور ایک تیز دھار ہے۔ جو شعاعوں کی طرح چمکتی اور جگمگاتی ہے۔ ذوقؔ کی رقیق سادگی ان باتوں سے معرا ہے۔ غالب بڑا پاجی شاعر ہے۔ آپ غالبؔ کے رنگ میں کامیاب شعر کہیے۔ غالبؔ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا مگر آپ کا شعر خراب ہو جائے گا کیوں کہ غالب کی ترکیبوں اور غالبؔ کی زبان کا دھوکا آپ کے شعر پر ہوتے ہوئے بھی غالبؔ کے کلام کا نکیلا پن اور اس کی تیز دھار پیدا نہ ہو سکے گی۔ ذوقؔ کے رنگ میں کامیاب شعر کوئی کہے تو کچھ کہہ لے گا۔ ذوقؔ کی شاعری کے صناعیانہ حوبیوں کے انیسؔ قدر رداں تھے اور انیسؔ نے بھی سہل اور سادہ زبان کو اعلیٰ انشا پردازی کا معجزہ سادیا ہے۔ ذوقؔ کی زبان اور ذوقؔ کا اسلوب خارجی یا بیانیہ شاعری رزمیہ اور بزمیہ شاعری کے لیے بہت موزوں تھا۔ سلاست اور روانی میں پتھریلی اور ناہموار زمینوں کو پانی کر دکھانے میں ذوق سے پہلے مصحفیؔ نے کمال دکھایا ہے لیکن مصحفیؔ کے کلام کی اٹھلاہٹ، رسمساہٹ اور رنگینی ذوق کے یہاں نہیں ہے۔ ذوق کا کلام نہایت خوش سلیقگی سے کلپ کئے ہوئے کپڑے کی طرح ہے۔ ذوقؔ کے اشعار پر الفاظ کے لباس کا اتار (Fall) بہت تجل ہے۔ داغؔ ذوقؔ کے شاگرد ہی تھے اور استاد ہی کی ڈگر پر انھوں نے اپنے آپ کو ڈالا۔ لیکن سادہ بول چال کی زبان کو داغؔ نے ایسی شوخ و شنگ انگلیوں سے گدگدایا کہ اردو کی پسلیاں پھڑک پھڑک اٹھیں۔ داغؔ کے اسلوب کا نقش اوّل اگر کہیں ملتا ہے تو ذوقؔ ہی کے وہاں۔ آتشؔ اور شاگردانِ آتشؔ نے بھی زبان کو اسی طرح صاف اور رواں دواں کیا جیسے ذوقؔ نے۔ ہاں اس میں ایک خاص تیور اور بانکپن اور چستی سے پیدا ہونے والی روانی کا اضافہ بھی کر دیا۔

ذوقؔ کا نام ہم غالبؔ و مومنؔ کے نام کے پہلے لیں یا بعد لیکن ہم یہ نہیں کر سکتے کہ شہرت کی جولانگاہ میں غالب و مومنؔ تو آگے بڑھ گئے اور ہاں ذوقؔ بھی دوڑے (Also Ran) ذوقؔ کی زبان شاعری کا بابا آدم ہے۔ ذوقؔ کی شاعری جزویست از پیغمبری نہ سہی، ساحری نہ سہی، اس میں نشتریت نہ سہی، نمک نہ سہی لیکن ذوقؔ کی زبان میں جو شیرینی ہے اس سے انکار ممکن ہی نہیں۔ ذوقؔ کے کلام میں اردو نے اپنے آپ کو پایا۔ روایتی کر دینا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔ شہرت دوام کے دربار میں غالب و مومن کی صف میں ان کے برابر بلکہ مومن سے کچھ آگے زبان کی شاعری کے پختہ نمائندہ کی حیثیت سے بیٹھے اور دستارِ فضیلت زیبِ سر کئے ہوئے استاد ذوقؔ وہ نظر آرہے ہیں۔

☆ ☆ ☆

شمس الرحمٰن فاروقی

ذوقؔ کی غزل

وقار عظیم نے کہیں لکھا ہے کہ جب وہ الہٰ آباد یونی ورسٹی میں طالب علم تھے ایک بار ان میں اور ان کے ایک دوست میں بحث چھڑ گئی۔ وقار عظیم کو ذوقؔ بالکل پسند نہ تھے، لیکن ان کے دوست ذوقؔ کے بہت قائل تھے۔ وقار عظیم صاحب نے اپنے دوست سے کہا کہ اگر تم ذوقؔ کے کلام سے دو شعر بھی ایسے نکال دو جو مجھے پسند آجائیں انھیں شاعر مان لوں گا۔ آخر ایک دن رات کی محنتِ شاقہ کے بعد ڈھائی شعر ایسے دریافت ہوئے جنھیں وقار عظیم صاحب نے بھی پسند کیا۔ اس طرح بے چارے ذوقؔ شعرا کی فہرست سے خارج ہونے سے بال بال بچ گئے۔

اس واقعے میں اردو ادب اور اردو تہذیب کے طالب علم کے لیے عبرت کے بہت سے پہلو پوشیدہ ہیں۔ آخر ذوقؔ وہ شخص تھے جنھیں ان کے بہت سے معاصرین غالب اور مومن سے برتر مانتے تھے۔ اور جس وقت وقار عظیم صاحب الہٰ آباد میں طالب علم تھے اس وقت محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" کو شائع ہوئے کم و بیش ساٹھ سال ہوئے تھے۔ محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں لکھا تھا

> "کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اتارے ہیں، مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے انھیں ایسی شان و شکوہ کی کرسیوں پر بٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں۔ انھیں قادر الکلامی کے دربار سے ملک سخن پر حکومت مل گئی ہے کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں ان کے

مضمون کی باریکی کو ان کے الفاظ کی لطافت جلوہ دیتی ہے۔ انھیں اس بات کا کمال تھا کہ باریک سے باریک مطلب اور پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کر جاتے تھے گویا ایک شربت کا گھونٹ تھا کہ کانوں کے رستے پلا دیا ان کا مضمون جس طرح دل کو بھلا معلوم ہوتا ہے اسی طرح پڑھنے میں زبان کو مزا آتا ہے۔ ان کے لفظوں کی ترکیب میں ایک خداداد چستی ہے جو کلام میں زور پیدا کرتی ہے۔ وہ زور فقط ان کے دل کا جوش ہی نہیں ظاہر کرتا بلکہ سننے والے کے دل میں ایک خروش پیدا کرتا ہے۔ اور یہی قدرتی رنگ ہے جو ان کے کلام پر سودا کی تقلید کا پرتو ڈالتا ہے"۔

"آبِ حیات" اشاعت ۱۸۸۷ء (صفحہ ۴۸۷ تا ۴۸۹)

مندرجہ بالا بیانات سے یہ نکات اخذ ہوتے ہیں۔

(۱) ذوق کے ہاں مضامین بہت ہیں۔ بلکہ وہ مضامین کو نیا رنگ دے دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ مضموں آفریں ہیں۔

(۲) ذوق انتہائی قادر الکلام ہیں۔

(۳) وہ باریک سے باریک مضمون کو بھی نہایت صفائی سے ادا کر دیتے ہیں۔

(۴) ان کے کلام میں خوش آہنگی، روانی اور چستی ہے۔

(۵) ذوق نے سودا کی تقلید کی ہے۔

محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" کے چند سال بعد اپنا مرتب کیا ہوا "دیوان ذوق" شائع کیا اس میں بہت سے ایسے واقعات بھی درج کیے جنھیں وہ کسی باعث "آبِ حیات" میں جگہ نہ دے سکے تھے۔ مثلاً انھوں نے ایک جگہ لکھا (صفحہ ۱۲۵، اشاعت ۱۹۳۳ء) کہ ذوق نے ۱۸۵۱ء کے ایک مشاعرے میں غزل پڑھی، غالب، صہبائی، حکیم احسن اللہ وغیرہ موجود تھے۔ "غالب مرحوم، مولوی امام بخش صاحب اور اشخاص نے فرمائش کی کہ کوئی غیر طرح کی غزل ہی پڑھیے۔ سب نے بہت کہا تو میں (یعنی آزاد) ایک بیاض لیتا گیا تھا، وہ لے کر غزل مرقومۃ الذیل پڑھی تعریفوں کا غل تھا کہ دوسرا مصرع سنائی نہ دیتا تھا۔ در و دیوار بول

رہے تھے:

ہفتا دو دو فریق حسد کے عدد سے ہیں

ایک اور مشاعرے کا ذکر صفحہ ۱۷۴ پر ہے۔ یہ مشاعرہ ۱۸۳۹ء میں ہوا تھا۔ آزاد کے بقول "غالب آئے تو سلام و کلام ہوتے ہی بولے، استاد! آج تو جی چاہتا ہے آپ کچھ سنائیے۔ لیکن اس کے پہلے کہ غالب اور ذوق وغیرہ کے پڑھنے کی باری آتی، ذوق کو بادشاہ کا بلاوا آگیا۔ مجبوراً ذوق کو اسی وقت غزل پڑھ کر رخصت ہونا پڑا۔ ان کے اٹھتے ہی مشاعرہ برخاست ہوگیا۔ غالب وغیرہ کے پڑھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ آزاد لکھتے ہیں "یہ ادھر رخصت ہو کر حضور میں گئے، ادھر مشاعرہ برہم ہوگیا۔ ہر شخص یہ کہہ کر اٹھتا گیا کہ جو سنا تو سن لیا، اب چلو اور سو رہو"۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، آزاد کے ان بیانات کو بمشکل پچاس ساٹھ سال گزرے ہوں گے جب ہم وقار عظیم اور ان کے دوست کے درمیان مباحثہ آرائی دیکھتے ہیں، اور مباحثے کا موضوع ذوق کی شاعرانہ عظمت نہیں، بلکہ یہ سوال ہے کہ ذوق شاعر ہیں بھی کہ نہیں۔ آخر ان پچاس ساٹھ برسوں میں کیا دنیا اتنی بدل گئی تھی، کیا شاعری کے بارے میں لوگوں کے تصورات اور نظریات اتنے بدل گئے تھے کہ ان کی شعریات میں ذوق کی گنجائش ہی نہ تھی؟ یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ اس بحث میں ذوق کا قصیدہ مذکور نہیں۔ لہٰذا یا تو بحث صرف غزل کے بارے میں تھی، یا پھر دونوں ہی حضرات قصیدے کو بہر حال شاعری سے خارج گردانتے تھے۔ لیکن آزاد کی رائے جو میں نے نقل کی وہ تو غزلوں ہی کے بارے میں تھی، اور جن مشاعروں میں ان کے بقول ذوق نے غالب جیسوں کو بالکل پست کر دیا تھا وہاں بھی غزلیں ہی پڑھی گئی تھیں، تو پھر یہی کہنا پڑے گا کہ ۱۹۴۰ء آتے آتے زمانے کی ہوا اس قدر بدل گئی تھی کہ شاعری کے بارے میں ہمارے کلاسیکی مفروضات غلط یا مسترد ٹھہرے تھے اور ہماری کلاسیکی شاعری کا بڑا حصہ لغو اور لاطائل قرار پا گیا تھا۔ ذوق کے بارے میں محمد حسین آزاد کے بیانات مبالغہ نہیں، بلکہ سر تا سر غلط اور جھوٹ کے زمرے میں ڈال دیے گئے تھے۔ کیوں کہ مبالغہ تو بہر حال کسی نہ کسی حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔

ذوق کے خلاف اس رد عمل کی وجہیں معلوم کرنا کئی وجہوں سے ضروری ہے۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ رد عمل اب بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ یعنی ذوق کو بڑا غزل گو تو درکنار، اچھا غزل گو بھی کہنے والے آج بہت کم ہیں۔ رشید حسن خاں کہتے ہیں کہ مومن

اور غالبؔ کے مقابلے میں غزل گوئی کی حد تک ذوقؔ کا نام لینا بھی گناہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شاعری کے معیار اور مذاق کی یہ تبدیلی محض مرورِ ایام کا کرشمہ نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے پیچھے سیاسی اور تہذیبی اسباب ہیں جن کا پتا لگائے بغیر جدید اردو ادب کی ذہنی تاریخ مرتب نہیں ہو سکتی۔ تیسری بات یہ ہے کہ اگر کسی زبان کے شاعر اور نقاد اپنے گذشتہ سرمائے کے کسی حصے سے اس درجہ بدظن ہو جائیں کہ وہ اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھیں تو اس بات میں شک ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے پورے گذشتہ سرمائے کے ساتھ بھی انصاف کر سکیں گے۔

میں ذوقؔ کو بڑا غزل گو نہیں مانتا، چہ جائے کہ میں ذوقؔ کے بارے میں محمد حسین آزادؔ کی لن ترانیوں کو صحیح اور حق پر مبنی سمجھوں۔ لیکن کسی شاعر سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس شاعر کا عظیم ہونا ضروری نہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ بعض لوگ شاعری کو لطف اندوز ہونے کی چیز نہیں، بلکہ جوشاندہ یا نمک جالینوس کی طرح فائدہ مند بنانا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے میرا کوئی جھگڑا نہیں، میں تو شاعری کو لطف کی خاطر پڑھتا ہوں اور اگر مجھے ذوقؔ کے بہت سارے کلام سے لطف حاصل ہوتا ہے تو میں ذوقؔ کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن یہ سوال ضرور رہ جاتا ہے کہ مجھے ذوقؔ کی غزل میں لطف کیوں آتا ہے؟ کیا ذوقؔ میں ایسی کوئی انفرادیت ہے جس کی بنا پر اس کے کلام میں یہ صلاحیت ہے کہ لوگوں کو اس سے لطف حاصل ہو؟

انفرادیت کی بات میں نے اس لیے اٹھائی کہ ہمارے یہاں بی۔اے، ایم۔اے کے پرچوں میں یہ سوال اکثر آتا ہے - شاعر کی انفرادیت کی بات ہمارے مکتبی نقاد اس کثرت اور شدت سے کرتے ہیں کہ طالب علموں کے ذہن میں یہ بات بالکل جاگزیں ہو گئی ہے کہ انفرادیت عام طور پر عظمت نہیں تو خوبی کی ہم معنی ضرور ہوتی ہے، خاص کر جب معاملہ کسی کلاسیکی شاعر کا ہو۔ کیوں کہ جدید شاعر کی انفرادیت اینڈی بینڈی اور کاواک بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن کلاسیکی شاعر کی انفرادیت تو یقیناً بڑی باوزن اور مثبت چیز ہو گی۔ ہم لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ انفرادیت کا تعین پوری روایت ہی کی روشنی میں ہو سکتا ہے، اگر ہم روایت کے بعض بعض حصوں کو ہی لے کر انفرادیت کی تلاش میں نکلیں گے تو ہمیں ناکامی ہو گی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ غور کریں کہ جس روایت کی روشنی میں ہم انفرادیت کی تلاش کر رہے ہیں اس میں انفرادیت کا کوئی مقام یا تصور تھا بھی کہ نہیں۔ اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کے اعتبار سے تو ہر شاعر اپنے پیش رو اساتذہ کا محکوم تھا۔ اس روایت میں انفرادیت کا

مفہوم یہ نہیں تھا کہ شاعر اپنی شعریات الگ سے بنائے۔ وہاں تو تسلسل اور تواتر کی کار فرمائی تھی۔ خود محمد حسین آزاد نے ذوق کی زبان سے کہلایا ہے کہ آغازِ عمر میں "ہمارا عالم ہی اور تھا۔ جوانی دوانی۔ ہم کبھی جرأت کے رنگ میں، کبھی سودا کے انداز میں تھے"۔ (صفحہ ۴۵۹) محمد حسین آزاد نے آگے یہ بھی لکھا ہے (صفحہ ۴۸۴) کہ ذوق

> "میر، سودا، درد، مصحفی، سید انشا، جرأت سب کے انداز کو اپنے اپنے موقعے پر پورا پورا کام میں لاتے تھے، پھر بھی جاننے والے جانتے ہیں کہ اصلی میلان ان کی طبیعت کا سودا کے انداز پر زیادہ تھا"۔

لہٰذا ہماری کلاسیکی شاعری کی تہذیب اس بنا پر قائم تھی کہ شاعر ہر طرح کے انداز پر قدرت رکھتا ہو۔ مختلف طرح کے انداز کو کہیں بعض بعض شعرا کے نام سے منسوب کر دیا گیا تو کہیں عاشقانہ، صوفیانہ، بلند خیالی، معنی آفرینی، زور و شور وغیرہ کا نام دیا گیا۔ انفرادیت کا وہ تصور جو ہم نے مغرب سے مستعار لیا ہے وہ نہ اردو کی کلاسیکی شاعری میں ہے اور نہ سنسکرت میں۔ سنسکرت میں تو اس بات کو بڑی وضاحت سے کہا گیا ہے کہ شاعر کی خوبی یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی نئی بات کرے، بلکہ یہ ہے کہ وہ پچھلوں کی کہی ہوئی باتوں کو دوبارہ کسی اور انداز سے بیان کرے۔

تیسری بات یہ کہ مغرب میں بھی انفرادیت کا تصور دو طرح کا ہے۔ ایک تو وہ جو رومانی شاعروں کے زیرِ اثر رائج ہوا اور وہی ہمارے یہاں بھی کم و بیش رائج ہے۔ اور دوسرا قدیم تصور جسے ایلیٹ نے اپنے مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ ایلیٹ کہتا ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہی شاعر سب سے زیادہ منفرد قرار پائیں گے جنھوں نے اپنی روایت کے اندر رہ کر شاعری کی ہے۔ رومانی انفرادیت کے نئے تصور کو، جس سے ہماری تنقید ابھی پوری طرح باخبر نہیں ہے۔ ہیرلڈ بلوم Harald Bloom نے بیان کیا ہے۔ جیسا کہ وہ کہتا ہے "مضبوط شاعر بیک وقت ادبی تاریخ کا ہیرو بھی ہوتا ہے اور اس کا مظلوم شکار بھی"۔ انفرادیت کے موضوع پر اس مختصر بحث سے میرا مدعا یہ ہے کہ انفرادیت کا مسئلہ اتنا آسان اور سادہ نہیں ہے جتنا ہم لوگ سمجھتے ہیں۔ ہیرلڈ بلوم کے نظریات پر اعتراض کیا گیا ہے، لیکن اس کی اس بصیرت سے انکار بہت کم ہوا ہے کہ انفرادیت کا تعین اس لیے بہت مشکل ہے کہ ہر شاعر اپنے پیش رووں کا پابند بھی ہوتا ہے اور ان سے گریز بھی کرنا چاہتا ہے۔

اس نکتے کی روشنی میں ذوق کی غزل کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہیں۔ اور چوں کہ ذوق کی غزل سے لطف اندوز ہونے کی راہ بھی اس سے کھلتی ہے، اس لیے میں اسی بات کو آگے بڑھاتا ہوں۔ محمد حسین آزاد نے ذوق کے ساتھ بہت بڑی زیادتی یہ کی کہ انھوں نے ذوق کے بارے میں غیر معمولی توصیفی فقرے اس کثرت سے استعمال کیے کہ ان کو لامحالہ مبالغہ آمیز اور پھر جھوٹ سمجھا گیا۔ لیکن اس سے بڑی زیادتی محمد حسین آزاد نے یہ کی کہ انھوں نے آبِ حیات میں ذوق پر ان تمام لوگوں کے اثر کا ذکر کیا جن کے کلام سے ذوق کی غزل کو کوئی خاص علاقہ نہیں۔ اور اس شاعر کو چھوڑ دیا جس نے ان کے لیے شیر مادر کا کام کیا۔ یعنی آزاد نے میر، سودا، مصحفی، انشا، جرأت، ان سب کے تو نام گنوا دیے، لیکن ناسخ کو چھوڑ دیا۔ حالاں کہ ناسخ ہی ذوق کی اصل ہیں۔ اپنے مرتب کردہ دیوان ذوق میں آزاد نے جگہ جگہ ناسخ کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اس سے ذوق پر ناسخ کے اثر کا استنباط ہو سکتا ہے، لیکن وہاں بھی انھوں نے براہ راست اثر کی بات نہیں کی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں (صفحہ ۵۵) کہ شیخ ناسخ کا پہلا دیوان انھیں دنوں ہمارے یہاں آیا تھا۔ اس کی غزلوں میں سے کوئی مصرع لیتے تھے، اسی پر استاد غزل کہتے تھے۔ والد مرحوم لکھتے تھے عجب گلزار صحبت ہوتی تھی"۔ لیکن ناسخ کے اثر کی بات وضاحت سے بیان ہوتی بھی تو مشہور نہ ہوتی، کیوں کہ آزاد کا مرتبہ دیوان ذوق بہت مقبول نہ ہوا، اور "آبِ حیات" کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ بقول شخصے آج بھی اردو شاعروں کے بارے میں کوئی تنقیدی رائے ایسی نہیں ہے جس کی اصل "آبِ حیات" میں تلاش نہ کی جا سکتی ہو۔ اگر محمد حسین آزاد نے ناسخ اور ذوق کی مماثلت کا ذکر "آبِ حیات" میں کر دیا ہوتا تو ممکن ہے کہ آیندہ نسلوں کا تاثر ذوق کے بارے میں کچھ دوسرا ہوتا۔ لیکن پھر بھی شاید ذوق نقصان ہی میں رہتے، کیوں کہ خود ناسخ کا بازار بیسویں صدی کی چھوتھی دہائی آتے آتے بالکل سرد پڑ چکا تھا، اور آج بھی یہ عالم ہے کہ اکثر لوگ، جو ذوق کو معمولی یا خراب شاعر کہیں گے، وہ ناسخ کو خراب تر شاعر کہیں گے۔ خود پروفیسر شبیہ الحسن، جنھوں نے اپنی زندگی کا خاصا حصہ ناسخ کے مطالعے میں گزارا ہے، وہ یہ فرماتے ہیں کہ آج کے زمانے میں ناسخ کی کوئی اہمیت نہیں۔ رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ "کلام ناسخ کا ایک حصہ آج اپنی ساری دلکشی کھو چکا ہے"۔ لہٰذا جب خود ناسخ کا مرتبہ اس قدر مشکوک ہو چکا ہے تو ذوق بے چارے کا کیا پوچھنا ہے۔

لیکن اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ ذوق کی غزل کی کلید ناسخ کی غزل میں ہے۔ مجموعی حیثیت سے ناسخ کا مرتبہ ذوق سے کچھ بلند ٹھہرتا ہے، لیکن ذوق کے یہاں ایک آزاد تنوع اور

پر بہار تجرباتی فضا ملتی ہے جو انھیں ناسخ سے ممتاز بھی کرتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ذوق پر ناسخ کے اثر کا ذکر کیا ہی نہ گیا ہو۔ سب سے پہلے تو میرے خیال میں صفیر بلگرامی غالب کی زبان سے کہتے ہیں

> "ناسخ کے کلام نے دہلی میں آکر سب کو حیران کر دیا یہاں تک کہ شعرا نے ادھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس وقت ہم تین شاعر باندا ق نام بر آوردہ تھے میں (یعنی غالب) اور مومن خاں اور ذوق۔ ذوق نے ادھر کم رغبت کی، کیوں کہ ان کو اپنے مضمون ہی کے باندھنے میں دقت پڑتی تھی، زبان کی طرف کب خیال کر سکتے تھے"۔

چند در چند وجوہ کی بنا پر میرا خیال ہے کہ صفیر بلگرامی نے غالب کی گفتگو (اگر صفیر اور غالب میں ہوئی بھی) بالکل درستی سے نہیں بیان کی ہے۔ لیکن اس بیان سے یہ بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ صفیر بلگرامی کے خیال میں ذوق، غالب اور مومن تینوں نے ناسخ سے اثر قبول کیا لیکن چوں کہ ذوق کم صلاحیت شخص تھے، لہٰذا وہ کچھ زیادہ متمتع نہ ہو سکے۔ عبدالسلام ندوی نے "شعر الہند" (۱۹۲۶ء) میں بہ وضاحت لکھا ہے کہ ذوق اور ناسخ ایک ہی طرح کے شاعر ہیں۔ اور اسی بنا پر انھوں نے ذوق کو "لکھنویت" کی طرف مائل دکھایا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ناسخ نے ذوق کو کیا دیا؟ اور ناسخ کے علاوہ ذوق کے پاس کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ناسخ کے پورے کلام کا محاکمہ ضروری ہے، اور اس کا یہاں محل نہیں۔ لیکن مختصراً یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ناسخ کے کلام میں جو شخصیت نظر آتی ہے وہ عدمِ انفعالیت اور ظرافت کی بنا پر اردو شاعری میں بے نظیر ہے۔ ان کی عدمِ انفعالیت انھیں ہر قسم کا مضمون اختیار کرنے کی بے راہ روی بھی سکھاتی ہے اور اسی وجہ سے وہ اس الزام کے مورد بنتے ہیں کہ انھوں نے غزل میں بے جان اور بازاری مضامین داخل کیے۔ لیکن اسی عدم انفعالیت کی بنا پر ان کے کلام میں ایک طرح کا حاکمانہ انداز بھی ہے۔ ناسخ کو کوئی بھی بات کہنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ ان کے یہاں کوچہ و بازار کی سی چہل پہل ہے۔ ان کے کلام کی نمایاں صفت مضمون آفرینی ہے۔ مضمون کی تلاش میں وہ اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ جو مضمون انھوں نے حاصل کیا ہے اس میں ندرت صرف اس بات کی ہے کہ ایسا مضمون اب تک کم بندھا ہے یا نہیں بندھا ہے، یا اس بات کی کہ اس مضمون کی بنا پر لسانی اظہار یا انسانی تجربے کے کسی تازہ پہلو سے آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ ناسخ کا دماغ چوں کہ چھوٹا ہے

اس لیے اکثر چھوٹے ہی مضمون ان کی گرفت میں آتے ہیں، یا پھر وہ اس مضمون کو پوری طرح نبھا نہیں پاتے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود ناسخ کے کلام میں ہما ہمی، عدم انفعالیت، لہجے کی، بلکہ آواز کی بلندی، ظرافت اور خوش طبعی اور کہیں کہیں اعلیٰ مضمون آفرینی کی کار فرمائی اس درجہ ہے کہ انھیں اوسط سے بہت بہتر اور عام سے بہت زیادہ دل چسپ شاعر کہنا پڑتا ہے۔ بعض بعض پہلوؤں سے ناسخ کو آتش پر فوقیت حاصل ہے۔ اور ناسخ کے کلام میں کوئی ایسا عیب نہیں ہے جو آتش کے یہاں اسی شدت سے، بلکہ اس سے زیادہ شدت سے نہ ملتا ہو۔ خاص کر مضمون کی بے لطفی میں دونوں ایک دوسرے کا جواب ہیں۔ اور آتش جس دھوم دھڑکے سے شعر کہتے ہیں لیکن بات کچھ نہیں کہتے، وہ عالم ناسخ کے یہاں بھی ملتا ہے۔ لیکن ناسخ کے کلام میں براہ راست انسانی تجربے کی جگہ رسومیاتی تجربہ اور احساس جس سچائی اور پختگی سے بیان ہوا ہے وہ مضمون آفرینی کی تمام شرطیں پوری کرتا ہے، آتش اس معاملے میں ناسخ سے بہت پیچھے ہیں۔

ذوق نے ناسخ سے کیا حاصل کیا، اس کا مطالعہ کرنے کے لیے بہت دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ناسخ اور ذوق کی صرف ہم طرح غزلوں کا محاکمہ کافی ہے۔ محمد حسین آزاد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوق نے ناسخ کی غزلوں پر غزلیں در جواب آں غزل کے انداز میں کہیں تھیں۔ مثال کے طور پر ایک ایک دو دو شعر پیش کرتا ہوں

ناسخ مرتبہ کم حرص رفعت سے ہمارا ہو گیا

آفتاب اونچا ہوا ایسا کہ تارا ہو گیا

ذوق نام یوں پستی میں بالا تر ہمارا ہو گیا

جس طرح پانی کنویں کی تہ میں تارا ہو گیا

دونوں شعر تمثیلی انداز کے ہیں۔ ناسخ کے یہاں "حرص رفعت" کی ترکیب زیادہ دل کش نہیں ہے، کیوں کہ یہاں حرص" سے زیادہ "ہوس" کا محل تھا۔ لیکن ناسخ کی دلیل انتہائی تازہ اور استعارہ و پیکر دونوں پر مبنی ہے۔ ذوق نے ناسخ کے مضمون کو پلٹ دیا ہے، اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ مضمون اب غزل کے رسومیاتی دائرے کے بالکل بیچ میں آگیا۔ کیوں کہ عاشق کی رسوائی ہی اس کی توقیر ہے۔ اس کے برخلاف، ناسخ کے مضمون پر اخلاقی رنگ غالب ہے، اس لیے وہ غزل کی عام رسومیات سے ذرا دور جا پڑا ہے۔ ذوق نے "جس طرح"

کا فقرہ لگا کر دلیل کی چستی کم کردی ہے، لیکن اس کم زوری کو انھوں نے خود دلیل کی ندرت سے سنبھال لیا ہے۔ ان کی دلیل محاورے یعنی استعارے پر قائم ہے اور اس میں قولِ محال کا رنگ اس پر مستزاد۔ انسانی زندگی کا براہ راست یا ذاتی تجربہ دونوں کے یہاں نہیں ہے، لیکن اس کی انھیں ضرورت بھی نہیں۔ ناسخ نے ایک شعر میں خود پر ہنسنے یا اپنے ماتم کے پردے میں ایک تازہ بات کہنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔

ایک درہم اور داخل گنجِ قاروں میں ہوا
پست ایسا میرے طالع کا ستارہ ہو گیا

"طالع" کے ساتھ "ستارہ" کی رعایت بھی خوب ہے، خاص کر جب اسے "پست" کہا جائے، اور گنج قاروں کی تلمیح اور پست ستارے کو درہم سے تشبیہ دینا بھی نہایت عمدہ ہے۔ اس سب کے باوجود شعر میں ماتم محزونی کا کوئی شائبہ نہیں، اور نہ ہی اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ دردانگیزی یا سوز و گداز وغیرہ پیدا کیا جائے۔ ذوق نے اس مضمون کو ہاتھ نہیں لگایا لیکن آفتاب کے تارا بن جانے والے مضمون میں نیا پہلو نکالنے کی کوشش مندرجہ ذیل شعر میں ضرور کی ہے۔

ظلمتِ عصیاں سے میری بن گیا شب روزِ حشر
آفتاب اک نیزے پر دم دار تارا ہو گیا

اس شعر میں طباعی کار فرما ہے، طباعی دراصل Wit کا منطقہ ہے۔ اس طرح کے شعر کی خوبی اس وقت آشکار ہو سکتی ہے جب ہم ہندایرانی شاعری یا کم سے کم سترہویں صدی کی انگریزی Metaphysical شاعری سے واقف ہوں۔

ناسخ سے مضموں آفرینی کے انداز سیکھ کر آخری زمانے میں ذوق نے وہ بے اعتدالی ترک کردی جو ناسخ کی غزل کو ناہموار بناتی ہے۔ ۱۸۵۲ء کی جس غزل کا ذکر محمد حسین آزاد نے کیا ہے اس کے چند اشعار دیکھتے ہیں۔

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

پہلا مصرع جتنا بھرپور اور ذہانت پر جس قدر مبنی تھا، اس کے مقابلے میں دوسرا مصرع نہ

صرف بے جوڑ ہے بلکہ شعر کو دو لخت بنا رہا ہے، ایسے پیش مصرع پر مصرع لگانا تو غالب یا میر ہی کے بس میں تھا۔ لیکن ذوق نے دوسرا ہی شعر ایسا کہہ دیا ہے کہ سب کمی پوری ہو گئی

مردار ہیں وہ طائر سدرہ ہی کیوں نہ ہوں

تیرِ نگاہِ یار کی جو دور زد سے ہیں

سودا کے مضمون سے مضمون بنایا ہے، لیکن بہت آگے لے جا کر۔ "مردار" کا لفظ کیا بہ لحاظ روزمرہ، کیا بہ لحاظ استعارہ، اس قدر تازہ اور غیر متوقع ہے اور اس قدر پر معنی بھی کہ یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ لوگ عام طور پر اسے غزل کا لفظ نہ قرار دیں گے۔ غیر متوقع لفظ کی تلاش میں ناسخ بھونڈے پن میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں اور ذوق کا بھی ادائلی کلام اس عیب سے بالکل بری نہیں۔ لیکن عمر کا اخیر آتے آتے ذوق کے وہ بل نکل گئے تھے اور ان کا انتخاب لفظ پوری طرح کامیاب اور سڈول ہو گیا تھا۔ اسی غزل میں ردیف کا بھرپور استعمال دیکھیے

جاں دادگانِ عشق سے پوچھو رہِ فنا

اس میں جناب خضر ابھی نابلد سے ہیں

خضر کی مناسبت سے پوچھنا اور وہ بھی ان لوگوں سے جو اپنی جانیں دے چکے ہیں، بہت خوب ہے۔ اور "نابلد سے ہیں" میں وہ طنز ہے جو Understatement سے پیدا ہوتا ہے۔
آخری ہی زمانے کی ایک اور غزل کے شعر ہیں

چرخ پر نورِ قمر راتوں بڑھے راتوں گھٹے

حسن تیرا روز بروز اے ہلال ابرو بڑھے

"راتوں" اور "روز" کی مناسبت، دونوں مصرعوں کی برابر برجستگی اور "ہلال ابرو" کا حسن، جس کے ساتھ "نور قمر" کا تضاد اور بھی دلچسپ ہے، اس شعر کو ناسخ کے مندرجہ ذیل شعر کا جواب سمجھیے

حسن جاناں ایک عالم پر رہے ممکن نہیں

یاں کمی بیشی رہا کرتی ہے نور ماہ میں

ناسخ کے یہاں جراُت مندی ہے اور ذوق کے یہاں رومانی رسومیت۔ لیکن ذوق کے دوسرے

مصرعے کو دعائیہ فرض کیجیے تو معنی کا ایک اور پہلو نکلتا ہے جو ناسخ کے یہاں مفقود ہے۔
مندرجہ ذیل شعر میں ذوق نے ناسخ کے رنگ کی ظرافت برتی ہے

کچھ تپ غم کو گھٹا کیا فائدہ اس سے طبیب

روز نسخے میں اگر خرفہ بڑھے کا ہو بڑھے

آثر لکھنوی نے لکھا ہے کہ ذوق کے معاصرین انھیں روز مرہ و محاورے کا بادشاہ مانتے تھے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو، لیکن میرا خیال ہے ذوق کی اہمیت اور خوبی کا راز محض روز مرہ اور محاورے پر قدرت میں تلاش کرنا غلط ہوگا۔ روزہ مرہ اور محاورے پر مبنی شاعری میں زیادہ طاقت نہیں ہوتی، کیوں کہ اس میں نہ استعارے کا وزن ہوتا ہے اور نہ فکر کا۔ ذوق نے کئی طرح کے رنگ آزمائے، ان کا تنوع اور ان کا ارتقا دونوں غزل کے طالب علم کے لیے قابلِ غور ہیں۔ ذوق کی غزل کو غالب کی ضد کے طور پر پڑھنے کا نتیجہ مایوس کن ہوگا، اسے خود اس کی شرائط پر پڑھنا چاہیے۔ اور ان میں پہلی شرط یہ ہے کہ شاعری کو ہر طرح کے لفظ کے اظہار کی قدرت مانا جائے، اور غزل کی شاعری ردیف و قافیہ کے ساتھ مضمون کو نبھانے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس آخری بات کی دلیل میں ذوق کا ایک مقطع پیش کر کے رخصت ہوتا ہوں

خدنگ یار مرے دل سے کس طرح نکلے

کہ اس کے ساتھ ہے اے ذوق میری جان لگی

جان نکلنے اور نہ نکلنے کا مضمون قافیے کے بغیر نہ حاصل ہوتا، لیکن یہ مضمون خدنگ یار کے دل میں پیوستہ ہونے کے پیکر سے الگ ہو جائے تو قافیہ دو کوڑی کا ہو جاتا ہے۔ اور ''جان'' کے ساتھ ''لگی'' کی ردیف نبھانا اپنی جگہ الگ کرشمہ رکھتا ہے۔

محمد ذاکر

ذوقؔ کی غزل

محمد حسین آزادؔ کی سی عقیدت کوئی کہاں سے لائے کہ ذوقؔ کی غزل پر آب حیات برسائے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر اس کی عظمت کا لاریب نقش بٹھائے۔ بہر حال۔

آیئے پہلے یہ دیکھیں ذوقؔ تھے کون، اور کیسی تھی ان کی شخصیت -- پورا نام ان کا شیخ محمد ابراہیم، پیدائش ان کی ۱۲۰۴ھ / ۱۷۸۹ء میں دلی میں ہوئی اور وفات بھی وہیں دلی میں ۱۲۷۱ھ یعنی ۱۸۵۴ء میں۔ محمد حسین آزادؔ ان کے شاگردِ سعادت مند، ممتاز تذکرہ نگار کہتے ہیں وہ سپاہی زادے تھے۔ آپ ایک امیر کی ڈیوڑھی کے پہرہ دار کا بیٹا سمجھیے۔ گویا ایک ایسا فرد جس کے خاندان میں علم یا علم پروری کی کوئی خاص روایت ابھی تک سامنے نہیں آئی؛ ایسا فرد جسے یہ ناز اور زعم نہ تھا کہ اس کے پرکھوں نے پشت ہا پشت تک ہفت اقلیم پر حکومت کی تھی۔ اور ذوقؔ کا زمانہ بھی وہ کہ سماج میں طبقہ بندی قائم، طبقۂ اشرافیہ اور صاحبان تمول کا اعزازی بھرم بدستور۔ آج بیسویں صدی کے اواخر میں برابری اور مساوات کی نعروں اور اعلامات کے زمانے میں کتنوں کو برابری کے واقعی برابر مواقع حاصل ہیں، پھر اس زمانے کا تو ذکر ہی کیا۔ ہر شخص راہِ طریقت اختیار کر کے سجادہ نشین صوفی بھی نہ ہو سکتا تھا کہ لوگ واقعی طمانیتِ قلب یا کسی ذاتی مصلحت کی وجہ سے اس کے آگے سر جھکا دیتے اور اس طرح اسے سماج میں عزت کی جگہ مل جاتی۔ معمولی تجارت اتنا باعزت پیشہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لشکری یا فوجی پیادے کی توقیر کب رہی تھی، آخر آخر وہ احدی ہو چکا تھا اور اب احدی لفظ ہی سست اور کاہل کا مترادف ہو چکا تھا۔ سماج میں اپنی منفرد و ممتاز جگہ بنانے کے لیے معمولی گھرانے کا آدمی کیا کر سکتا تھا بجز اس کے کسی صنعت و ہنر میں مہارت حاصل کر کے شاہان "الاتبار یا صاحبان ذی شان و اقتدار کی نگاہوں میں موقر ہونے کی کوشش کرتا۔ ہنر پروری

کے لیے بہر حال فراغت و تمول درکار ہے۔ اس زمانے میں شاعری ایک ایسا ہی ہنر، ایک ایسی ہی صنعت تھی جس کے ذریعے اہلِ وقار اور شرفاء و روٴسا کی ہم نشینی اور اس طرح سماج میں قدر و منزلت حاصل ہو سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس زمانے یعنی انیسویں صدی کے وسط تک شاعری سے شغف کو، نمایاں طور پر اردو کے شہری معاشرے میں، تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھا جاتا تھا اس حد تک کہ ہر خاص و عام چاہے شعر نہ بھی کہے مگر شعر و سخن سے دل چسپی کے اظہار کو اپنے لیے ضرور سا سمجھتا تھا۔ خواص کے ہاں مشاعرے عام تھے جن میں عام لوگ بھی ادب کے ساتھ مگر برابر کی حیثیت سے شریک ہوتے اور دادِ سخن دیتے لیتے۔ چناں چہ مکتبی تعلیم کے دوران شیخ محمد ابراہیم شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ وہ بچپن میں دعائیں مانگتے تھے کہ مجھے شعر کہنا آ جائے۔ مکتب کے استاد کا تخلص 'شوق' تھا، انھوں نے ذوق اختیار کر لیا۔ شاعری فنِ لطیف ہے اور شعر گوئی کی طرف یہ رغبت ذوق کی شرافتِ نفس کی دلیل ہے۔ مگر انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں شعر گوئی کو اپنی طبیعت کا غالب رجحان نہ بننے دیا جس سے ان کے فطری جذبہٴ شعر گوئی کی کم شدتی کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ یہ بات ہم نے اس لیے کہی کہ سچی شاعری بنیادی طور پر ایک طرح کا اندرونی جوش ایک فطری ابال، ایک سرکش جذبہ چاہتی ہے۔

ذوق نے اپنے شوق اور محنت و کاوش سے مروّجہ علوم مثلاً نجوم و طب و تاریخ وغیرہ میں دستگاہ بہم پہنچائی جو ان کی قصیدہ گوئی میں زیادہ کام آئی۔ فن شعر میں مشق و مزاولت سے قصیدہ گوئی سے مل کر انھیں مغل دربار سے، جیسا بھی وہ تھا، "خاقانیٴ ہند" اور "ملک الشعراء" کے خطابات دلوائے اور انعام میں گاؤں بھی۔ مگر طبعاً ذوق زر و مال و جاہ کے طلب گار نہ تھے۔ ایک شعر ان ہی کا ان کے حسب حال ہے

ہے لوثِ حُبِّ زر سے یہ دامن ہمارا پاک
گر چھینٹ بھی پڑے تو بحدِ درم نہیں

وہ تو بس مہذب رہتے ہوئے دلی میں موقر و محترم رہنا چاہتے تھے۔ وہ قناعت اور اپنے دیار سے محبت کے قائل بلکہ عامل تھے۔ اپنی گلیوں سے پیار ہی تو تھا کہ باوجود مختلف درباروں کے بلاوں کے وہ دلی چھوڑ کر نہیں نکلے۔ سادگی اتنی کہ کہتے ہیں ان کی املاک میں متعدد مکانات تھے مگر وہ خود عمر بھر ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے رہے۔

یہ اور یاد رہے کہ وہ دیندار بھی پکے تھے۔ روایت یہ بھی کہتی ہے کہ ان کے مسودوں میں اکثر غزلوں پر 'ہوالعلی' یا 'یا علی مدد' ان ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ذوق کے مسلک پر اس شعر سے روشنی پڑتی ہے

اے ذوق نہ کر نور میں آمیزش ظلمت

کیا کام تبرّے کو محبت میں علی کی

جہاں تک قدو قامت اور خط و خال کا تعلق ہے ان کا قد درازی میں انگشت نمانہ تھا، بس میانہ قد سمجھیے۔ خوش شکل و وجیہہ بھی نہ تھے کہ بچپن میں چیچک کے حملے سہہ چکے تھے۔ رنگت بھی کھلتی چمپئی نہ تھی۔ البتہ آنکھیں تیز اور روشن تھیں اور آواز بلند اور خوش آیند۔ کھیل کود، تفریح سے رغبت کی شہادت بس اس قدر ملتی ہے کہ بچپن میں ایک پتنگ کے لیے وہ درخت پر چڑھے تھے اور گر پڑے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی روایت بھی اب تک ایسی نہیں ملی جس سے پتا چلتا ہو کہ انھیں کسی سے والہانہ لگاؤ ہوا ہو یا انھوں نے اپنی کسی بن بیاہی یا شادی شدہ عزیزہ سے عشق کیا ہو یا انھوں نے کسی ستم پیشہ ڈومنی کو مار رکھا ہو، یا دوسری طرف اپنا مشاہرہ بڑھوانے کے لیے ہاتھ پیر مارے ہوں یا دوسروں کے حق سے زیادہ اپنا حق جتایا ہو یا اپنی ضرورت یا کسی ذاتی شوق کے لیے مہاجن ساہوکار سے قرض لیا ہو جس کی ادائیگی کی فکر ان کے لیے سوہانِ روح بن گئی ہو۔ زیادہ کی تمنا تو انھوں نے نہیں کی البتہ قلعہ معلیٰ سے ملنے والے مشاہرے کی قلت کا احساس انھیں ضرور ہوتا ہوگا۔ غالباً اسی وجہ سے ایسا شعر انھوں نے کہا ہوگا

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے

اے کمال افسوس ہے، تجھ پر کمال افسوس ہے

مختصر اً ذوق زندگی سے کچھ زیادہ کے طلب گار نہیں تھے؛ نہ خدا سے شکوہ نہ بندوں سے شکایت۔ وہ منکسر المزاج تھے، خدا ترس تھے، سب کا بھلا چاہنے والے، دعا میں ہمسائے کے یار بیل کو بھی یاد رکھتے۔ طبیعت میں سلامت روی، سب کے لیے نیک خواہش، مرنجان مرنج۔ بس ان کی عمر بھر کی ایک کمائی تھی شعر گوئی اور اسی پر ان کو ناز تھا۔ مگر قسمت یہ کہ ان کا پورا کلام بھی ہم تک نہیں پہنچا۔ تحقیق کہتی ہے کہ ان کا کچھ نہ کچھ کلام تو ضرور بہادر شاہ ظفر کے کلام میں شامل ہو گیا۔ بہر حال استاد و شاگرد کا معاملہ ہے وہاں طے کر لیں گے جہاں

نامۂ اعمال بے کم و کاست یا پوست کندہ پیش ہو گا۔ اس کے علاوہ پورا کلام ہم تک پہنچتا بھی کیسے۔ غزل کے مسودے تکیے کے غلاف میں بھر دیتے، کبھی مٹکے تھلیا میں۔ وفات کے بعد شاگردوں نے کلام ترتیب دینا شروع کیا۔ کام پورا نہ ہوا تھا کہ غدر ہو گیا۔

بہر حال شاعری ہی ان کا ذریعۂ معاش تھا، ذریعۂ عزت بھی اور وجہِ افتخار بھی۔ سوز آرزو اور بیتاب تخلیقی جذبے کی سرکش اکساہٹ ان کی شاعری میں کم ہو تو ہو ان کی شعر گوئی کا محرک و مقصود یہی تھا اور انھوں نے اپنے لیے سماج میں جو جگہ بنائی وہ کسی خاندانی وجاہت و حشمت کی وجہ سے نہ تھی، نہ دنیا کے پیچھے پڑے رہنے سے بلکہ اپنے ذاتی علم و فضل، اپنی سلامت روی اور اپنی ریاضت و مشق کی بنیاد پر شعر گوئی کر کے اور اس میں کمال حاصل کر کے۔ اس کی وجہ سے جیسا کہ اوپر کہا گیا وہ بادشاہِ وقت اور شہزادوں کے کلام کی اصلاح پر مامور ہوئے اور وظیفہ پایا۔ یہی وجہ ہے کہ فن میں لیاقت اور کمال دیکھنے دکھانے کی بات آن پڑتی تو وہ سینہ سپر ہو جاتے۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے استاد شاہ نصیر سے بھی وہ اس معاملے میں نہ چوکتے۔ یہی وجہ تھی کہ مغل شہزادے کا سہرا کہنے کے سلسلے میں مرزا غالب سے قلمی نوک جھونک بھی ہوئی تھی اور غالب کو اپنے مخصوص انداز میں معذرت، یا غالب ہی کے الفاظ میں احوالِ واقعی پیش کرنا پڑا تھا۔

بہر حال، یہاں بات قصیدے اور سہرے کی نہیں بلکہ ان کی غزل کی کرنی ہے۔ مگر ان سب باتوں سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کس قماش کے آدمی تھے ذوق۔

اب ذرا غزل کو بھی دیکھیے۔ یہ وہ صنفِ سخن تھی جو روایت در روایت ذوق تک پہنچی تھی۔ بنیادی طور پر اس کا ایمائی انداز اور اس کے رموز و علائم کی لچک ہی تھی کہ ہر دور میں ہر طرح کے مضامین کو یہ اپنے دامن میں سمیٹتی رہی اور اسے قبولِ عام حاصل رہا۔ بحور و اوزان سے صرفِ نظر کریں اور اس کے موضوعات و مضامین پر نظر رکھیں تو اس میں حسن و عشق کی باتوں کی فراوانی نظر آتی ہے، کہیں وصل کی مگر زیادہ تر محرومی اور ہجر کی، حسن کے بے التفاتی، بے رخی بلکہ سفاکی کی، کہیں عشقِ حقیقی کی اور کہیں رندی و ہوسناکی کی بھی، اور کہیں تصوف و اخلاق، وعظ و پند اور دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری اور انسانِ ضعیف البنیان کی مجبوری و لاچاری کی۔ اس میں تصویر کشی تھی، مناظر کی بھی، جذبات کی بھی، خیالات کی بھی اور 'معاملات' کی بھی۔ ۱۸ویں صدی کے نصف اوّل میں اس میں ایہام گوئی رہی تھی اور ہندوستانی بوباس بھی در آئی تھی۔

ذوقؔ تک پہنچنے سے پہلے میر دردؔ نے غزل میں ایک خاص انداز پیدا کیا تھا جو جذبے کے خلوص، احساس کی شدت اور بالعموم متین لہجے اور سیدھی تچی نرم نرم زبان کے برتنے سے عبارت تھا۔ اس میں مضمون کی اولیت، دل گداختگی اور بے تکلف اظہار شرطِ اوّل تھی۔ میر کے ہاں تو بالخصوص شعر کی تاثیر ایک مستقل دھیمی دھیمی آنچ سی بن جاتی۔ مگر ذوقؔ سے پہلے ہی سودا نے اس میں وہ خارجیت کی لے بھی نمایاں کر دی تھی جس میں دلی جذبات کی گرمی کم تھی اور جو ذوقؔ کے زمانے میں لکھنؤ میں زبان کی تراش خراش اور صفائی کے ساتھ مل کر ایک خاص نہج پر پہنچ رہی تھی اور وہاں ناسخ و آتش کے ہاتھوں شعر کی زبان کے لیے ضابطے بھی بن رہے تھے۔ اس خارجیت کو آسانی کے لیے جذبے کی شدت اور دل کی تڑپ کے مقابلے میں کسی کیفیت کے بیان برائے بیان سے، اور آگے بڑھ کر زبان میں صنعت کاری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور آگے بڑھیں تو حسن کے بیان میں لوازماتِ حسن زیادہ نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ اس خارجیت میں دلی جذبات کے بے ساختہ اظہار کے مقابلے میں شعر کا ظاہری عیوب سے پاک ہونا شرط ٹھہرا تھا۔ شعر کی تاثیر اور دل نشینی سے اتنا سروکار نہ تھا جتنا الفاظ کی بندش اور اس کی چستی سے۔ اس میں مناسبتِ الفاظ سے بات آگے بڑھتی ہے اور لفظ کو لفظ سجھانے لگتا ہے حد تو یہ ہے کہ مومن اپنی نازک خیالی کے باوجود اپنے تخلص کی رعایت سے مقطع کہہ جاتے ہیں اور آتش اپنے بانکپن کے باوجود اپنے تخلص کی رعایت سے آب کے تلازمے باندھنے لگتے ہیں۔ روایتی اور رسمی مضامین کی وجہ سے غزل گوئی ایک صنائی سی ہو گئی تھی، ایسی مرصع زیور سازی ہو گئی تھی جس میں ہر نیا غزل گو پرانے نمونے کی نقل کرتا۔ اگر مضمون سے اس کی طبیعت کی مطابقت نہ ہوتی یعنی جذبہ سچا یا خلوص نہ ہوتا تو شعر شعر محض رہ جاتا، پھسپھسا، کمزور محض بھرتی کا۔ مگر چوں کہ انسانی جذبات تو ہمیشہ سے وہی ہیں اور دوسرے سننے والے اصل فضا سے مانوس ہوتے اس لیے اس سے اتنے ہی محظوظ ہوتے جتنا باسی کھانے کو ذرا سا نون مرچ لگا کر بھون بھان کر کھانے سے۔ صاحبِ کمال بلکہ یہ کہیے کہ 'استاد' کہلانے کے لیے ضروری یہ تھا کہ اس کا کہا ہوا اصل سے مماثل ہو مگر ساتھ ہی کسی صنعت گری سے اس کا امتیاز بھی جھلکتا رہے۔ ظاہر ہے کہ فنِ شعر میں لیاقت، اور اس فن سے متعلق کثیر کتابوں کا مطالعہ اور ان کے مطالب کو حافظے میں محفوظ رکھنا، شعر گوئی کا شوق بلکہ دھن اور پھر مشق و ریاضت کی فرصت وہ باتیں ہیں جن کی روایتی شاعری میں خصوصی اہمیت ہوتی ہے۔ اس میں یہ ضروری نہ تھا کہ بات دل سے نکلی ہو یعنی شاعر نے واقعی اپنے ذہنی تجربے اور احساس کو پیش کیا ہو۔ گویا ایک دائرہ تھا، اسی میں چکر لگاتے رہیے۔ حسنیہ شاعری کے حوالے سے یوں سمجھیے کہ بس ایک مرتبہ جھوٹے یا فرضی عاشق بن

جائیے، ایک خیالی محبوب گھڑ لیجیے جو خوبصورت ہو اور ستم شعار بھی، اور جی چاہے تو ایک خیالی رقیب بھی گھڑ لیجیے؛ اور پھر خیالی کوچہ گردی کے ساتھ ساتھ قافیہ پیمائی کرتے رہیے' اور اس میں بھی بنے بنائے رموز، کنائے، استعارے اور تشبیہیں پہلے سے رہبری کرنے کو موجود۔ اخلاقی اور واعظانہ مضامین کی بھی یہی صورت تھی۔ ذوقؔ کی غزلیہ شاعری اسی دائرے کی شاعری ہے۔

اس بنے بنائے دائرے کی شاعری میں غزل حسن و عشق کی باتیں اور دوسرے مضامین بیاں کرتی ہے۔ اس میں کسی بے بس غزال کی حیرت میں ڈالنے والی یا جان کو گھلا دینے والی پکار کی کیفیت یعنی دلی واردات کا پر خلوص اظہار یا کسی حسین یاد میں تڑپ یا والہانہ سرشاری کی کیفیت کم ہو جاتی ہے بلکہ مقصد یہ ہو جاتا ہے کہ سچے جذبات کے بے تکلف اظہار کے مقابلے میں روایتی طور پر سنے ہوئے مضامین کو فن کارانہ جدت سے پیش کر کے استادی جتائی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بحیثیت مجموعی غزل انفرادی جذبوں کے اظہار سے زیادہ لیاقت و صنائی کا اظہار بن جاتی ہے۔ اسی لیے اسے مجلس اور دیوان خانے کی چیز کہا جاسکتا ہے۔ شعر سنانا اور سننے والوں کے منہ سے بے اختیار نکل جانا، واہ استاد' یہی غزل کے شعر کی معراج تصور کی جانے لگتی ہے۔

اخلاقی اور ناصحانہ مضامین میں البتہ ذوقؔ کے اشعار مقبول ہیں، اس وجہ سے کہ یہ مضامین ان کی افتادِ طبع کے قریب ہیں جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ ان کی زندگی اونچ نیچ، نشیب و فراز سے خالی تھی، کوئی والہانہ شوق نہ تھا، کسی قسم کی تشکیک کا کانٹا، کوئی امنگ، آرزو پوری نہ ہونے کے گھٹن نہیں، ایسا کچھ نہ تھا۔ ان کی زندگی ایک ایسی کشتی کی مثال ہے جو ہلکے ہلکے بہاؤ کے ساتھ بہتی چلی جاتی ہے۔ چناں چہ غزل کے بعد غزل پڑھتے جائیے وہی ایک ہمواری، یکساں خرامی، مانوس باتیں۔ ان کی غزل کا شعر تہہ دار اور کثیر المعانی نہیں ہوتا، نہ ہی گہرے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ذوقؔ انسانی ذہن کی کارگردگی کی امکانی حدوں کی توسیع نہیں کرتے۔ عام اخلاقی اور واعظانہ مضامین ہوں یا عاشقانہ وہ عام فہم زبان اور محاورہ و روزمرہ کے مطابق ادا کر دیتے ہیں۔ کوئی انوکھا تجربہ یا کسی جذبے کی شدت نہیں دکھاتے۔ وہاں، زبان وہ ایک استعمال کرتے ہیں جو دلی کے روزمرہ کے مطابق ہے اور سننے والے کو کسی الجھن میں نہیں ڈالتی۔ جو بات ہے صاف، الفاظ ظاہر میں جو کچھ ہے وہی قائل کے باطن میں۔ ذوقؔ کے زمانے میں عوامی دوستی یا اسی قسم کے اور نعروں کا چلن یا فیشن نہیں تھا۔ اپنے آپ کو عوام سے قریب کر لینا اور لطف کا سامان پیدا کر دینے کو عوام دوستی ہی کہا جائے گا۔ ذوقؔ غزل گوئی

میں یقیناً عوام کے شاعر ہیں۔ جو بات ذوقؔ کی غزل کو سپاٹ ہونے سے بچالیتی ہے وہ ہے کہیں کہیں تاثراتی اور اس سے زیادہ تمثیلیہ رنگ اور مضمون آفرینی۔ کہیں کہیں وہ قرآنی آیات کے حصے شعر کا جزو بنا لیتے ہیں ورنہ عام بول چال کی زبان کی رو میں ایسے چھینٹے بھی اڑا جاتے ہیں

ذوقؔ جو مدرسے کے بگڑے ہوئے ہیں ملا
ان کو مے خانے میں لے آؤ سنور جائیں گے

عام محاورے کے استعمال میں زور کی کیفیت دیکھیے جس سے مضمون کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے

دیدۂ آبلہ پا کا یہی رونا ہے
کہ نہ پہنچا ہو کہیں مجھ سے کسی خار کو رنج

ذوقؔ کی یہ زبان خلا کی پیداوار نہ تھی۔ یوں تو میرؔ سے پہلے اٹھارویں صدی کے نصفِ اوّل کے دلی کے شعراء نے ایہام کے علی الرغم اپنی غزل میں دلی کی زبان و روزمرہ کو یعنی عام بولی کو شعوری طور پر برتا تھا۔ میر نے بھی عام بولی اور روزمرہ کس حسن و خوبی سے استعمال کیا تھا اور اپنے تخلیقی جوہر کی جوت سے معمولی بول چال کے کتنے الفاظ کی معنویت کو روشن کر کے دل نشیں بنا دیا تھا۔ سودا کے ہاں بھی عام بول چال کے الفاظ کی کمی نہیں ہے، انشا کی خوش طبعی کہیے یا ان کے مزاج کا کھلنڈرا پن، وہ زبان کی سطح پر بھی نمایاں ہو جاتا ہے، نظیر اکبر آبادی کے ہاں خصوصاً نظموں میں تو ٹھاٹھ ہی نیارا ہے، لفظوں کی چٹاخ پٹاخ، چٹک مٹک، اکھیڑ پچھاڑ، سب ہی کچھ نظر آتا ہے، وہ تو جس طرح چاہتے ہیں لفظ گھڑ بھی لیتے ہیں اور حسبِ خواہش کیفیت پیدا کر لیتے ہیں اور اکثر سمعیات سے بصریات تک کا سلسلہ ایک ہی جست میں طے کرا دیتے ہیں اور اس طرح زبان کی سطح پر بھی اپنا امتیاز قائم کرتے ہیں۔ غالب کے یہاں ٹھیٹھ بولی کے لفظ اور محاورے خال خال نظر آ ہی جاتے ہیں اگرچہ یہ ان کا امتیاز نہیں ہے۔ ذوقؔ کے یہاں میرؔ کی سی لفظ کی قدر آفرینی نہیں ہے، نہ نظیرؔ کی خلاقی۔ بس روزمرہ کا استعمال زبان کی سطح پر، یہی ان کی شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ ان کی غزل میں روزمرہ و محاورے کے صحیح استعمال کی مثالیں خوش اسلوبی سے محفوظ ہو گئی ہیں۔ وہ زبان ہی کے شاعر شمار کیے جائیں گے۔ قصیدہ گوئی کا معاملہ ذرا دوسرا ہے۔ ذوقؔ کے سامنے سودا کی مثال تھی اور علمی فضیات

اور قدرتِ زبان کے اظہار کی بات تھی۔ سوؔدا کے زمانے کو نصف صدی گزر گئی تھی۔ اور زبان زیادہ ہموار ہو گئی تھی۔ اسی لیے باوجود سوؔدا کی تقلید کے ذوقؔ کے قصیدوں کی زبان بھی زیادہ شستہ ہے۔ غزل میں زبان کی بالائی یا اوپری سطح کے اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ میر کی ایک ڈگر پر ہیں' میر جو جامع مسجد کی سیڑھیوں یا محاورہ دہلی کو اپنے کلام کی سند سمجھتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے ہاں عشقیہ مضامین میں جراؔت کے رنگ کی طرف جھکاؤ تلاش کیا جاسکتا ہے مگر ان کی زبان ایسی ہی صفائی اور مخلوط زبان کے عناصر کی حامل ہے اور ظفرؔ کے ذاتی غم کے اظہار کے ساتھ دل دوز کیفیت دکھاتی ہے۔ داغؔ نے غزل میں ارضی عاشق کے بیان میں شوخی اور بے باکی سے اسی زبان کو کامیابی سے برتا، نکھارا اور مقبول ہوئے۔ اس شوخی اور بے باکی میں داغؔ کے ذاتی تجربوں یا کوائف کا دخل بہر حال تھا۔

کسی نے سوال اٹھایا تھا کہ ذوقؔ کے بعد وہ زبان شاعری میں زیادہ دیر زندہ کیوں نہ رہی۔ ہمارے خیال میں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغربی اثرات، زمانے کے نئے تقاضوں، سرسید کی اصلاحی تحریک، حالیؔ کی شاعری اور بالخصوص روایتی عشقیہ شاعری پر ان کی تنقید اور اقبالؔ کی خطابیہ اور غور و فکر کی دعوت دینے والی شاعری کی وجہ سے خود شاعری بشمول غزل کے بارے میں اندازِ نظر بدلنے لگا تھا۔ اب شاعری محض پرانی طرز کی غزل سرائی نہیں رہ سکتی تھی، محض درد و داغ کا بیان بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ اب نہ محاورہ بندی کام آسکتی تھی نہ زباں کا چونچلا۔ اب اسے فکری سطح پر تبدیل ہونا ضروری ہو گیا تھا۔ بنیادی بات یہ بھی ہے کہ بذاتِ خود اردو پوری طرح تہذیبی زبان بن کر تعمیری کردار ادا کرنے کے قابل بن رہی تھی۔ زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہو رہا تھا، ادب و شعر و زبان بھی۔ اسی دور یعنی انیسویں صدی کے نصف آخر میں نثر نگاری کا فروغ اسی کا ثبوت ہے۔ اب ان سب کو تعمیری کردار ادا کرنا تھا، فکر اور مبسوط فکر کی ضرورت تھی۔ اسی لیے نثر نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی جدید نظم نگاری کو فروغ ہوا تھا۔ غزل کی زبان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اسی لیے داغؔ اور امیر مینائی کے بعد بیسویں صدے کے غزل گو شعراء میں جن پر نظر ٹھہرتی ہے۔ اصغر، عزیز، صفیؔ، فانیؔ، حسرت، جگر،--- ان میں اصغر اور صفیؔ پر اس غالبؔ ہی کا اثر نظر آتا ہے جس نے فکر کو غزل کی فضا کا نمایاں جزو بنادیا تھا۔ ذوقؔ کے ہاں معاملہ یہ ہے کہ مضمون روایتی اور رسمی ہے یا تلاشِ بسیار کا پیدا کردہ مگر زبان کے استعمال میں خلوص۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے ہاں روزمرہ کا استعمال ہو یا محاورے کا، وہ بالقصد نہیں معلوم ہوتا' اس میں بے ساختگی کی شان ہے۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس کی روشنی میں ذوقؔ کے ہاں کچھ اخلاقی اور واعظانہ مضامین دیکھیے جو زبان زدِ عام رہے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں بیشتر عام تجربے اور مشاہدات اور عقیدے کی باتیں ہیں اور زبان وہی عام فہم سیدھی سادی

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقل مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

اے ذوق دیکھ دُخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

زبان زدِ عام ہونے ہی کے سلسلے میں کہاوتیں اور مجلسی زندگی میں سخن سازی کی باتیں بھی ہیں جو ذوقؔ کی غزل میں محفوظ ہوگئی ہیں۔ مجلسی زندگی کی سخن سازی کہیے یا مجلس آرائی کی باتیں، اردو معاشرہ اب بھی پوری طرح بھولا نہیں ہے

اے ذوقؔ تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوقؔ وگرنہ
ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

جھوٹ ہی جانو کلام اس دشمنِ ایمان کا
پہن کر جامہ بھی وہ آئے اگر قرآن کا

آخر گلِ اپنی خاکِ درِ مے کدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

مضمون آفرینی اور وضاحتی یا تمثیلیہ رنگ جس کا ذکر اوپر کیا گیا اس کی بھی کچھ مثالیں دیکھیے۔ مضمون آفرینی ذوقؔ کی غزل کا وہ پہلو ہے جس سے ان پر سودا کے اثر کی نشان دہی کی جا سکتی ہے

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

بد خصلتوں کو کرتا ہے بالا نشیں فلک
اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ

کب لباسِ دنیوی میں چھپتے ہیں روشن ضمیر
جامہ فانوس میں بھی شعلہ عریاں ہی رہا

جوں دانۂ روئیدہ تہ سنگ ہمارا
سر زیرِ گراں بارِ الم اٹھ نہیں سکتا

پھرتا ہے سیل حوادث سے کوئی مردوں کا مونھ　　شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں

ہو پاکدامنوں کو خلش گر سے کیا خطر　　کھٹکا نہیں نگاہ کو مژگاں کے خار کا

بے بدرقۂ مرگ تو قف رہا ورنہ　　عزمِ سفر جانِ حزیں ہو ہی چکا تھا

چاندنی نے تجھ بن رات روپ یہ دکھایا تھا　　مجھ کو ماہتابی پر دھوپ میں بٹھایا تھا

واعظانہ اور اخلاقی مضامین اور مجلسی زندگی میں سخن سازی یا مجلس آرائی کی باتوں سے ہٹ کر حسن و عشق کے کوچے میں آیئے تو یہاں بھی روزمرہ کے استعمال اور بات سیدھے سادے طور پر کہہ دینے پر زور ہے جو عوام سے قربت کا پتا دیتا ہے۔ لفظی مناسبت کے شوق سے اردو معاشرہ اب بھی بالکل آزاد نہیں ہے۔ موجودہ زمانے میں وہ اس کا اس قدر شیفتہ نہ سہی مگر اسے غیر پسندیدہ اب بھی نہیں کہا جا سکتا۔ چناں چہ ذوق کے ہاں اس کی مثالیں نایاب نہیں۔ مضامین وہی روایتی، اندازِ نظر یا رویہ، وہ بھی روایتی۔ کئی جگہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ سے لفظ سجھایا ہے۔ ان عشقیہ اشعار میں جرأت کی ارضی حسن سے لطف اندوزی کے اثرات موجود ہیں۔ کہیں کہیں داخلیت کی کار فرمائی البتہ نظر آتی ہے

نہیں تدبیر کچھ بنتی پڑے سر کو پٹکتے ہیں

نہ دل چھوڑے ہے ہم کو اور نہ ہم دل چھوڑ سکتے ہیں

جب کہا مرتا ہوں وہ بولے مرا سر کاٹ کر

جھوٹ کو سچ کر دکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی　　چلی تھی برچھی کسی پر، کسی کے آن لگی

کہے ہے خنجر قاتل سے یہ گلو میرا　　کمی جو مجھ سے کرے تو پیے لہو میرا

جاتی رہے زلفوں کی لٹک دل سے ہمارے　　افسوس کچھ ایسا ہمیں لٹکا نہیں آتا

یاد آگیا ترا قدِ رعنا جو باغ میں　　کیا کیا لپٹ کے روئے ہیں سروِ چمن کے ساتھ

ہے وہی جنبش لبہائے جراحت پسِ قتل　　کس لبِ تیغ کے بوسے کا ہے لپکا ہم کو

بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا　　لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

تاثیر محبت عجب اک حب کا عمل ہے لیکن یہ عمل یار پہ چل جائے تو اچھا

صاف اک ابرِ شفق آلود ہے زلف اس کی سرخیِ رخسار سے

دیکھنا آبی دوپٹہ منہ پر اس کے وقتِ خواب برج آبی میں ہے مہ، یا مہر روشن آب میں

تیر چٹکی میں لیا اس نے پئے جانِ عدو شوق کیا کیا میرے دل میں چٹکیاں لینے لگا*

کر کے بسمل مجھے ناز سے کہتا ہے وہ شوخ دیکھ تر کیجو نہ خوں سے کہیں داماں میرا

آنا تو خفا آنا، جانا تو رلا جانا آنا ہے تو کیا آنا، جانا ہے تو کیا جانا

قسمتِ برگشتہ دیکھو اک نگہ کی تھی ادھر سو بھی آکر تا سر مژگاں حیا سے پھر گئی

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

یہ شعر دیکھیے۔ اس میں مضمون آفرینی ہے مگر کنایہ میں ریاضت کی کیفیت ہے

سایۂ سروِ چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے

سانپ سا پانی میں اے سرو خراماں چھوڑ کر

لیکن اس شعر میں تشبیہ میں ندرت ہے اور تشبیہ کے عام مشاہدے کی بات پر مبنی ہونے کی وجہ سے شعر میں تاثیر ہے

عیاں ہے یوں مرے روزِ سیاہ میں خورشید

کہ جیسے شب کو نظر آئے دور کی قندیل

یہ تاثیر مضمون آفرینی اس شعر میں بھی موجود ہے

---

* ذوقؔ اور میرؔ کی شخصیتوں کا موازنہ مقصود نہیں لیکن اسی مضموں کا ایک شعر میرؔ کا یاد آگیا

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

خسرو کی شان اور ہے

نہ شود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

چلے ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم شکستِ توبہ لیے ارمغاں، مغاں کے لیے

سادگی میں پرتاثیری کے یہ شعر بھی دیکھیے

قصد کعبے کا تھا پھرے الٹے چوم کر اس کے آستانے کو

تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو غضب ہم تو تمھاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے

اس کے گھر لے چلا مجھے دیکھو دلِ خانہ خراب کی باتیں

لے گیا دل کون میرا ذوق کس کا نام لوں سامنے آجائے تو شاید بتادوں دیکھ کر

اگر آپ کو دیکھے تو مری آنکھ سے دیکھ اپنا آئینہ مرا دیدۂ پر آب بنا

اب کچھ شعر استادانہ رنگ اور مشاقی کے دیکھیے

مل گئیں خاک میں جو صورتیں ہے ان کا خیال کیوں نہ فانوسِ خیالی ہو بگولا ہم کو

ہم تبرک ہیں بس اب کر لے زیارت مجنوں سر پہ پھرتا ہے لیے آبلہ پا ہم کو

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

نہیں مژگاں کی دو صفیں گویا اک بلا اک بلا سے لڑتی ہے *

دودِ دل سے ہے یہ تاریکی مرے غم خانے میں شمع ہے اک سوزنِ گم گشتہ اس کاشانے میں

اب کے دل لے لوں تو پھر اس بتِ قاتل کو نہ دوں

جان دوں، مال دوں، ایمان دوں پر دل کو نہ دوں

چار ٹکڑے کروں دل کے کہ نہیں ہو سکتا

لب کو دوں، رخ کو نہ دوں، زلف کو دوں، تل کو نہ دوں

---

* میر

کل وہ آفت جاں اٹھ بیٹھا تھا تم نے نہ دیکھا صد افسوس

کتنے فتنے خوابیدہ پلکوں کے سائے سائے گئے

دروازہ مے کدے کا نہ کر بند محتسب ظالم خدا سے ڈر کہ در توبہ باز ہے

پھر اس مژہ کو یاد کرے دل تو دل میں ذوق نشتر چبھو کے میں سرِ نشتر کو توڑ دوں

اتنے بگڑے ہیں وہ مجھ سے کہ اگر نام ان کا لکھتا کاغذ پہ ہوں تو حرف بگڑ جاتے ہیں

استادانہ حیثیت سے انھوں نے ایسی زمینوں میں بھی غزلیں کہیں جو زیادہ مقبول نہیں تھیں۔ ان میں بندشِ الفاظ کا سلیقہ اور عروضی پابندیوں کا خیال زیادہ ہے، تاثیر کم ہے۔ ایک دو شعر ملاحظہ ہوں

کتابِ محبت میں اے حضرتِ دل بتاؤ کہ تم لیتے کتنا سبق ہو

کہ جب آن کر تم کو دیکھا تو وہ ہی لیے دستِ افسوس کے دو ورق ہو

پھر آیا لو وہ نگارِ خونیں ادھر کو سر گرمِ جنگ ہو کر

کہ جس کے ہاتھوں سے اڑ گئے سر ہزاروں مہندی کا رنگ ہو کر

لبیک و اداں، ناقوس و جرس یا خندۂ قلقل، نالہ نے

دل کھینچنے میں ہاں کوئی ہو پر ایک نوائے دل کش ہو

اخلاقی مضامین کی طرح عام تجربے اور مشاہدے کی بات بیشتر بے لاگ غیر جذباتی انداز سے کہنا ذوق کا وہ امتیاز ہے جو ان کی شخصیت کے عین مطابق ہے اور چوں کہ ان کی زبان عام فہم، سادہ اور روز مرہ کے مطابق ہوتی ہے اسی لیے ان کے اشعار آج تک زبان زد عام ہیں۔ بالخصوص یہ شعر دیکھیے

وقتِ پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

یہ اقامت ہمیں پیغامِ سفر دیتی ہے　　زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے
گل ہائے رنگ رنگ سے ہے رینتِ چمن　　اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے
ذوقؔ اس بحرِ فنا میں کشتیٔ عمرِ رواں　　جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہو گیا

یہ شعر ملاحظہ ہوں، کیسی خدا لگتی باتیں ہیں اور زبان میں کیسی برجستگی اور سادگی

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے　　اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے　　پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے
دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ　　تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے
موت نے کردیا لاچار و گرنہ انساں　　ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا
آپ آئینہ ہستی میں ہے تو اپنا حریف　　ورنہ یاں کون تھا جو تیرا مقابل ہوتا
گر پڑا آگ میں پروانہ دمِ گرمیٔ شوق　　سمجھا اتنا بھی نہ کمبخت کہ جل جاؤں گا

خلاصہ یہ کہ ذوقؔ کی غزل کے اشعار اکہرے ہیں، لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم نہیں بنتا۔ سرمستی یا سپردگی یا والہانہ پن یا اُبال کی کیفیت ان کے ہاں نہیں ہے۔ میرؔ کی طرح انھوں نے اپنی ذات کو تپِ غم سے سنوارا نہیں ہے کہ ان کے اشعار سننے والے کے دل کو پگھلا دیں۔ ان کے ہاں میرؔ کی سی یاس انگریزی، الم آشنائی جذبے کی تڑپ اور احساس کی شدت نہیں ہے۔ غالبؔ کی طرح وہ نہ جہان کی تنگی کا ذکر کرتے ہیں نہ تمنا کی بیکراں وسعتوں کا۔ اگر کبھی تنگیٔ جہاں کا خیال آتا ہے تو بس اتنا کہتے ہیں

احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے　　نکل جاتے مگر رستا نہ پایا

غالبؔ کی سی غور و فکر کی فضا یا مظاہر قدرت کے پیچھے جھانکنے یا اس کے اسرار و غوامض جاننے کی بے چینی بھی ان کے ہاں نہیں ہے۔ نہ ان کے ہاں لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے کی کیفیت ہے، نہ نظیر اکبر آبادی کا دھوم دھڑکا، نہ جرأتؔ کی کھلی ڈلی معاملہ بندی، نہ مومنؔ کی مرصع خیالی اور ایجاز۔ ان کے ہاں عام واردات کو عام فہم زبان میں بیان کر دینے کی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔

جس میں محاورہ بندی کا رنگ نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہتا، مگر اس محاورہ بندی میں ناسخ کی سی شدت نہیں ہے، بے ساختگی کا رنگ ہے۔ خارجی یا بے لاگ انداز میں سامنے کی باتیں ہیں، زبان کی صفائی قائم رہتی ہے جس کی وجہ سے ان کی غزل آورد کی چیز ہونے کے باوجود اپنی دلکشی اور انفرادیت قائم رکھتی ہے اور ان کے منتخب اشعار اب بھی زبان زدِ عام ہیں۔ عشقیہ اشعار ہوں یا ناصحانہ ان کے ہاں اعتدال ہے، ویسا ہی جیسا ان کی زندگی میں تھا، ویسا ہی جو ان مہذب، قانون کی حدود میں رہنے والے عام آدمیوں کی زندگی میں اور انداز میں ہوتا ہے اور جن سے ادب، آداب، شستگی و شائستگی اور خوش اطواری کا بھرم قائم رہتا ہے، جو زندگی اور اس کی مروّجہ میزان واقدار پر سوالیہ نشان نہیں لگاتے بلکہ انھیں اور ان کی درجہ بندی کو حتمی مان کر اپنے آپ کو ان سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

نثار احمد فاروقی

ذوقؔ کا اسلوب

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ اس وقت پیدا ہوئے جب کلاسکی شعر و ادب کی بساط لپٹی جارہی تھی۔ انھیں استاد شاہ ہونے کا اعزاز ملا، مگر قلعہ ویران ہو چکا تھا اور بادشاہ خود شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں تھا، وہ بھی انگریزوں کی اردب میں آیا ہوا تھا۔ یہ بھی ذوقؔ کی کوتاہیِ قسمت ہی تھی کہ انھیں مومنؔ، غالبؔ اور آزردہ جیسے معاصرین ملے جن کی جھبیل میں ذوقؔ کی شاعری کا پنپنا مشکل تھا۔ غالبؔ کی طرح ان کی شخصیت بھی پرکار و پرکشش نہیں تھی، نہ اتنے وسیع سماجی تعلقات تھے، نہ ذوقؔ کا کلام ان کی زندگی میں مرتب اور شائع ہو سکا۔ لیکن یہ ذوقؔ کی خوش بختی ہے کہ انھیں محمد حسین آزادؔ جیسا عقیدت مند شاگرد مل گیا جس نے کلام استاد کو حرز جاں بنا کر رکھا اور ذوقؔ کی وفات سے ۳۵۔۴۰ سال بعد اس کی اشاعت ممکن ہو سکی۔ اگرچہ آزادؔ نے کلام ذوقؔ میں تصرفات بھی کیے اور اپنی دانست میں اسے بہتر بنانے کی کوشش کی، مگر اس وقت تک تحقیق و تدوین متن کے وہ اصول رائج نہیں تھے جن سے ہم آج متون کی پرکھ کرتے ہیں اس لیے محمد حسین آزادؔ پر بدنیتی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

ذوقؔ کے دیوان میں غزلیات، قصائد، قطعات، رباعیاں اور مثنوی سب کچھ موجود ہے۔ ہر ردیف کے آخر میں کچھ منفرد اشعار بھی ہیں جن کی پوری غزلیں نہیں ملیں یا وہ ایک دو شعر ہی کہے گئے ہوں گے۔

ذوقؔ کے اسلوب کا جائزہ لینے سے پہلے یہ عرض کردوں کہ نثر اور نظم کے اسلوب میں ایک بنیادی فرق ہوتا ہے۔ نثر میں وزن نہیں ہوتا، آہنگ ہوتا ہے اس لیے الفاظ کی تقدیم و تاخیر

سے زور بیان زیادہ ہو سکتا ہے۔ نثر نگار کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ جملہ میں کلیدی لفظ کون سا ہے جس پر زور (Stress) آنا چاہیے۔ لیکن شعر میں آہنگ وزن کا پابند ہے وہاں کسی لفظ کو بے جا استعمال کرنے سے شعر ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اس لیے شاعری کا اسلوب دراصل اس کا لب و لہجہ ہے۔

ذوقؔ کی غزل اس لیے بے ذوق رہ گئی کہ انھیں شاہ نصیرؔ جیسے استاد ملے جنھوں نے شاعری کم کی ہے استادی زیادہ دکھائی ہے۔ وہ قافیوں کی مدد سے مضمون تلاش کرتے ہیں، اس لیے غزل میں کیفیت پیدا نہیں ہوتی، قدرت سخن ضرور ظاہر ہو جاتی ہے اردو کے کلاسیکی شعرا میں درد، میر، مصحفی، جرأت یا آتش کے لہجہ و اسلوب سے ذوقؔ نے اکتساب فیض نہیں کیا البتہ فارسی میں انھوں نے صائب کا اکثر تتبع کیا ہے۔ غزل میں محاکات و تمثیل صائب کا خاص انداز ہے وہ ذوقؔ کی غزل میں کثرت سے نظر آتا ہے۔ مگر اشعار کے دروبست میں وہ صفائی نہیں ہے جو کلام صائب میں ملتی ہے۔

ذوقؔ کو الفاظ کی بد آہنگی اور لہجے کے ثقل کا بھی زیادہ احساس نہیں ہوتا اور وہ غزل کی لطافت کو ایسی ثقیل آوازوں سے غارت کر دیتے ہیں جیسے

نالہ جب دل سے چلا سینے میں پھوڑا اٹکا
چلتی گاڑی میں دیا عشق نے روڑا اٹکا

تو سن عمر رواں ہر نفس اڑتا ہی رہا
کہیں میدان فنا میں نہ یہ گھوڑا اٹکا

اسی طرح ان کے ردیف قافیوں میں نامانوس اور ثقیل الفاظ شاہ نصیرؔ کی یاد دلاتے ہیں جیسے جام شراب، مگس جام شراب، خار زار پشت، زہ نہار پشت۔ گھڑی دو گھڑی کے بعد، اڑی دو گھڑی کے بعد، سر چڑھ کر، گھر چڑھ کر۔ مرجاں چھوڑ کر، انساں چھوڑ کر۔ مکدر کو توڑ دوں، پتھر کو توڑ دوں، جڑی خوب نہیں، پڑی خوب نہیں، تنگ نکالوں شنگ نکالوں، بکھرا تو، اکھڑ تو، گلو ٹوٹ گئے عربدہ جو ٹوٹ گئے، گیسو بڑھے، آہو بڑھے، کوٹ کوٹ کے، پھوٹ پھوٹ کے وغیرہ۔

یہ عجیب بات ہے کہ اپنے معاصر شعرا کا تقابلی مطالعہ ان شاعروں کے ڈکشن، امیجری اور لب

ولہجہ میں واضح طور پر فرق کو ظاہر کر دیتا ہے۔ مثلاً اس زمین میں مومن و غالب کی غزلیں بھی ہیں۔ ذوق کہتے ہیں

کہاں تلک کہوں ساقی کہ لا شراب تو دے — نہ دے شراب، ڈبو کر کوئی کباب تو دے

کرے گا قتل وہ اے ذوق تجھ کو سر سے — نگہ کی تیغ کو ہونے سیاہ تاب تو دے

اب اس میں غالب کے شعر یاد کیجیے

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے — مگر مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے — پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

ذوق کو محاورہ بندی سے خاص رغبت ہے اور وہ اکثر پورے محاورے کو نظم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے اشعار لغت سند درج کرنے کے لیے تو مفید ہو سکتے ہیں مگر ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کچھ نہیں ہوتی۔ مثلاً

ہے دل کی داو گھات میں مژگاں سے چشم یار — ہے شوق اس کو ٹٹی کی او جھل شکار کا

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز — کتنا توتے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

تھا ذوق پہلے دہلی میں پنجاب کا سا حسن — پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہ گیا

سرمہ ہے سفاک، شہرہ ہے نگاہ یار کا — سچ کہا ہے باڑھ کاٹے نام ہو تلوار کا

لگاؤ خوب نہیں طبع کی روانی میں — کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

نہ ڈال آبلے اے گرمیِ فغاں منہ میں — کہ چپکا بیٹھا ہوں بھر کے گھنگھنیاں منہ میں

مرے نالوں سے چپ ہیں مرغِ خوش الحاں زمانے میں

صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانے میں

تم مسی مل کر نہ غرفے سے نکالا منہ کرو — اور نہیں گر مانتے تو جاؤ کالا منہ کرو

لیتے ہی دل جو عاشقِ دل سوز کا چلے — تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

ان کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں جو نری تک بندی کہے جائیں گے۔ ان میں نہ روزمرہ کا لطف

ہے نہ مضمون ہے نہ بندش ہے محض عامیانہ و سوقیانہ خیالات اور قافیہ پیمائی ہے مثلاً

شیخ نے افطاریوں کے ترنوالے کھالیے ہاں مگر روزے کی خشکی سے چھوارا ہو گیا

تو بھی فرو ہوئی نہ ترش روئی شیخ کی ہر چند سوکھ سوکھ کے اچور ہو گیا

چمن سے بعد ہمیں جیسے سین و قاف قفس قفس میں بند ہیں ہم مثل فاے ناف قفس

گر ترا نور نہیں چشم میں، کیا ہے اس میں کہنا فیہ نظر عین خطا ہے اس میں

سگ دنیا پس از مردن بھی دامن گیر دنیا ہو کہ اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو

پہنچا ہے شب کمند لگا کر وہاں رقیب سچ ہے حرام زادے کی رسی دراز ہے

ذوق کی شاعری کا ایک حصہ وہ بھی ہے جس کی زبان سادہ اور بے تکلف ہے، مضمون ادق نہیں اور جس کی توسیع ہمیں ظہیر دہلوی و انور دہلوی کے کلام میں کمتر اور نواب مرزا داغ کی شاعری میں اپنی بھرپور شکل میں ملتی ہے۔ ان میں سے بہت سے اشعار ضرب المثل کی طرح زباں زد بھی ہو گئے ہیں۔

بے جا ہے دلا، اس کے نہ آنے کی شکایت کیا کیجیے گا؟ فرمایئے اچھا نہیں آتا

تو ہماری زندگی، پر زندگی کی کیا امید تو ہماری جان، لیکن کیا بھروسا جان کا

آنے سے مرے ٹھہر گئے آپ وگرنہ جانے کا ارادہ تو کہیں ہو ہی چکا تھا

موت نے کر دیا لاچار وگرنہ انساں ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

اسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثل قلقل مینا کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

دنیا گئی کہ عشق میں ایمان و دیں گیا وہ مل گیا تو جانیے کچھ بھی نہیں گیا

مجھ سا مشتاق جمال ایک نہ پاؤ گے کہیں گرچہ ڈھونڈو گے چراغ رخ زیبا لے کر

وقت پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
پھر مجھے لے چلا ادھر، دیکھو دلِ خانہ خراب کی باتیں
مہ جبیں یاد ہیں کہ بھول گئے وہ شبِ ماہتاب کی باتیں
حرف آیا جو آبرو پہ مری ہیں یہ چشمِ پُر آب کی باتیں
تجھ کو رسوا کریں گی خوب اے دل یہ تری اضطراب کی باتیں

وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں   محبت آج ترے ہم اثر کو دیکھتے ہیں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں   واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

دیکھا آخر نہ کہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے   ہم بھرے بیٹھے تھے، کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو   زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

لے جائیں تیرے کشتے کو جنت میں بھی اگر   پھر پھر کے تیرے گھر کی طرف دیکھتا چلے

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے   تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے   مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے   اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے   پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

ذوق کی زبان صاف ہے۔ قلعہ معلیٰ کی صحبت کا اثر بھی ہے، محاوروں پر بھی انھیں دسترس ہے مگر اس کی زبان میں دلی کے وہ تیور نہیں ہیں جو ہمیں مرزا داغ کے ہاں ملتے ہیں۔ ذوق کی زبان بے جھول بھی نہیں ہے۔ وہ توالی اضافات سے شعر کو بوجھل بنا دیتے ہیں جیسے

وہ ہوں میں گیسوئے موجِ محیطِ اعظم وحشت
کہ ہے گھیرے ہوئے روئے زمیں کو پیچ و خم میرا

اکثر غلط العوام کو ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً

جل کر اگر بجھے بھی دل سوختہ مرا تو پھر جلے گا جیسے کہ کولا بجھا ہوا

مرزا مظہر نے کوئلا نظم کیا ہے

آتش کہو، شرارہ کہو کوئلہ کہو

کہیں محاورے میں الٹ پھیر بھی کر دیتے ہیں جیسے

وہ کہے کون ہے قرباں مری اس چتون پہ
میں کہوں میں، تو کہے میں کے چھری گردن پر

محاورہ "میں کی گردن پہ چھری" ہے اور محاورے کے لفظوں میں الٹ پھیر کرنا خلاف فصاحت مانا جاتا ہے اسی طرح ذوق نے صلواتیں (بسکون دوم) نظم کیا ہے

اٹھیں گے یار کی ٹھوکر سے بس چلو کھسکو
نہیں تو اب کوئی صلوات سن کے جاتے ہو

وہ اپنے اشعار میں طب کی اصطلاحیں بھی اکثر لے آتے ہیں، عود غرقی، نبض نملی، برل کھری، شکرتری، گل حکمت وغیرہ، ایک سے زیادہ مواقع پر انھوں نے لفظ مضطر بمعنی مضطرب استعمال کیا ہے۔

تیر اس نگہ کا گر دل مضطر میں گھر کرے
ناسور عشق زخم کے پھر گھر میں گھر کرے

لفظ مضطر کا صحیح استعمال مومن کے اس شعر میں ہوا ہے

کیوں سنے عرض مضطرائے مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

ایک جگہ وہ توڑ کے کہنے کے بدلے ٹوٹ کے نظم کر گئے ہیں

کہتے ہیں لوگ سب کہ نہیں پانو جھوٹ کے
جھوٹے تو بیٹھتے بھی نہیں پانو ٹوٹ کے

اور اسی غزل میں گھوٹ کو بہ واو معرف و نون غنہ لکھا ہے

چلتا ہوں ذوقؔ قید سے ہستی کی چھوٹ کے

یہ قید مار ڈالے گی دم گھونٹ گھونٹ کے

خلاصہ یہ کہ ذوقؔ کی شاعری میں بھی پست و بلند موجود ہے۔ ان کے یہاں مومنؔ کی معاملہ بندی اور مضمون آفرینی نہیں ہے، فکر و فلسفہ بھی نہیں۔ غالبؔ کی طرح انداز بیان کی ندرت اور اسلوب ادا کی دل فریبی بھی نہیں۔ زبان کے اعتبار سے ان کے شاگرد داغؔ ان سے کہیں آگے نکل گئے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ اعتراف کرنا ہو گا کہ قصیدہ نگاری میں ذوقؔ کا مرتبہ اپنے تمام معاصرین سے بلند و برتر ہے۔ وہ سودا کے بعد دوسرے قصیدہ نگار ہیں اور یہاں ان کے لب و لہجہ میں کچھ اور ہی شوکت و جزالت ملتی ہے۔ قصیدے کے مضامین نادر تو نہیں ہیں مگر ان کی بندش موضوع کے شایان شان ہے۔

انتخابِ دیوانِ ذوق

(غزلیات)

نثار احمد فاروقی

انتخابِ دیوانِ ذوقؔ
(غزلیات)

جینا نظر اپنا ہمیں اصلا نہیں آتا گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا
مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا پر ذکر ہمارا، نہیں آتا نہیں آتا
ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہادیں شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا
غافل ہے بہارِ چمن عمر جوانی کر سیر کہ موسم یہ دوبارا نہیں آتا
ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا
قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوقؔ وگرنہ سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

تو ہماری زندگی، پر زندگی کی کیا اُمید تو ہماری جان لیکن کیا بھروسہ جان کا
جو فرشتے کرتے ہیں کر سکتے ہیں انسان بھی پر فرشتوں سے نہ ہو جو کام ہے انسان کا

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ صد حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

پردہ درِ کعبہ سے اٹھانا تو ہے آساں　　پرٗ پردۂ رُخسارِ صنم اُٹھ نہیں سکتا
دُنیا کا زرومال کیا جمع تو کیا ذوقؔ　　کچھ فائدہ بے دستِ کرم اُٹھ نہیں سکتا

ہر اک سے ہے قول آشنائی کا جھوٹا　　وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا
ابھی ذوقؔ آیا ہے تو میکدے سے　　یہ دعویٰ نہ کر پارسائی کا جھوٹا

میں ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا　　تم وقت پہ آپہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا
آنے سے مرے ٹھیر گئے آپ وگرنہ　　جانے کا ارادہ تو کہیں، ہو ہی چکا تھا
کیا دیکھتے ہم، یوسفِ کنعاں کو کہ اپنا　　منظورِ نظر ایک حسیں، ہو ہی چکا تھا
جو کچھ کہ ہوا ہم سے وہ کس طرح نہ ہوتا　　حکمِ ازلی ذوقؔ یو نہیں ہو ہی چکا تھا

خاک، آئینے سے ہے نامِ سکندر روشن　　روشنی دیکھتا، گر دل کی صفائی کرتا
نہیں، گوشِ شنو باغِ جہاں میں غافل　　ورنہ ہر برگ، یاں نغمہ سرائی کرتا

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا　　کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہ گاروں کا

موت نے کردیا لاچار وگرنہ انساں　　ہے وہ خودبیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا
آپ، آئینہ ہستی میں، ہے تو اپنا حریف　　ورنہ یاں کون تھا جو تیرے مُقابل ہوتا
سینۂ چرخ میں، ہر اختر اگر دل ہے تو کیا　　ایک دل ہوتا مگر درد کے قابلِ ہوتا

مجنوں بھی، دشت گرد تھا، مانند گردباد پر، ہم نے خاک اُڑائی تو وہ گرد ہو گیا

ہنگامہ گرم ہستی ناپائیدار کا چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

نشہ دولت کا بداطوار کو جس آن، چڑھا سر پہ، شیطان کہ اک اور بھی شیطان، چڑھا
حضرتِ عشق کی درگا میں آکر، اے ذوق دل ودیں دیتے ہیں، سب گبر و مسلمان، چڑھا
کہے ہے خنجر قاتل سے، یہ گلو میرا کمی، جو مجھ سے، کرے، تو پیے لہو میرا
نہ پہنچا گردنِ جاناں تک اور ٹوٹ کے ہائے پڑا، گلے میں مرے، دستِ آرزو میرا
سدا، ملائکِ تسبیح خواں کو، آئے رشک سنیں، جو میکدے میں، شورِ ھاؤ ہو، میرا

بے چراغ، اس کو نہ رکھ، داغِ الم سے، اے عشق خانۂ دل کوئی ویرانہ ہوا گھر نہ ہوا
ذوق بیمارِ محبت ہے خدا خیر کرے کہ یہ آزار ہوا جس کو، وہ جاں بر نہ ہوا

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا پر میرا جگر دیکھ کہ میں اُف نہیں کرتا
کیا قہر ہے، وقفہ ہے ابھی آنے میں اُس نے اور دم مرا، جانے میں، توقف نہیں کرتا
دل، فقر کی دولت سے مرا اتنا غنی ہے دنیا کے زر و مال پہ، میں تُف نہیں کرتا
اے ذوق تکلف میں، ہے تکلیف، سراسر آرام میں ہے، وہ، جو تکلف نہیں کرتا

کب لباسِ دنیوی میں، چھپتے ہیں، روشن ضمیر جامۂ فانوس میں بھی، شعلہ، عریاں ہی رہا
آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

جلوہ اے قاتل اگر تیرا نہیں حیرت فزا
دیدۂ بسمل نے کیا دیکھا جو حیراں ہی رہا

سب کو دیکھا اُس کی اور اس کو نہ دیکھا جوں نگاہ
رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

دین و ایماں ڈھونڈتا ہی ذوق کیا اس وقت میں
اب نہ کچھ دیں ہی رہا باقی نہ ایماں ہی رہا

دیکھ، چھوٹوں کو، ہے، اللہ 'بڑائی دیتا
آسماں، آنکھ کے تِل میں، ہے دکھائی دیتا

لاکھ دیتا فلک، آزار گوارا تھے مگر
ایک تیرا نہ مجھے، دردِ جُدائی، دیتا

منہ سے بس کرتے کبھی یہ نہ خدا کے بندے
گر، حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا

میں ہوں وہ صید کہ پھر دام میں پھنستا جاکر
گر، قفس سے، مجھے صیاد، رہائی دیتا

دیکھ، گر دیکھنا ہے ذوق کہ وہ پردہ نشیں
دیدۂ روزنِ دل سے ہے دکھائی دیتا

زاہد، شرابِ پینے سے کافر ہوا، میں کیوں
کیا ڈیڑھ چلّو پانی میں ایمان بہہ گیا

ہے موجِ بحرِ عشق وہ طوفاں کہ الحفیظ
بے چارہ مُشتِ خاک تھا، انسان، بہہ گیا

تھا، ذوق پہلے دہلی میں پنجاب کا سا حسن
پر اب وہ پانی، کہتے ہیں ملتان، بہہ گیا

گل اُس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی، لہو لگا کے، شہیدوں میں مل گیا

آخر کو، فیضِ بیعت دستِ سبو سے آج
پیر مُغاں کے میں بھی مُریدوں میں مل گیا

ہے قفس سے شور اک، گلشن تلک، فریاد کا
خوب، طوطی بولتا ہے ان دنوں صیّاد کا

روزِ مرگِ عاشقِ ناشاد، ہے شادی کا دن
ہے، بجائے شورِ ماتم، غُل، مُبارک باد کا

گرچہ ہے استاد شیطاں، نفس، شاگردِ رشید
پر یہ شاگردِ رشید اُستاد ہے اُستاد کا

ذوقؔ حیراں ہے بہت فکرِ گشاؤ کار میں　　یا علی مشکل کشا یہ وقت ہے امداد کا

. . . . .

نالہ کہتا ہے کہ تا چرخِ زُحل جاؤں گا　　بلکہ میں توڑ کے اس کو بھی نکل جاؤں گا
کوچہ یار میں جاؤں گا تو مثلِ خورشید　　پاسِ آداب سے میں سر ہی کے بل جاؤں گا
دل کہے ہے کہ مجھے روزنِ سینہ سے نکال　　ورنہ خوں ہو کے میں آنکھوں سے نکل جاؤں گا
گر پڑا آگ میں پروانہ دمِ گرمیِ شوق　　سمجھا اتنا بھی نہ کم بخت کہ جل جاؤں گا

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا　　اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
مُقدر ہی پہ گر سود و زیاں ہے　　تو ہم نے کچھ یہاں کھویا نہ پایا
وہ از خود رفتہ ہوں جس کو خودی نے　　خدائی میں اگر ڈھونڈھا نہ پایا
رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم　　کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا
احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے　　نکلتے جاتے مگر رستا نہ پایا
مزار کشتہ خونیں کفن پر　　سوائے لالہ صحرا نہ پایا
سراغِ عُمرِ رفتہ ہو تو کیوں کر　　کہیں جس کا نشاں پایا نہ پایا
لحد میں بھی ترے مُضطر نے آرام　　خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا
وہ بولے دیکھ کر تصویر یوسف　　سُنا جیسا اسے ویسا نہ پایا
کبھی تو اور کبھی تیرا رہا غم　　غرض خالی دلِ شیدا نہ پایا
نظیر اس کا کہاں عالم میں اے ذوقؔ　　کوئی ایسا نہ پائے گا نہ پایا

روز کہتا تھا مزا مجھ کو چکھا دے عشق کا　　پھر دیا لون اُس نے دل کو چیر کر اچھا ہوا

سن کے مجنوں نے مرے شورِ جنوں کو یہ کہا　　واقعی مجھ سے بھی یہ شوریدہ سر اچھا ہوا
ہاتھ تو ہلکا پڑا تھا یار کی شمشیر کا　　زخم پر قسمت سے میری کارگر اچھا ہوا
نامہ بر جاتا ہے جا جلدی چلی جانِ حزیں　　دیر مت کر ساتھ تیرے ہم سفر اچھا ہوا
ذوقؔ کے مرنے کی سن کر پہلے تو کچھ رک گئے　　پھر کہا تو یہ کہا منہ پھیر کر اچھا ہوا

عشق کے ہاتھ سے نے قیس نہ فرہاد بچا　　اس کو گردشت میں تو اس کو جبل میں مارا
ہم نے جانا تھا جبھی عشق نے مارا اس کو　　تیشہ فرہاد نے جس وقت جبل میں مارا
نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب　　ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

جسے کہتے ہیں بحرِ عشق اس کے دو کنارے ہیں　　ازل نام اِس کنارے کا ابد نام اُس کنارے کا
سرِ راہِ فنا میں ہوں مُہیّائے سفر لیکن　　برنگِ اشکِ مژگاں منتظر ہوں ایک اشارے کا
خریدار اس کی رحمت جنسِ عصیاں کی ہے رحمت سے　　جھڑک کر بیچتا ہوں نفع پر سودا خسارے کا
نہ پکڑیں دامنِ الیاس گردابِ بلا میں ہم　　کہ بدتر ڈوب کر مرنے سے ہے جینا سہارے کا
فقط تارِ نفس کا ذوقؔ خطِ جادہ کافی ہے　　پے عمرِ رواں کیا چاہیے رشتہ گزارے کا

اے صنم کیا پوچھتا ہے حال اِس مہجور کا　　دل نہ اٹکائے کہیں اللہ بے مقدور کا
دفن ہے جس جا پہ کشتہ سرد مہری کا تری　　بیش تر ہوتا ہے پیدا واں شجر کافور کا
عشق نے ڈالی تھی جب قصرِ محبت کی بنا　　لکھ دیا تھا کوہ کن بھی نام اک مزدور کا

آسماں سخت مزاجوں کو ہنر دیتا ہے　　دیکھ لو ہوتے ہیں فولاد میں جوہر پیدا

بے مکیں ہوتی نہیں زیب مکاں کی اے ذوق — خانۂ دل ہے تو کر لو رُخِ دل بر پیدا

لیک ہم ہی زلف کے کیا مشک بھی یکسر ہے خوں — بلکہ جل کر سوختہ عنبر بھی سارا ہو گیا

ذوق اس بحرِ جہاں میں کشتیِ عمرِ رواں — جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہو گیا

ام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا — پُل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

چشمِ مخمور کا ہوں کس کی میں کشتہ یارب — کہ مری خاک سے بھی جامِ مے ناب بنا

سُرمہ چشمِ عزیزاں نہ بنا تو ناداں — کیا بنا خاک غُبارِ دلِ احباب بنا

جب کیا عشق کے دریا نے تلاطم اے ذوق — تو کہیں موج بنی اور کہیں گرداب بنا

تری بزم میں تو جلتا جو تجھے بھی بو پہنچتی — جو یونہی تھا دل کو جلنا تو بلا سے عود ہوتا

جو حسد کسی کو تجھ پر ہو تو ہے یہ تیری خوبی — کہ جو تو نہ خوب ہوتا تو وہ کیوں حسود ہوتا

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا — جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا — اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا — نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا ہمیشہ قول دے کر — جو اُس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا — کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

مرے آنسو ہمیشہ ہیں برنگِ لعل غرقِ خوں — جو غوطہ آب میں تو نے گُہر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں — اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بد خواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بدبیں میں — فلک پر ذوق تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر
جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا

بیمار محبت نے لیا تیرے سنبھالا
لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

تاثیر محبت عجب اک حب کا عمل ہے
لیکن یہ عمل یار پہ چل جائے تو اچھا

فرقت میں تری تارِ نفس سینے میں میرے
کانٹا سا کھٹکتا ہے نِکل جائے تو اچھا

وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دو پہر
اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا

ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام
اور چاہوں کہ اگر آج سے کل جائے تو اچھا

جب کل ہو تو پھر وہی کہوں کل کی طرح سے
گر آج کا دن بھی یوں ہی ٹل جائے تو اچھا

القصہ نہیں چاہتا میں جائے وہ یاں سے
دل اُس کا یہیں گرچہ بہل جائے تو اچھا

ہے قطعِ رہِ عشق میں اے ذوقؔ ادب شرط
جوں شمع تو اب سر ہی کے بل جائے تو اچھا

جس نے کی اس مے کدے میں بیعتِ دستِ سبو
وہ قدم تیرے بس اے پیرِ مغاں لینے لگا

موت اس کو یاد کرتی ہے خدا جانے کہ گور
یوں ترا بیمارِ غم جو ہچکیاں لینے لگا

رات کو اے ذوقؔ اس کی نوکِ مژگاں کا خیال
تن ہر پہ مُو سے مرے کارِ سناں لینے لگا

سُرمہ ہے سفاک شُہرہ ہے نگاہِ یار کا
سچ کہا ہے باڑہ کاٹے نام ہو تلوار کا

کوچۂ زُلفِ بتاں میں دل پڑا ہوگا کہیں
پوچھتے کیا ہو ٹھکانا اس خُدائی خوار کا

استخواں اس سوختہ جاں کے نہ کھانا زینہار
اے ہما یہ رزق ہے مُرغانِ آتش خوار

اُفتادگاں کو بے سر و ساماں نہ جانیو
دامانِ خاک ہوتا ہے رُو پوشِ نقشِ پا

اُس رہ گزر میں کس کو ہوئی فرصتِ مقام   بیٹھے ہے نقشِ پا بہ سرِ دوشِ نقشِ پا
پابوسِ درکتاد کہ اپنی تو خاک بھی   پہنچی نہ ذوق اُس کے بہ آغوشِ نقشِ پا

..

ترے ہاتھوں کوئی آوارہ اے گردوں نہ ٹھیرے گا   ولیکن تو بھی کر چلا ہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھیرے گا
وہ دولت کر طلب جس سے کہ دل ہو جائے مستغنی   اگر ہاتھ آئے گا گنجینۂ قاروں نہ ٹھیرے گا
کوئی دم ٹھیرنے دو اس کو بالیں پر مرے یارو   ابھی سے کیا کہوں حالِ دلِ محزوں نہ ٹھیرے گا
یہی ہے دل کی بے تابی تو بعد از مرگ اے قاتل   نہ ٹھہرا ہے زمیں پر عاشقِ محزوں نہ ٹھیرے گا

آنکھ اُٹھا اپنے جو بیمار کو دیکھا ہوتا   تجھ پہ قرباں میں ایک رشکِ مسیحا ہوتا
خاک ہو جاتا اگر راہِ خدا میں بخدا   تو نہ سر' سنگِ درِ دیر و کلیسا ہوتا
دیکھ سکتا جو تجلّیِ رُخِ جاناں کو   'لن ترانی' کا سزا وارانہ موسیٰ ہوتا
آستاں بوسیِ سلطاں سے نہ کرتے پرہیز   ہم کو گر حوصلہ ثروتِ دنیا ہوتا
شبِ فرقت میں جلا کرنے سے ہر شب کے صنم   کاش مر جاتا میں اک روز تو اچھا ہوتا

لوگ کہتے ہیں ترے لب میں ہے اعجازِ مسیح   امتحاناً مرے لاشے پہ تو بولا ہوتا
نالہ غم زدگاں سنتا جو ایک اہلِ حرم   شرمگیں نالۂ ناقوسِ کلیسا ہوتا

ساتھ آہ کے دل معِ پیکاں نکل آیا   تھا کام تو مشکل مگر آساں نکل آیا
تھا کوچہ قاتل میں شہادت کا دفینہ   کھودا تھا کنواں گنجِ شہیداں نکل آیا
شب ہم نے تہیہ جو کیا توبہ کا ساقی   مغرب سے سحر مہر درخشاں نکل آیا

ہاتھ آئے نہ قسمت کے سوا گوہرِ مقصود دریا سے تہی پنجہ مرجاں نکل آیا
دل رکھ کے کہیں ذوق کا ہم بھول گئے گم تھا وہ کئی دن سے مگر ہاں نکل آیا

آدم دوبارہ سوئے بہشتِ بریں گیا دیکھو جہاں خراب ہوا پھر وہیں گیا
دنیا گئی کہ عشق میں ایمان و دیں گیا وہ مل گیا تو جانیے کچھ بھی نہیں گیا
خورشید وار چرخ پہ چمکا کوئی تو کیا آخر کو پھر جو دیکھا تو زیرِ زمیں گیا
دیکھا کہیں نہ اُس کو جو دیکھا تو اپنے پاس میں دُور دُور جوں نگہِ دوربیں گیا

یہ جس کے ناوکِ مژگاں کا دل نشانہ ہوا وہ رفتہ رفتہ صنم آفتِ زمانہ ہوا
رہے ہے خلقِ خُدا جس کے آگے سر بسجود وہ رشکِ کعبہ ترا سنگِ آستانہ ہوا
چمن میں آتشِ گل نے جلا دیا اس کو مرا خزاں سے نہ برباد آشیانہ ہوا
ذرا تو شیشۂ مے ہاتھ سے یہاں رکھ دو حرم بھی شیخ جی صاحب شراب خانہ ہوا

وہ ہم سے پردے ہی میں اب تلک رہا افسوس اور اپنا قافلۂ عُمر بھی روانہ ہوا
دلا بیانِ نزاکت میں کیا کرو اس کا کہ جس کو سایۂ کاکُل سے دردِ شانہ ہوا
غمِ فراق نے تیرے مجھے ہلاک کیا فقط یہ کہنے کو ہے موت کا بہانہ ہوا
وفورِ بادہ پرستی ہوا یہ عالم میں کہ قصرِ ذوق بھی آخر شراب خانہ ہوا

مرا گھر تیری منزل گاہ ہو ایسے کہاں طالع خُدا جانے کدھر کا چاند آج اے ماہ رو نکلا
مئے عشرت طلب کرتے تھے ناحق آسماں سے ہم وہ تھا لبریز غم اس خُم کدے سے جو سبو نکلا

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا　　پھر آخر دل ہی میں دیکھا بغل ہی میں سے تو نکلا
گھسے سب ناخنِ تدبیر اور ٹوٹی سرِ سوزن　　مگر تھا دل میں جو کانٹا نہ وہ ہرگز کبھو نکلا
اسے عیار پایا یار سمجھے ذوقؔ ہم جس کو　　جسے یاں دوست اپنا ہم نے جانا وہ عدو نکلا

واں طائرِ خیال اُڑے تھا مرا جہاں　　پرواز عاجزی میں پرِ جبرئیل تھا
رکھتا تھا اس کی آنکھ میں، مثلِ سُرمہ جا　　کہنے کو گو کہ چشمِ جہاں میں ذلیل تھا
دیکھا یہ ہم نے کوچہ خوبانِ دہر میں　　خونِ شہیدِ خنجرِ مژگاں سبیل تھا

کیا حبیب کو مجھ سے جدا فلک نے مگر　　نہ کر سکا مرے دل سے غمِ حبیب جدا
کریں جدائی کا کس کس کی رنج ہم اے ذوقؔ　　کہ ہونے والے ہیں ہم سب سے عنقریب جدا

ہم نے جانا تھا کہ قاصد جلد لائے گا خبر　　کیا خبر تھی جا کے واں وہ بے خبر ہو جائے گا
شکل تو دیکھوں مصوّر کھینچے گا تصویرِ یار　　آپ ہی تصویر اُس کو دیکھ کر ہو جائے گا

جی اُٹھے مُردۂ صد سالہ ابھی اے عیسیٰ　　یار دکھلائے کہیں آ کے جو اعجاز اپنا

نشانی کچھ دکھائی دے تو بتلاؤں یہاں ٹوٹا　　نظر آیا نہ اپنے اشک کا شیشہ جہاں ٹوٹا
بنے اِس عشق کے بازار میں کیوں کر بھلا سودا　　خریداری کو اُس کی اب تو یہ سارا جہاں ٹوٹا
نہ کر بے رحمی اتنی بھی دلِ محزوں پر اے ظالم　　نہیں ملتا کسی کا دل کسی سے پھر جہاں ٹوٹا
خدا حافظ ترا اے ذوقؔ اب کچھ بن نہیں آتا　　دلِ محزوں کے اوپر ہائے غم کا آسماں ٹوٹا

کیا کیا نہ لطف تیرے ستم کا اُٹھا لیا　　ہم نے بھی لطفِ زندگی اچھا اُٹھا لیا
یوں لائے واں سے ہم دلِ صد پارہ ڈھونڈ کر　　دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اُٹھا لیا

آنا تو خفا آنا جانا تو رُلا جانا　　آنا ہے تو کیا آنا جانا ہے تو کیا جانا
کیا طبع میں جودت ہے چٹ دل کی اُڑا جانا　　ہونٹوں کا یہاں ہلنا واں بات کا پا جانا

ہوئے انسان سب سوز محبت کے لیے پیدا　　فرشتے ہوتے گر ہوتے عبادت کے لیے پیدا

کاسۂ چرخ رہے کیوں نہ زمیں پر الٹا　　ہم نے یہ جام، دوا عشق کی پی کر الٹا

مسجد میں اس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا　　کافر کی دیکھو شوخی گھر میں خدا کے مارا

عہدِ پیری نے بھلایا دوڑ چلنا کودنا　　ہائے طفلی کھیلنا اور وہ اُچھلنا کودنا

نشۂ پندار سے ابلیس رہ گم کردہ تھا　　ورنہ آدم میں دھرا کیا تھا وہی در پردہ تھا

ذوق ہے ترکِ وطن میں صاف نقصِ آبرو　　بکتا پھرتا ہے گہر ہو کر سمندر سے جدا

پی بھی جا ذوق نہ کر پیش و پسِ جامِ شراب　　لب پہ توبہ ترے دل میں ہوسِ جامِ شراب

باز گشت اپنی ہے یوں جانبِ قسّامِ ازل — جیسے ساقی کی طرف بازپسِ جامِ شراب
محتسب شعلۂ آواز سے جل جاؤں گا — گرچہ ٹوٹا دلِ آتش نفسِ جامِ شراب
بے خبر قافلۂ عیش گزر جاتا ہے — بے زباں ہے جو دہانِ جرسِ جامِ شراب

برسوں ہو ہجر ہو وصل ہو گر ایک دم نصیب — کم ہوگا مجھ سا کوئی محبت میں کم نصیب
گر میری خاک کو ہوں تمہارے قدم نصیب — کھایا کریں نصیب کی میرے قسم نصیب
غافل جو دم کی آمد و شد سے نہ ہووے تو — ہر دم ہے تجھ کو سیرِ وجود و عدم نصیب
مجنوں سیاہ خیمۂ لیلیٰ کے گرد پھر — اے خوش نصیب تجھ کو یہ طوفِ حرم نصیب
جاتے ہیں کوئے یار کو اِس میں جو ہو سو ہو — اے ذوقؔ آزماتے ہیں آج اپنے ہم نصیب

دل عبادت سے چُرانا اور جنت کی طلب — کام چور اس کام پر کس مُنہ سے اُجرت کی طلب
جو حلاوت زندگی کی چاہتا ہے چرخ سے — کاسۂ زہراب سے کرتا ہے شربت کی طلب
واسطے نظّارۂ قاتل کے فرصت چاہیے — اور یاں فرصت کہاں جو کیجیے فرصت کی طلب
ہو مبارک خضر کو سرچشمۂ آبِ بقا — ہے ہمیں آبِ دمِ تیغِ شہادت کی طلب
بڑھ گئی ہے عشق میں حرص اس قدر اپنی کہ ہے — غم پہ غم کی آرزو حسرت پہ حسرت کی طلب
طفلِ مادر ہی سے جب پیدا ہوا تکلیف سے — یاں کہاں راحت کہ تو کرتا ہے راحت کی طلب

معلوم جو ہوتا ہمیں انجامِ محبت — لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نامِ محبت
خاکسترِ پروانہ دکھا دوں میں اُڑا کر — پوچھے کوئی مجھ سے اگر انجامِ محبت
معراج سمجھ ذوقؔ تو قاتل کی سِناں کو — چڑھ سر کے بل اس زینے پہ تا بامِ محبت

فرقت کی رات جی چکے ہم تا زمانِ صُبح　　ہوگی اذانِ گور ہماری اذانِ صُبح
اب بت کدے میں شام کو ناقوس پھونکیے　　مسجد میں مدتوں رہے تسبیح خوانِ صُبح
ریشِ سفیدِ شیخ میں ہے ظلمتِ فریب　　اس مکر چاندنی پہ نہ کر کرنا گمانِ صُبح

زاہد یہ کیا کہا کہ نہ مِل ان بُتوں سے تو　　دیتا ہے ایسی کوئی بھی مردِ خُدا صلاح
یہ ہے مرا رفیق ہے یہ ہی مرا شفیق　　لوں کس سے دل کے جانے کی دل کے سوا صلاح
اس چشمِ مست کے ہیں خراباتیوں میں ہم　　تقویٰ کُجا و زُہد کُجا و کُجا صلاح
اے ذوقؔ جا نہ ہوش و خرد کی صلاح پر　　دے عشق جو صلاح وہی ہے بجا صلاح

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد　　سینے میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد
کیا روکا اپنے گریے کو ہم نے کہ لگ گئی　　پھر وہ ہی آنسوؤں کی جھڑی دو گھڑی کے بعد
کل اُس سے ہم نے ترک ملاقات کی تو کیا　　پھر اُس بغیر کل نہ پڑی دو گھڑی کے بعد

جھومر کا نظر سر پہ ترے اب تو پڑا چاند　　تھا وعدہ چڑھے چاند کا لا بوسہ چڑھا چاند

ہے آئنہ خانہ بھی گذر گاہِ بد و نیک　　دیکھا نہ کبھی ہم نے درِ اہلِ صفا بند

نگہ نہیں حرفِ دل نشیں تھا دہن کی تنگی سے تنگ ہو کر　　نکل کر آیا جو راہ آنکھوں کے دل میں بیٹھا خدنگ ہو کر
صفائے دل کی یہی ہے صورت کہ دل میں آنے نہ دے کدورت　　کہ بیٹھ جائے گا بالضرورت اس آئنے میں یہ زنگ ہو کر

جو رنگِ الفت سے آشنا ہیں وہ گر بُرے بھی ہیں خوشنما ہیں　　　کہ رنگ ہی سے گراں بہا ہیں عقیق و یاقوت سنگ ہو کر
حلاوتِ شرم و پاسداری جہاں میں ہے ذوقؔ رنج و خواری　　　مرے سے گزری اگر گزاری کسی نے بے نام و ننگ ہو کر

لے گیا دل کون میرا ذوقؔ کس کا نام لوں　　　سامنے آ جائے تو شاید بتا دوں دیکھ کر

مجھ سا مشتاقِ جمال ایک نہ پاؤ گے کہیں　　　گرچہ ڈھونڈو گے چراغِ رُخِ زیبا لے کر
ذبح کرنے کو مرے پوچھتے کیا ہو تدبیر　　　تُم چھری پھیر بھی دو نام خدا کا لے کر
واں سے یاں آئے تھے اے ذوقؔ تو کیا لائے تھے　　　یاں سے تو جائیں گے ہم لاکھ تمنا لے کر

کل گئے تھے تم جسے بیمارِ ہجراں چھوڑ کر　　　چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر
سرد مہری سے کسی کی آ گئے ہی جی سرد ہے　　　یاں سے ہٹ جا دھوپ اے ابرِ خراماں چھوڑ کر
اے دل اس کے تیر کے ہمراہ سینے سے نکل　　　ورنہ پچھتائے گا تو یہ ساتھ ناداں چھوڑ کر
گر خدا دیوے قناعت ماہِ دو ہفتہ کی طرح　　　دوڑے ساری کو بھی آدمی پھر نہ انساں چھوڑ کر
کام یہ تیرا ہی تھا رحمت ہو اے ابرِ کرم　　　ورنہ جائے داغِ عصیاں میرا داماں چھوڑ کر

اہلِ جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک　　　لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر
گھر سے بھی واقف نہیں اُس کے کہ جس کے واسطے　　　بیٹھے ہیں گھر بار ہم سے خانہ ویراں چھوڑ کر
وصل میں گر ہووے مجھ کو روءتِ ماہِ رجب　　　روئے جاناں ہی کو دیکھوں میں تو قرآں چھوڑ کر
ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن　　　کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دُور اور شکستہ پر		پروانہ ہوں چراغ سے دُور اور شکستہ پر
اس مرغِ ناتواں پہ ہے حسرت جو رہ گیا		مرغانِ کوہ و باغ سے دُور اور شکستہ پر
اے ذوقؔ میرے طائرِ دل کو کہاں فراغ		کوسوں ہے وہ فراغ سے دُور اور شکستہ پر

اے دل وہ سرِّ غمزۂ پنہاں عیاں نہ کر		آنکھوں سے دیکھ اور زباں سے بیاں نہ کر
آہوں میں دودِ دل جو نکالوں تو وہ کہے		اے تفتہ جاں ہوا ہو یہاں سے دُھواں نہ کر

کون سا ہمدم ہے تیرے عاشقِ بےدم کے پاس		غم ہے اس کے پاس بیدل اور وہ ہے غم کے پاس
روح اس ماتم زدہ کی بعد مُردن جوں پتنگ		آئے گی اُڑ کر چراغِ خانۂ ماتم کے پاس

مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے ہے تو آن کے پاس		بد گماں وہم کی دارو نہیں لُقمان کے پاس

سب مذاہب میں یہی ہے نہیں اسلام میں خاص		کہ جہاں عام ہے ہوتا ہے وہاں عام میں خاص
عشق کا جوش ہے جب تک کہ جوانی کے ہیں دن		یہ مرض کرتا ہے شدّت انھیں ایام میں خاص
شیخ صاحب کے ہیں نزدیک وہ خاصانِ خدا		خدمتی اُن کے جو ہیں زمرۂ خُدام میں خاص
ذوقؔ اسمائے الٰہی ہیں سب 'اسمِ اعظم'		اس کے ہر نام میں عظمت ہے نہ اک نام میں خاص

نہ اس سے امن میں ایماں نہ دیں رہا محفوظ		تری نگاہ سے کافر رکھے خُدا محفوظ
ترا ہے نامہ مرے حفظِ جان کا تعویذ		رکھوں ہوں میں بھی جسے جان سے سوا محفوظ

عزیز ہے ترا پیکاں یاں تلک مجھ کو رکھوں ہوں دل میں جسے جان سے سوا محفوظ
اُلجھتے پاک نفس کب ہیں ناکسوں کے ساتھ خلش سے خار کی ہے دامنِ صبا محفوظ

ایام جوانی کا تو کیا کیجے بیاں حال پیری میں بھی زائل نہ ہوئی رعستِ معشوق

جلد اے تیغِ اجل بھی اک مدت سے سرِ شوریدہ اُٹھا سکتا نہیں بارِ فراق
پھر نظر آنے لگے خوابِ پریشاں صد شکر ایک مدت سے مرا دل ہے طلبگار فراق
تیری ہی آرزو ہے وصل میں اے غرفہ نشیں ہوں میں بے چین تہہِ سایۂ دیوارِ فراق

وصلِ جاں کی ہوا چھو سکتے جس کے باعث کوئی ایسی نظر آتی نہیں تدبیرِ فراق
زندگی خضر کی آخر ہوئی سنتے سنتے ختم تس پر بھی نہ اپنی ہوئی تقریرِ فراق

ہم اُن کی چال سے پہچان لیں گے اُن کو برقع میں ہزار اپنے کو وہ ہم سے چھپائیں سر سے پاؤں تک
یہ جتنے سرو ہیں سب اس کے قد پر زہر کھلتے ہیں چمن میں سبز کیوں کر ہو نہ جائیں سر سے پاؤں تک
مرا دل ایک دوں اس خوش ادا کی کس ادا کو کہ ہیں واں تو ادائیں ہی ادائیں سر سے پاؤں تک
بنایا اس لیے اِس خاک کے پتلے کو تھا انسان کہ اس کو درد کا پتلا بنائیں سر سے پاؤں تک

صفحۂ دہر پہ یک دل نہ ہوا ایک سے ایک دل کے دو حرف ہیں سو وہ بھی جدا ایک سے ایک

خدا بچائے مجھے اس بغل کے دشمن سے کہ میرا دشمنِ جاں ہے مرے کنار میں دل

بہ رنگِ غنچۂ تصویر و غنچۂ پیکاں — نے دیکھا اپنا شگفتہ کسی بہار میں دل
ہزاروں دشمنِ جاں سے ہے ایک دوست بُرا — جو پوچھو کون ہے سو میں کہوں ہزار میں دل
بغل میں جیسے مرا دل بغل کا دُشمن ہے — نہ ایسا ہو کسی دشمن کے بھی کِنار میں دل
اُٹھا تو لائے مجھے میرے ہم نشیں اے ذوقؔ — رہے گا میرے عوض میرا کوے یار میں دل

ازل سے یوں دلِ عاشق ہے نور کی قندیل — کہ جیسے عرشِ خُدائے غفور کی قندیل
ہمارے کعبۂ دل میں ہمیشہ روشن ہے — کسی کے باب کمالِ ظہور کی قندیل
عیاں ہے یوں مرے روزِ سیہ میں اخترِ دل — کہ جیسے شب کو نظر آئے دور کی قندیل

زنجیر میں بھی نالۂ زنجیر کی طرح — جوشِ جنوں سے رہتے ہیں جولانیوں میں ہم
ہیں آئنے میں صورتِ تصویرِ آئنہ — آئینہ رو کے سامنے حیرانیوں میں ہم
کیا جانیں ہم زمانے کو حادث ہے یا قدیم — کچھ ہو بلا سے اپنی کہ ہیں فانیوں میں ہم
کیوں جی کے ہجر میں ہوئے شرمندہ یار سے — اب مر رہے ہیں اس کی پشیمانیوں میں ہم

عنقا کی طرح خَلق سے عزلت گزیں ہوں میں — ہوں اس طرح جہاں میں کہ گویا نہیں ہوں میں
میں وہ نہیں کہ تم ہو کہیں اور کہیں ہوں میں — میں ہوں تمہارا سایہ جہاں تم وہیں ہوں میں
تدا سا ہوں کنوئیں کی میں تہہ پر مثالِ آب — گو نام آسماں پہ ہے زیرِ زمیں ہوں میں
دل کو کیا دیکھے گا تو چیر کے کیا ہے اس میں — اب تو قطرہ بھی نہیں خوں کا رہا ہے اس میں
اُس جفا کیش کے نامے کو کہوں کیا کیا قاصد — جو کہ قسمت کا لکھا تھا وہ لکھا ہے اس میں
تو نگیں توڑ نہ دل کا کہ بڑی کاوش سے — اِسم کو میں نے ترے کندہ کیا ہے اس میں

کبھی کرتا ہوں فغاں اور کبھی ضبطِ فغاں — نہیں معلوم وہ خوش اس میں ہے یا ہے اس میں
خضر ساقی ہو تو میں جام نہ لوں گر جانوں — کہ نہیں جام میں مے آبِ بقا ہے اس میں
دے چکے عشق میں جاں وامق و قیس و فرہاد — اور بھی دیکھیے کس کس کی قضا ہے اس میں
کیا بگولے کی طرح خاک کا پُتلا انساں — اُڑتا پھرتا ہے بھری جب سے ہوا ہے اس میں

وقت پیری شباب کی باتیں — ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
پھر مجھے لے چلا اُدھر دیکھوں — دلِ خانہ خراب کی باتیں
واعظا چھوڑ ذکر نعمتِ خُلد — کر شراب و کباب کی باتیں
مہ جبیں یاد ہیں کہ بھول گئے — وہ شبِ ماہتاب کی باتیں
حرف آیا جو آبرو پہ مری — ہیں یہ چشمِ پُر آب کی باتیں
سنتے ہیں اُس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم — کس مزے سے عتاب کی باتیں
جام مے، مُنہ سے تو لگا اپنے — چھوڑ شرم و حجاب کی باتیں
مجھ کو رسوا کریں گی خوب اے دل — یہ تری اضطراب کی باتیں
جاؤ ہوتا ہے اور بھی خفقان — سُن کے ناصح جناب کی باتیں
قصّہ زُلفِ یار دل کے لیے — ہیں عجب پیچ و تاب کی باتیں
ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوقؔ — ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں — اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں
خورشید وار دیکھتے ہیں سب کو ایک آنکھ — روشن ضمیر ملتے ہر اک نیک و بد سے ہیں
جاں دادگانِ عشق سے پوچھو رہِ فنا — اس میں جنابِ خضر ابھی نابلد سے ہیں

وہ ایک دم کہ جس میں میسر ہو وصلِ یار   بہتر سمجھتے ہم اسے عمرِ ابد سے ہیں
جا ان لباسیوں کے نہ ظاہر لباس پر   عاری عبائے ہوش و قبائے خرد سے ہیں
ہر چند ناتواں، ہیں مگر رکھتے دل قوی   ہم عشق کی کمک سے جنوں کی مدد سے ہیں
دل کے ورق پہ ثبت ہیں صد مہر داغِ عشق   ہم کرتے ذوقؔ عشق کا دعویٰ سند سے ہیں

اس گلستانِ جہاں میں کیا گُلِ عشرت نہیں   سیر کے قابل ہے یہ پر سیر کی فرصت نہیں
کہتے ہیں مر جائیں گر چھوٹ جائیں غم کے ہاتھ سے   پر ترے غم سے ہمیں مرنے کی بھی فرصت نہیں
دل وہ کیا جس کو نہیں تیری تمنائے وصال   چشم وہ کیا جس کو تیری دید کی حسرت نہیں
ذوقؔ اس صورت کدے میں ہیں ہزاروں صورتیں   کوئی صورت اپنے صورت گر کی بے صورت نہیں

بلائیں آنکھوں سے ان کی مدام لیتے ہیں   ہم اپنے ہاتھوں کا مژگاں سے کام لیتے ہیں
شبِ وصال کے روزِ فراق میں کیا کیا   نصیب مجھ سے مرے انتقام لیتے ہیں
ہم اُن کے زور کے قائل ہیں، ہیں وہی شہ زور   جو عشق میں دلِ مُضطر کو تھام لیتے ہیں

گذرتی عمر ہے یوں دورِ آسمانی میں   کہ جیسے جائے کوئی کشتیِ دُخانی میں
کہانیاں ہیں حکایاتِ خضر و آبِ بقا   بقا کا ذکر ہی کیا اس جہانِ فَانی میں
لگاتے تہمت کر یہ ہیں دل جلوں کو ترے   یہ لوگ وہ ہیں لگاتے ہیں آگ پانی میں
کہوں میں اپنی کہانی تو وہ یہ کہتے ہیں   بغیر جھوٹ نہیں اور کچھ کہانی میں
بجز نثار علی شاہ کون جانے ذوقؔ   تری زباں کا مزہ تیری شعر خوانی میں

نہ خوب وزِشت نہ عیب و ہُنر کو دیکھتے ہیں
یہ چیز کیا ہے بشر ہم بشر کو دیکھتے ہیں

وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں
محبت آج ترے ہم اثر کو دیکھتے ہیں

رفیق جب مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
تو چارہ گر انھیں وہ چارہ گر کو دیکھتے ہیں

نہ طمطراق کو نے کر و فر کو دیکھتے ہیں
ہم آدمی کے صفات و سیر کو دیکھتے ہیں

جو رات خواب میں اس فتنہ گر کو دیکھتے ہیں
نہ پوچھو ہم جو قیامت سحر کو دیکھتے ہیں

وہ روز ہم کو گزرتا ہے جیسے عید کا دن
کبھی جو شکل تمھاری سحر کو دیکھتے ہیں

جہاں کے آئنوں سے دل کا آئنہ ہے جُدا
اس آئینے میں ہم آئینہ گر کو دیکھتے ہیں

بنا کے آئینہ دیکھے ہے پہلے آئنہ گر
ہنرور اپنے ہی عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

میں ہوں خشتِ کُہن مدت سے اس ویرانے میں
برسوں مسجد میں رہا برسوں رہا مے خانے میں

وحشت و نا آشنائی مستی و بیگانگی
یا تری آنکھوں میں دیکھی یا ترے دیوانے میں

پتھروں میں ٹھوکریں کھاتا ہے ناحق سیلِ آب
پوچھوں کیا لے جائے گا آکر مرے غم خانے میں

ایک پتھر پوجنے کو شیخ جی کعبے گئے
نقش ہر بت قابلِ بوسہ ہے اس بُت خانے میں

کرے وحشت بیاں چشمِ سُخن گو اس کو کہتے ہیں
یہ سچ کہتے ہیں سر چڑھ بولے جادو اس کو کہتے ہیں

سوالِ بوسہ کو ٹالا جوابِ چینِ ابرو سے
براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو اس کو کہتے ہیں

جگر اور دل کا جتنا حوصلہ تھا تُل گیا سارا
نگہ کے تیر کا ہونا ترازو اس کو کہتے ہیں

گوارا تلخیِ مے کیوں نہ ہو ہم خستہ جانوں کہ
یہ دارو تلخ ہی بہتر ہے دارو اس کو کہتے ہیں

گرہ کھولی ذرا اس نے جو اپنی زُلفِ مُشکیں کی
معطّر ہو گیا آفاق خوشبو اس کو کہتے ہیں

احسان نا خدا کا اٹھائے مری بلا — کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دو
نازک خیالیاں مری توڑیں عدو کا دل — میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں
دشت جنوں میں، میں جو اٹھاؤں ذرا قدم — پائے رفیق و ہمت رہبر کو توڑ دوں

آج اُن سے مدّعی کچھ مدّعا کہنے کو ہیں — پر نہیں معلوم کیا کہویں گے کیا کہنے کو ہیں

خوبیاں یوں تو ہیں اس عالمِ تصویر میں سب — اک مگر ناز سے یہ کم سخنی خوب نہیں
بات تو خوب بنائی تھی وہاں ہم نے مگر — تھی جو بگڑی ہوئی تقدیر بنی خوب نہیں
یہ نہیں شیشۂ مے، ہے کسی میخوار کا دل — مُحتسب دیکھ نہ کر دل شکنی خوب نہیں
کون آتش نفس اے ذوق چمن سے گزرا — آج جو سرو، نسیم چمنی خوب نہیں

بے یار روزِ عید شبِ غم سے کم نہیں — جامِ شراب دیدۂ پُرنم سے کم نہیں
دیتا ہے دورِ چرخ کسے فرصت نشاط — ہے جس کے پاس جام وہ اب جم سے کم نہیں
ہاتھوں سے تیرے پارۂ الماس و زخم دل — اب مجھ کو جلوۂ گُل و شبنم سے کم نہیں
سمجھوں غنیمت اس دمِ خنجر کو کیوں نہ میں — اس بے کسی میں یہ مجھے ہمدم سے کم نہیں
اے ذوق کس کو چشمِ حقارت سے دیکھیے — سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں

گئیں یاروں سے وہ اگلی ملاقاتوں کی سب رسمیں — پڑا جس دن سے دل بس میں ترے اور دل کے ہم بس میں
جو ہے گوشہ نشیں تیرے خیالِ مستِ ابرو میں — وہ ہے بیت الصنم میں بھی تو ہے بیت المقدس میں
ہوائے کوئے جاناں لے اڑے اس کو تعجب کیا — تنِ لاغر میں ہے جاں اس طرح جس طرح بو خس میں

مجھے ہو کس طرح قول و قسم کا اعتبار اُن کے   ہزاروں دے چکے وہ وہ قول لاکھوں کھا چکے قسمیں

پھرتا ہے سیلِ حوادِث سے کوئی مردوں کا منہ   شیر سیدھا تیر تا ہے وقتِ رفتن آب میں
صحبت صافی دلاں سے ہوں مکدر تیرہ دل   زنگ سے آلودہ ہو جاتا ہے آہن آب میں

وہ روز کون سا ہے کہ ہم پر ستم نہیں   گر یہ ستم ہے روز تو اک روز ہم نہیں
دامن ہے لوث سے مرا پاک یاں تلک   گر چھینٹ بھی پڑے تو بہ حدِّ درم نہیں
گر آب دیدہ شربتِ کوثر بھی ہے تو کیا   جب تک کہ اس میں چاشنیِ دردو غم نہیں
مشکل ہے میرے عہدِ محبت کا ٹوٹنا   اے بے وفا یہ تیری وفا کی قسم نہیں
لازم ہے صبر، صبر اگر کر گیا گریز   ڈھونڈے کدھر، سراغ کہ نقشِ قدم نہیں
خورشید وارد دیکھیے عالم کو ایک آنکھ   اس سے زیادہ کیفیتِ جامِ جم نہیں
جاتا ہے بند آنکھیں کیے ذوق کیا کہ دیکھ   یہ راہِ کوے یار ہے کوے عدم نہیں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں   واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں
خط دیکھ کر وہ آئے بہت پیچ و تاب میں   کیا جانے میں نے لکھ دیا کیا اضطراب میں
تیرے آفت زدہ جن دشتوں میں اڑ جاتے ہیں   صبر و طاقت کے وہاں پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں
اتنے بگڑے ہیں وہ مجھ سے کہ اگر نام اُن کے   خط بھی لکھتا ہوں تو سب حرف بگڑ جاتے ہیں
جو لذّت آشناے مرگ ہو تا خضر تو ہرگز   نہ پیتا آبِ حیواں ڈوب مرتا آبِ حیواں میں

ہیں بُتاں محو خود نمائی میں   بیر ہے پر خودی خدائی میں

نہیں بلقیس میں وہ فرنگی زاد ماہ ہے منزلِ ہوائی میں
ذوقؔ ہے ایک رندِ شاہد باز اُس کو کیا دخل پارسائی میں

تو کہے غنچہ کہ اُس لب پہ دھڑی خوب نہیں چپ کہ مُنہ چھوٹا سا اور بات بڑی خوب نہیں
خوب رویوں سے بہت آنکھ لڑی پر افسوس قسمت اے ذوقؔ کہیں اپنی لڑی خوب نہیں

واقف ہیں ہم کہ حضرتِ دل ایسے شخص ہیں اور پھر ہم اُن کے یار ہیں ہم ایسے شخص ہیں
صاحب دلوں کے واسطے ہے آستانِ دل کب کرتے قصدِ دیر و حرم ایسے شخص ہیں
دیوانے تیرے دشت میں رکھیں گے جب قدم مجنوں ہی لے گا اُن کے قدم ایسے شخص ہیں
دیں کیا ہے بلکہ دیجیے ایمان بھی اُنھیں زاہد یہ بُت خدا کی قسم ایسے شخص ہیں

نے رنگِ کفک ہوں نہ ترا فندق پا ہوں میں کچھ نہیں لیکن ترے قدموں سے لگا ہوں
وہ مہر تو میں تاب وہ گوہر ہے تو میں آب نے مجھ سے جدا وہ ہے نہ میں اس سے جُدا ہوں

گھڑی بھر میں یہ نالے گنبدِ بے در سے اُوپر ہیں ہوا یہ باندھتے بادل عبث اوپر سے اُوپر ہیں
کہوں میں کیا (کہ میرے) دل میں سو نشتر سے اُوپر ہیں وہ ایک سنتے نہیں دیتے اڑا اُوپر سے اُوپر ہیں

ہائے گل سب آشنا تیرے مریضِ عشق کے تھے علاجِ ضعفِ دل اور ضعفِ تن کی فکر میں
آج گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں با چشمِ پُر آب گاہ تدبیر لحد میں گہہ کفن کی فکر میں

نہیں تدبیر کچھ بنتی پڑے سر کو ٹپکتے ہیں　　نہ دل چھوڑے ہے ہم کو اور نہ ہم دل چھوڑ سکتے ہیں

مرے نالوں سے چپ ہیں مرغِ خوش الحال زمانے میں　　صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانے میں

مر گئے پر بھی تغافل ہی رہا آنے میں　　بے وفا پوچھے ہے کیا دیر ہے لے جانے میں

کیا صوفی و کیا میکش قائل مرے دونوں ہیں　　پر مذہب و مشرب سے غافل مرے دونوں ہیں

ہوا ہے اور نہ ہووے گا کوئی پیدا خدائی میں　　وفا میں کوئی مجھ سا اور تم سا بے وفائی میں

جس جگہ بیٹھے ہیں بادیدۂ نم اُٹھے ہیں　　آج کس شخص کا مُنہ دیکھ کے ہم اُٹھے ہیں

آنے کو کہتے تھے خاطر سے ہماری پرسوں　　ہوے برسوں نہ ہوئی پر وہ ہماری پرسوں

زاہدِ گمراہ کے میں کس طرح ہمراہ ہوں　　وہ کہے اللہ ہو اور میں کہوں اللہ ہوں

اسیری عشق کو منظور تھی میری لڑکپن میں　　بہانہ کر کے 'منّت کا' پنھایا طوق گردن میں

دانہ خرمن ہے ہمیں' قطرہ ہے دریا ہم کو　　آئے ہے 'جز میں' نظر کُل کا تماشا ہم کو
اس بلندی پہ' دیا عشق نے' پہنچا ہم کو'　　کہ فلک' آیا نظر' خاں سے چھوٹا' ہم کو

آن پہنچی، سر گردابِ فنا، کشتی عمر — ہر نفس بادِ مخالف کا، ہے جھونکا ہم کو
رشک تھا اپنے نوشتے میں کہ اس نوخط نے — خط لکھا غیر کو اور بھول کے بھیجا ہم کو
ہر قدم، پاؤں میں سر رکھتے ہیں، خارِ سرِ دشت — اے جنوں، تو نے، ہے کانٹوں میں گھسیٹا، ہم کو
کرتے، جوں کوہ، ہم تو سخن میں، سبقت — پر، وہ کچھ ہم سے سنے گا، جو کہے گا، ہم کو
اپنا ہے کعبۂ مقصود فقط گوہرِ دل — طوف، گرداب صفت، چاہیے، اپنا ہم کو
ایک دم، عمر طبیعی ہے یہاں، مثلِ حباب — فکرِ امروز ہے، نے ہے غمِ فردا، ہم، کو
مل گئیں، خاک میں، جو صورتیں ان کا ہے خیال — کیوں نہ فانوسِ خیالی ہو بگولا ہم کو
ہم ہیں، وہ وحشی لاغر کہ چھپا لیتی ہے — زیرِ داماں، نگہِ آہوے صحرا ہم کو
ہم نہ کہتے تھے کہ ذوقؔ اس کی، تو زلفوں کو نہ چھیڑ — اب وہ برہم ہے تو ہے تجھ کو قلق یا، ہم کو

باعثِ رشک ہوا عشق ہمارا ہم کو — تجھ پہ بن دیکھے ہے عشق جس نے کہ دیکھا ہم کو
اس پہ مرتے ہیں کہ کیوں غیر کو تو نے مارا — وہ نصیب اس کو ہوئی تھی جو تمنا ہم کو
ہم ہیں وہ گرم روِ راہِ فنا جوں خورشید — سایہ تک بھاگ گیا چھوڑ کے تنہا ہم کو
یہ تو یوں مضطرب اور سینے میں لاکھوں روزن — دل کا رہنا نظر آتا نہیں اصلا ہم کو
دیکھا آخر نہ کہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے — ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو
ہم وہ ہیں رند کہ اس عالمِ پیری میں بھی ہے — انس مے خانے سے جوں پنبۂ مینا ہم کو
تو ہنسی سے یہ نہ کہہ مرتے ہیں ہم بھی تم پر — مار ہی ڈالے گا بس رشک ہمارا ہم کو
وصل کا اُس کے تصور جو بندھا رہتا ہے — تو مزے ہجر میں بھی آتے ہیں کیا کیا ہم کو
دل میں نشترِ نگہِ یار کا آہی کھٹکا — وہ ہی پیش آیا جو مدت سے تھا کھٹکا ہم کو

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو — تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو
ناخن نہ دے خدا تجھے اے پنجۂ جنوں — دے گا تمام عقل کے بخیے اُدھیڑ تو
اے زاہدِ دورنگ نہ پیر آپ کو بنا — مانندِ صبحِ کاذب ابھی ہے ادھیڑ تو
یہ تنگ نائے دہر نہیں منزلِ فراغ — غافل نہ پاؤں حرص کے پھیلا سکیڑ تو
عُمر رواں کا توسنِ چالاک اس لیے — تجھ کو دیا کہ جلد کرے یاں سے ایڑ تو
آوارگی سے کوے محبت کی ہاتھ اُٹھا — اے ذوقؔ یہ اُٹھا نہ سکے گا کھکھیڑ تو

موت ہی سے کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو — غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو
بعدِ مردن ہی ترے زخمی کو راحت ہو تو ہو — جیتے جی راحت کہاں دردِ جراحت ہو تو ہو
دستِ بخشش سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ — پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو
گر پڑے ہے آگ میں پروانہ ساں کرمِ ضعیف — آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو
ہو تو ہو آباد کیوں کر یہ خراب آبادِ دل — عشق غارت گر اگر دنیا سے غارت ہو تو ہو
تلخ کامی میں ہی گزری زندگانی عُمر بھر — جانِ شیریں کے دیے سے کچھ حلاوت ہو تو ہو
کل جو اک پگڑی ہوتی تھی میکدے میں رہنِ مے — ذوقؔ وہ تیری ہی دستارِ فضیلت ہو تو ہو

کتابِ محبت میں اے حضرتِ دل بتاؤ تو تم لیتے کتنا سبق ہو — کہ جب آن کر ہم کو دیکھا تو وہی لیے دستِ افسوس کے دو ورق ہو
جو مے نوش وہ شوخ رشکِ قمر ہو تو سرخی نہ کیوں اس کے رخسار پر ہو — غروبِ آفتابِ درخشاں اگر ہو تو کس طرح پیدا نہ رنگِ شفق ہو
یہ کشتوں کا اس مانگ کے کیل بتاتا ہے کہ ان تیرہ بختوں کی تربت پہ کوئی — اگر سنگِ موسیٰ کا تعویذ رکھ دے تو بس درمیاں سے وہ کٹتے ہی شق ہو
اگر زخمِ سینہ سے پھاہا اٹھاؤں تو خورشید کو تھرتھری سی چڑھاؤں — اگر سینۂ داغِ دل کو دکھاؤں تو صبحِ قیامت کا منہ دم میں فق ہو
اگر رشکِ گلشن نہ ہو مجھ سے باہم تو گلشن میں بو دے یہ وحشت کا عالم — چٹکنا ہو غنچوں کا آوازِ ضیغم چمن مجھ کو اک وادیِ لق و دق ہو

کرو دونوں آنکھوں کے ملتے یہ روشن کہ ہو ایک رشکِ مہِ چاردہ تم ۔۔۔ سنا ہے کہ تم نور سے اپنے کرتے منور بہ یک جلوہ چودہ طبق ہو
مری زندگی تھی ابھی اے ستم گر مسیحائی جو کر گئی تیری ٹھوکر ۔۔۔ کہ ٹھکرایا تو نے تو بس یہ سمجھ کر نکل جائے جاں کچھ جو باقی رمق ہو

جانے کب بے درد اندازِ کلامِ درد مند ۔۔۔ ذوقؔ میرا ہم سخن گر ہو کوئی دل خستہ ہو
منہ سے جو نکلے وہ کچھ ہو پر ہو دلکش ایک بات ۔۔۔ آہِ موزوں ہو کہ نالہ مصرعِ بر جستہ ہو

حرم کو جائے زاہد ہم تو مے خانے کو چلتے ہیں ۔۔۔ مبارک اس کو طوفِ کعبہ ہم کو دورِ ساغر ہو
نشہ ٹوٹے ترے ساغر کشِ وحشت کا کیا ممکن ۔۔۔ اگر سو ٹکڑے سنگِ کودکاں سے کاسۂ سر ہو
جو کھوئے آپ کو وہ منزلِ مقصود کو پہنچے ۔۔۔ تری گم گشتگی اس راہ میں اے ذوقؔ رہبر ہو

دیکھیں ہم کیسے بھلکّو ہو جسے کرتے ہو یاد ۔۔۔ بھول جاؤ تو بھلا میرے بھلاوے اس کو
قالبِ خاکیِ انساں کو بنا کر کچّا ۔۔۔ عشق کی آگ میں ڈالا کہ پکاوے اس کو
پیار کی بات یہ مجھ سے تمہیں ایک اور سے ہے ۔۔۔ تیری یہ خو ہے کہے مجھ کو سناوے اس کو
مشتِ خاک اپنی گلی اُس کوچے میں ہم پھینک آئے ۔۔۔ اب وہ ذوقؔ آپ اُٹھاوے اس کو

سگِ دنیا پس از مردن بھی دامن گیرِ دنیا ہو ۔۔۔ کہ اس کتّے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو
ترے بیمار کو گر اپنے جینے کی تمنا ہو ۔۔۔ فلک پر سن کے ہنستے ہنستے شادی مرگ عیسیٰ ہو
تصوّر یوں کبھی غفلت میں آجاتا ہے مرنے کا ۔۔۔ کہ جیسے عالمِ رویا میں چشمِ کور بینا ہو
جدا یاروں سے یوں ہم رہ گئے ہیں ناتوانی میں ۔۔۔ کہ جوں شاخِ خزاں دیدہ پہ کوئی زرد پتا ہو
جو ذکر اللہ کو ہو ذوقؔ مانع مایۂ عشرت ۔۔۔ تو کیوں حق حق کرے وہ شیشہ جس شیشے میں صہبا ہو

دن کٹنا جاہیئے اب رات کدھر کاٹنے کو　　جب سے وہ پاس نہیں ٗ دوڑے ہے گھر کاٹنے کو
اپنے عاشق کو ٗ نہ کھِلواؤ کنی ہیرے کی ٗ　　اس کے ٗ آنسو ہی ٗ یہ کافی ہیں ٗ جگر کاٹنے کو
وہ شجر ہوں نہ گُل و بار نہ سایہ مجھ میں　　باغباں نے ہے ٗ لگا رکھا مگر کاٹنے کو

منزل گُم گشتگاں ٗ بالکل ٗ الگ ٗ دنیا سے ٗ ہو　　آسماں بھی ہو ٗ اگر واں ٗ بیضۂ عنقا سے ہو
سایہ افگن جس پہ تو ٗ اپنے قدِ رعنا سے ہو　　گردباد ٗ اُس خاک پر ٗ ہم سر قدِ طوبیٰ سے ہو

عزیزو ٗ اس کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو　　یہ عُمر رفتہ کی اپنی صدائے پا سمجھو
بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو　　زبانِ خلق کو ٗ نقارۂ خدا سمجھو
نفس کی آمد و شد ٗ ہے ٗ نمازِ اہلِ حیات　　جو یہ قضا ہو تو اے غافلو قضا ٗ سمجھو
تمھاری راہ میں ملتے ہیں خاک میں لاکھوں　　اس آرزو میں کہ تم اپنا خاکِ پا ٗ سمجھو
سمجھ ٗ ہے اور تمھاری ٗ کہوں میں تم سے کیا　　تم اپنے دل میں خدا جانے سُن کے کیا سمجھو
نہیں ہے ٗ کم زرِ خالص سے زردیِ رخسار　　تم اپنے عِشق کو ایک دوقؔ کیمیا سمجھو

کو سوں کیا ٗ تنگی زمانے کو　　کہ نہیں جائے ٗ سر اُٹھانے کو
قصہ کعبے کا تھا ٗ پھرے الٹے　　چوم کر اس کے آستانے کو
تو مکدر نہ ہو تو عشق میں ہم　　ایک آندھی ہیں خاک اُڑانے کو

خرچ کیجیے گا کہیں اور ہی دانائی کو　　ناصحو جاؤ نہ چھیڑو کسی سودائی کو

کیوں کہ عینک کو نہ آنکھوں سے لگائیں اس سے چار آنکھیں ملیں اس قوت بینائی کو

دیکھا دم نزع دل آرام عید ہوئی ذوقؔ ولے شام کو

یا تو پاسِ دوستی تجھ کو بتِ بے باک ہو یا مجھی کو موت آجائے کہ قصہ پاک ہو

کہے ایک جب سُن لے انسان دو کہ حق نے زبان ایک دی کان دو

مرتے ہیں ترے پیار سے ہم اور زیادہ تو لطف میں کرتا ہے ستم اور زیادہ
گھبراتا جو یاد آیا ترا ہو کے ہم آغوش گھبرانے لگا سینے میں دم اور زیادہ
کیا ہووے گا دو چار قدح سے مجھے ساقی میں لوں گا ترے سر کی قسم اور زیادہ
ہے نکہتِ ریحاں کا دماغ اب کسے تجھ بن آتا ہے مرا ناک میں دم اور زیادہ
صیدِ دلِ عاشق میں ہے مصروف وہ کافر بے خوف ہیں اب صیدِ حرم اور زیادہ
ہے باغ جہاں میں تجھے گر ہمت عالی کر گردنِ تسلیم کو خم اور زیادہ
اے خنجر خوں خوار نہ بُرش میں کمی کر ہاں تجھ کو مرے سر کی قسم اور زیادہ
کیا قہر ہے جتنا کہ وہ چاہت سے ہٹے ہے اتنا ہی اسے چاہیں ہیں ہم اور زیادہ
جو کنج قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر ہے ذوقؔ برابر انھیں کم اور زیادہ

فقیر وجد میں جب ہاتھ اُٹھائے عالم سے تو پہنچے عرش تلک کودتے اُچھلتے ہاتھ
نہ آیا گور پہ میری وہ بے وفا ورنہ گلے لگانے کو تُربت سے بھی نکلتے ہاتھ

کوئی جو کام ہو پیری میں کس طرح ہو ذوقؔ
کہ اب نہ پاؤں سنبھلتے نہ ہیں سنبھلتے ہاتھ

ہے اُن کا سادہ پن بھی تو اک بانکپن کے ساتھ
سیدھی سی بات بھی ہے تو کیا کیا پھبن کے ساتھ

ہوش و خرد گئے نگہِ سحر فن کے ساتھ
اب جو ہے اپنی بات سو دیوانہ پن کے ساتھ

تیرے تصوّرِ قدِ رعنا میں آج ہم
کیا کیا لپٹ کے روئے ہیں سرو چمن کے ساتھ

وحشی کو ہم نے دیکھا اُس آہو نگاہ کے
جنگل میں بھر رہا تھا قُلانچیں ہرن کے ساتھ

گندم ہے سینہ چاک فراقِ بہشت میں
آدم کو کیا نہ ہو گی محبت وطن کے ساتھ

مشکل ہے ذوقؔ قیدِ تعلق سے چھوٹنا
جب تک کہ روح کو ہے علاقہ بدن کے ساتھ

ہوا زیادہ توکّل سے کہیں روزہ
کہ ہاتھ آیا تو روزی ہے نہیں روزہ

کر دعا میرے لیے شیخ مناجات میں یہ
کہ خراب اور زیادہ ہو خرابات میں یہ

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ
ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

ہاتھ اُٹھاؤ عشق کے بیمار سے
کوئی بچتا بھی ہے اس آزار سے

یوں نگہِ نکلے ہے چشمِ یار سے
مست جیسے خانۂ خمّار سے

اپنے دامن کو بچا کر جائیو
برق میری وادیٔ پُر خار سے

لیتے ہی دل جو عاشقِ دل سوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

تم چشم سُرمگیں کو جو اپنی دکھا چلے — بیٹھے بٹھائے خاک میں ہم کو ملا چلے
دیوانہ آکے اور بھی دل کو بنا چلے — اک دم تو ٹھہرو اور بھی کیا آئے کیا چلے
ہم لطفِ سیرِ باغ جہاں خاک اڑا چلے — شوق وصال دل میں لیے یار کا چلے
اے غم مجھے تمام شبِ ہجر میں نہ کھا — رہنے دے کچھ کہ صبح کا بھی ناشتا چلے
کیا لے چلے گلی سے تری ہم کہ جوں نسیم — آئے تھے سر پہ خاک اُڑانے اڑا چلے
افسوس ہے کہ سایۂ مرغ ہوا کی طرح — ہم جس کے ساتھ ساتھ چلیں وہ جدا چلے
کیا دیکھتا ہے ہاتھ مرا چھوڑ دے طبیب — یاں جان ہی بدن میں نہیں نبض کیا چلے
ساتھ اپنے لے کے توسنِ عمرِ رواں کو آہ — ہم اس سرائے دہر میں کیا آئے کیا چلے

فرشتے تیرے دامن کو بنائیں جانماز اپنی — اگر دھو ڈالے تو داغِ مئے پندار دامن سے
ترے مجنوں کو ہے وہ جامۂ عریاں تنی زیبا — کہ جیب و آستیں سے ننگ جس کو عار دامن سے

بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیوں کر ہو — زبان دل کے لیے ہے نہ دل زبان کے لیے
حجر کے چومنے ہی پر ہے حجِ کعبہ اگر — تو بوسے ہم نے بھی اُس سنگ آستاں کے لیے
نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے — رہا ہے سینے میں کیا چشم خوں فشاں کے لیے
اگر اُمید نہ ہم سایہ ہو تو خانۂ یاس — بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لیے
بنایا آدمی کو ذوق ایک جزوِ ضعیف — اور اس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کے لیے

مرے جب موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے — مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے
اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے — تو گُل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

یقیں ہے صبحِ قیامت کو بھی صَبوحی کش — اُٹھیں گے خواب سے ساقی سبو سبو کرتے
نہ رہتی یوسفِ کنعاں کی گرمی بازار — مقابلے میں جو ہم تجھ کو رُو برو کرتے
سراغ، عمرِ گذشتہ کا کیجیے گر ذوقؔ — تمام عمر گذر جائے جستجو کرتے

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے — کہ بے آشام پیاسے ہیں مہینا بھر کے
آشناؤں سے اگر ایسے ہی بیزار ہو تم — تو ڈبو دو انھیں دریا میں سفینا بھر کے

گذرتی ہے مزے میں زندگی غفلت شعاری سے — مرے نزدیک بے ہوشی ہے بہتر ہوشیاری سے
خبر کیا پوچھتے ہو اپنے بیمارِ محبت کی — کہ نوبت دم شماری کی ہے شب اختر شماری سے
کبھی گر سر اُٹھایا بھی تو جوں اشکِ سر مژگاں — زمیں سے جا لگا سر جھک کے اپنا شرمساری سے
لگی بھی گر زمین پر پیٹھ تیرے تفتہ جانوں کی — تو مثلِ برق اُٹھ بھاگے وہیں پھر بیقراری سے

یار بنتے حال پر ہم دل فگاروں کے لگے — کاش کے ایسی ہی یارب دل کو یاروں کے لگے
ہو اگر گرمِ فغاں مُرغِ چمن میری طرح — آگ دم میں آشیانوں کو ہزاروں کے لگے

نگہِ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی — چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی
کسی کے دل کا سنو حال، دل لگا کر تم — جو ہووے دل کو تمھارے بھی مہربان لگی

دروازہ مے کدے کا نہ کر بند محتسب — ظالم خدا سے ڈر کہ درِ توبہ باز ہے

حریصوں کو نہیں جا وسعت آبادِ قناعت میں　　جو کھینچے ہاتھ کو وہ پاؤں پھیلائے قناعت سے

میں کیا کروں اظہارِ غم ہے بارِ غم پر بارِ غم　　دن رات اک انبارِ غم میرے دلِ غمگیں پہ ہے

زاہد کو اگر صدق و صفا بھی ہے تو کیا ہے　　بے درد اگر دل بہ خُدا ہے بھی تو کیا ہے
سیراب نہ ہو جس سے کوئی تشنۂ مقصود　　اے ذوقؔ جو وہ آبِ بقا ہے بھی تو کیا ہے

چل، شیخ میکدے میں، بسر کر مہِ صیام　　مسجد میں تنگ بیٹھا ہے کیوں اعتکاف سے
لکھتا ہے، شیخ مسئلہ وحدت الوجود　　لیکن، دوئی عیاں ہے قلم کے شگاف سے
گل ہائے رنگ رنگ سے، ہے، رونق چمن　　اے ذوقؔ اس جہاں کو، ہے، زیب، اختلاف سے

الٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے　　کہ آج کوچے میں اُس کے شورِ "بائی ذنبِ قتلتنی" ہے
ہوئے ہیں اس اپنی سادگی سے 'ہم' آشنا جنگ و آشتی سے　　اگر نہ ہو یہ تو پھر کسی سے نہ دوستی ہے نہ دُشمنی ہے
زمیں، پہ نورِ قمر کے گرنے سے، صاف اظہارِ روشنی ہے　　کہ ہیں، جو روشن ضمیر، ان کا فروغ، ان کی فروتنی ہے
غمِ جُدائی میں تیری ظالم کہوں میں کیا مجھ پہ کیا بنی ہے　　جگر گدازی ہے سینہ کاوی ہے، دل خراشی ہے، جاں کنی ہے

کیا غرض، لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے　　اُن کا بندہ ہوں، جو بندے ہیں محبت والے
گئے جنت میں، اگر سوز محبت والے　　تو یہ جانو رہے دوزخ میں ہیں جنت والے
نہ شکایت ہے، کرم کی، نہ ستم کی خواہش　　دیکھ تو ہم بھی، ہیں کیا صبر و قناعت والے
ہم نے دیکھا ہے، جو اس بُت میں نہیں کہہ سکتے　　کہ مبادا، کہیں، سن پائیں، شریعت والے

ناز ہے، گُل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوقؔ	اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

رُخصت اے زنداں جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے	مژدہ 'خارِ دشت پھر تلوار مرا کھجلائے ہے
سر بہ وقتِ ذبح 'اپنا اُس کے 'زیرِ پائے ہے	یہ نصیب اللہ اکبر! لوٹنے کی 'جائے ہے
واہ رے شورِ محبت خوب ہی چھڑکا نمک	استخواں میرے ہما کس کس مزے سے کھائے ہے
ذوقؔ کو 'بس نزع میں بھی' ہے گا تیرا انتظار	جانبِ در دیکھ لے جب کہ ہوش آجائے ہے

تو مجھ سے 'قیمتِ دل و جاں پوچھتا ہے کیا	دونوں ہیں 'اک نگاہ میں اے دل ربا چکے
دل پھر سکا نہ یار سے 'بک بک کے میرے ساتھ	سر اپنا کب کے حضرتِ ناصح کھپا چکے
تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو ستم	ہم تو تمھاری یاد میں' سب کچھ بھلا چکے

ہوئے کیوں اس پہ عاشق 'ہم ابھی سے	لگایا جی کو ناحق غم ابھی سے
دلا ربط اس سے ' رکھتا کم ابھی سے	جتا دیتے ہیں تجھ کو ہم ابھی سے

لائی حیات آئے ' قضا لے چلی چلے	اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
ہو عمرِ خضر بھی' تو ہو معلوم وقتِ مرگ	ہم کیا رہے یہاں 'ابھی آئے ابھی چلے
ہم سے بھی اس بساط پہ کم ہوں گے بد قمار	جو چال ہم چلے سو نہایت بُری چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے	پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے
نازاں نہ ہو 'خِرد پہ جو ہونا ہے ہو وہی	دانش تری نہ کچھ مری دانش وری چلے

دشنام، ہو کے ترش وہ ابرو ہزار دے ۔ یاں وہ نشہ نہیں، جسے ترشی اُتار دے
عشق اس پری کا ہے وبلا جائے لے کے جاں ۔ یہ جن نہیں ہے جس کو سیانا اُتار دے
پشے سے، سیکھے شیوۂ مردانگی، کوئی ۔ جب آئے قصدِ خوں کو تو پہلے پکار دے
اے شمع تیری عمر طبیعی، ہے ایک رات ۔ ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے
عاشق نہ بدلے انجم گردوں سے اپنی اشک ۔ کیوں، کوڑیوں کے مول درِ شاہوار، دے
نے رحم ہے نہ پاسِ محبت نہ منصفی ۔ پھر جان کس اُمید پہ یہ جاں نثار دے
اس جبر پر تو ذوقؔ بشر کا یہ حال ہے ۔ کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

دیکھ کر اس کو گیا، عالمِ حیرت میں تو میں ۔ لیک میں کیا کہوں اس عالمِ حیرت کے مزے
تجھ کو کچھ یاد بھی ہیں پہلے وہ حسرت کے مزے ۔ بے مزہ ہونے کے لطف اور شکایت کے مزے
نہیں جز بے مزگی کوئی مزہ دنیا میں ۔ پر مزے دار بنا دیتے ہیں، غفلت کے مزے
بے مزہ جی کو کریں لاکھ ترے ظلم و ستم ۔ بھولنے کے نہیں وہ پہلی عنایت کے مزے
ابر باراں کا نہ کیوں لطف اٹھائیں، مے خوار ۔ کہ اُڑاتے ہیں گنہ گار ہی رحمت کے مزے

اے ذوقؔ بس نہ آپ کو صوفی جتایئے ۔ معلوم ہے حقیقتِ 'ہُو حق' جناب کی

کیا مدِ نظر، تم کو، ہے یاروں سے تو کہیے ۔ گر منہ سے نہیں کہتے اشاروں سے تو کہیے

یہ اقامت، ہمیں پیغامِ سفر، دیتی ہے ۔ زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے
زالِ دنیا، ہے، عجب طرح کی علامہ دہر ۔ مردِ دیں دار کو بھی، دہریہ کر دیتی ہے

فائدہ دے، ترے بیمار کو، کیا خاک دوا اب تو اکسیر بھی دیجے تو ضرر دیتی ہے
شمع بھی کم نہیں کچھ عشق میں پروانے سے جان دیتا ہے، اگر وہ، تو یہ سر دیتی ہے

اے تغافل کیش جلدی آ کہ تو واقف نہیں اس دلِ بیتاب و جانِ مضطرب کے ڈھنگ سے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
تم نے ٹھیرائی اگر غیر کے گھر جانے کی تو ارادے یہاں کچھ اور ٹھہر جائیں گے
خالی اے چارہ گرو، ہوں گے، بہت مرہم دان پر مرے زخم، نہیں ایسے کہ بھر جائیں گے
پہنچیں گے، رہ گذرِ یار تلک، کیوں کر ہم پہلے جب تک نہ دو عالم سے گذر جائیں گے
ہم نہیں وہ جو کریں خون کا دعویٰ تجھ پر بلکہ، پوچھے گا، خدا بھی، تو مکر جائیں گے
آگ دوزخ کی بھی، ہو جائے گی پانی پانی جب یہ عاصی عرقِ شرم سے تر جائیں گے
ذوقؔ جو مدرسے کے بگڑے ہوئے ہیں مُلّا ان کو مے خانے میں لے آؤ سنور جائیں گے

وہ کون سا غم ہے جسے پائے نہیں دل میں لیکن نہیں پاتے تو خوشی کو نہیں پاتے

نہ ہوں گے ہم قائلِ قیامت جو تیرا قامت نہ دیکھ لیں گے رہیں گے رویت کے بلکہ منکر جو تیری صورت نہ دیکھ لیں گے
دیکھ لی کیسی کیسی آفت جہاں میں ہم نے تمہارے باعث اور آگے کیا کیا غم و الم ہم، تمھاری دولت نہ دیکھ لیں گے
رچہ 'دردِ محبت اپنا' کہا نہ میں نے زباں سے اپنی وہ میری صورت نہ دیکھ لیں گے؟ وہ میری حالت نہ دیکھ لیں گے
ان کو دے بھی دیا جو قاصد نے 'ذوقؔ' دے کر، کسی کو دھوکا وہ خط نہ پہچان لیں گے تیرا، تری عبارت نہ دیکھ لیں گے

زیادہ جان کے جانے سے ہے غم تیرے جانے کا
تیرے جانے سے پہلے کاش یہ جانِ حزیں نکلے

نکلتے تیرے ہر اک ناز میں وہ ناز ہیں لاکھوں
کہ ہر اک ناز پر لاکھوں کا دم لے ناز نیں نکلے

خدا دے نورِ بینش اور اس چشمِ تصور کو
ہزاروں کام اس سے دور کے بے دور بیں نکلے

چھٹے کیا ہم سے شوقِ حسنِ گندم گو کہ گندم پر
ہمارے جدِ امجد چھوڑ کر خلدِ بریں نکلے

سنا کرتے تھے شہرہ ذوقؔ جن کی پارسائی کا
وہ سب یارِ خرابات اپنے نکلے ہم نشیں نکلے

آتے ہی تم نے گھر کے پھر جانے کی سنائی
رہ جاؤں نہ کیوں کر یہ تو بری سنائی

مجنوں و کوہ کن کے سنتے تھے یار قصے
جب تک کہانی ہم نے اپنی نہ تھی سنائی

کچھ کہہ رہا ہے ناصح کیا جانے کیا کہے گا
دیتا نہیں مجھے تو اے بے خودی سنائی

کہنے نہ پائے اس سے ساری حقیقت اک دن
آدھی کبھی سنائی آدھی کبھی سنائی

بیٹھے ہیں دل کے بیچنے والے ہزار ہا
گزری ہے اس کی راہ گزر پر لگی ہوئی

کرتی ہے زیرِ برقعِ فانوس تاک جھانک
پروانے سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی

اے ذوقؔ اتنا دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے جی
اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے



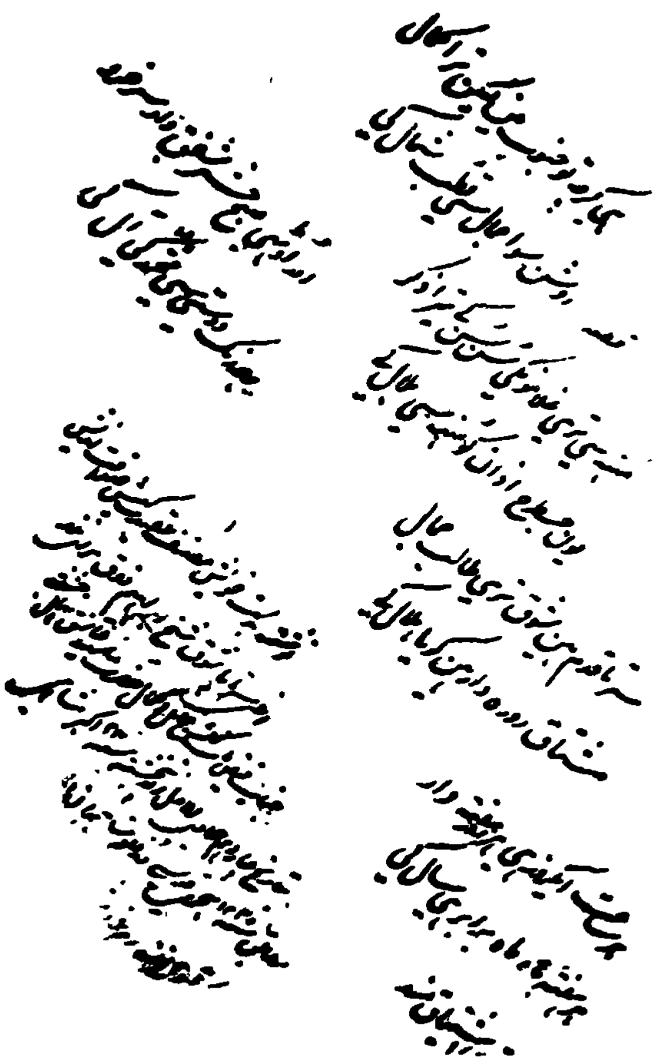

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

URDU ADAB (QUARTERLY)

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

New Delhi-110002

October, November, December, 1998



ذوق کی تحریر کا عکس